دولت عثمانیہ

جلد دوم

ڈاکٹر محمد عزیر

دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (الہند)

بسلسلۂ تاریخ اسلام

سلطنت عثمانیہ کے عروج وزوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

جلد دوم

از۔محمود ثانی ۱۲۲۳ھ(۱۸۰۸ء) تا جنگ عظیم ۱۳۳۸ھ(۱۹۹۱ء)

از

ڈاکٹر محمد عزیر

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یو۔پی (الھند)

سلسلۂ دارالمصنفین : ۶۵

نام کتاب : دولت عثمانیہ دوم

مصنف : محمد عزیر

صفحات : ۴۱۶

طباعت : جدید معیاری ایڈیشن ۲۰۰۹ء

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو۔پی)

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یو۔پی)

قیمت : ۲۰۰/روپے

ISBN: 978-93-80104-32-4

باہتمام

عبدالمنان ہلالی
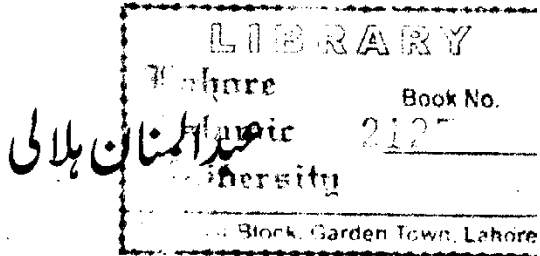
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

مجھے افسوس ہے کہ دولت عثمانیہ کی دوسری جلد کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی، مسودہ کئی سال قبل لکھا جا چکا تھا مگر پریس میں بھیجنے سے پہلے جب نظر ثانی شروع کی تو بہت کچھ ترمیم واضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی اور تقریباً پوری کتاب از سرِ نو لکھنی پڑی، علاوہ بریں درس وتدریس کی مشغولیت اور بعض دیگر اسباب سے بھی کام کی رفتار بہت سست رہی اور کبھی کبھی مہینوں مسودہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

نظر ثانی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس جلد کی ضخامت بہت بڑھ گئی اور جمہوریہ کا حصہ جو پہلے اس میں شامل تھا اور جس میں جدید ترکی کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں الگ کر دینا پڑا، چونکہ قیامِ جمہوریہ سے آلِ عثمان کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے مناسب بھی یہی ہے کہ اس کی ایک جلد علاحدہ ہو۔

محمد عزیر (رفیق دارالمصنفین)

مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

۳۰/اپریل ۱۹۴۳ء

فہرست مضامین
دولت عثمانیہ جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمود ثانی

۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹

ینی چری کی بغاوت: محمود کو تخت پر بٹھانے کے بعد مصطفیٰ پاشا بیرقدار نے صدارت عظمیٰ کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے اور سب سے پہلے ان غداروں کو سزائیں دیں جنھوں نے سلیم کو تخت سے اتارنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، چنانچہ موسیٰ پاشا اور اس کے ساتھی قتل کردئے گئے، اس کے بعد بیرقدار نے ایک نئی فوج یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تیار کرنی شروع کی، ینی چری نے بظاہر کوئی مخالفت نہیں کی، لیکن حقیقتاً وہ صرف موقع کا انتظار کررہے تھے، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب بیرقدار نے ان کی وفاداری پر اعتماد کر کے اپنی البانی اور بوسنی فوجوں کو قسطنطنیہ سے رخصت کردیا اور صرف چار ہزار سپاہی رکھ چھوڑے تو ینی چری نے انتقام کے لیے تلواریں نکال لیں اور البانی فوجوں کی روانگی کے دوسرے ہی دن رات کے وقت انھوں نے صدر اعظم کے محل پر حملہ کر کے اس میں آگ لگادی، بیرقدار نے بھاگ کر ایک سنگی برج میں پناہ لی جو اس وقت بارودخانہ تھا، وہاں اس نے بڑی جانبازی سے باغیوں کا مقابلہ کیا لیکن کسی طرح میگزین میں آگ

لگ گئی اور بیرقدار جل کر ہلاک ہوگیا، اس کے بعد دو روز تک ینی چری اور نظام جدید کی فوجوں میں نہایت خوں خوار جنگ برپا رہی، موخر الذکر کی مدد کے لیے قاضی پاشا جو بیرقدار کا دوست تھا، آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سقوطری سے آگیا، قپودان پاشا سعید علی نے بھی قاضی پاشا کا ساتھ دیا اور ایک جنگی جہاز سے ینی چری کی بارکوں پر گولے برسائے لیکن بالآخر توپچیوں کے مل جانے سے جو شروع میں اس لڑائی سے بالکل الگ تھے ینی چری کی قوت بہت بڑھ گئی اور انھوں نے نظامی فوجوں کو مار کر بھگا دیا، وہ فاتحانہ جوش کے ساتھ سابق سلطان مصطفیٰ کو تخت پر بٹھانے کے لیے محل کی طرف بڑھے لیکن اس درمیان میں مصطفیٰ قتل کیا جا چکا تھا اور چوں کہ محمود کے سوا خاندان عثمانی کا کوئی دوسرا فرد سلطنت کا وارث نہ رہ گیا تھا، اس لیے مجبوراً انھیں محمود ہی کو اپنا سلطان تسلیم کرنا پڑا، تاہم انھوں نے محمود سے اپنے کل مطالبات منظور کرا لیے، ایک فرمان کے ذریعہ تمام جدید اصلاحات منسوخ کر دی گئیں اور قدیم نظام اپنی تمام برائیوں کے ساتھ ازسرنو قایم ہوگیا، تین چار سال تک سلطنت کا انتظام دراصل ینی چری کے ہاتھوں میں رہا، صدراعظم اور دوسرے وزرا کا عزل ونصب بھی انہی کی مرضی پر تھا، محمود اپنی بے بسی پر خون کے گھونٹ پی رہا تھا اور انتقام کے لیے صرف وقت کا منتظر تھا۔

زار اور نپولین کا خفیہ معاہدہ: روس سے جنگ کا جو سلسلہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں شروع ہوا تھا اور اس درمیان میں دو سال کے لیے منقطع ہوگیا تھا صلح نامہ ٹلسیٹ (جون ۱۸۰۷ء) میں نپولین اور زار الکزنڈر کے درمیان یہ بھی طے پایا تھا کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ ختم کر دی جائے اور روسی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا سے ہٹا لی جائیں لیکن جب تک فریقین میں شرائط صلح مستقل طور پر طے نہ ہو جائیں ترک ان صوبوں میں داخل نہ ہوں، چنانچہ اگست ۱۸۰۷ء میں معاہدۂ سلوبوسیا (Slobosia) کے رو سے جنگ روک دی گئی اور تقریباً دو سال تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی مگر روس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور اپنی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا سے نہیں ہٹائیں، برخلاف اس کے الکزنڈر نے

نپولین سے ایک خفیہ معاہدہ کر کے ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی دولت علیہ اس وقت فرانس کی حلیف تھی مگر نپولین نے اسپین کو حاصل کرنے کی غرض سے سلطنت عثمانیہ کو روس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے میں تامل نہ کیا، اس مسئلہ پر الکزنڈر اور نپولین میں زبانی گفتگو ہوئی اور صلح نامہ ٹلسیٹ میں ایک خفیہ دفعہ کا اضافہ کیا گیا کہ اگر باب عالی فرانس اور روس کی سفارشات کو قبول نہ کرے تو رومیلیا اور قسطنطنیہ کے علاوہ اس کے تمام یوروپین صوبے لے لیے جائیں اور یہ بھی طے پایا کہ صلح نامہ مذکور کی کھلی ہوئی دفعات میں مولڈ یویا اور ولاچیا کے تخلیہ سے متعلق جو دفعہ ہے عملاً اس کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد نپولین نے اپنے سفیروں کے ذریعہ اور پھر خود الکزنڈر سے گفتگو کر کے اس کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویزیں پیش کیں، دو تجویزیں زیر بحث تھیں، پہلی یہ تھی کہ روس کو مولڈ یویا، ولاچیا اور بلغاریا دے دیا جائے، فرانس، البانیا، یونان اور کینڈیا پر قبضہ کرلے اور بوسنیا اور سرویا کے صوبے آسٹریا کے حوالہ کر دیے جائیں، دوسری تجویز یہ تھی کہ آسٹریا کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مقدونیا بھی دے دیا جائے، البتہ سالونیکا کا شہر اور بندرگاہ مستثنیٰ کر دی جائے، فرانس کو البانیا، یونان اور کنیڈیا کے علاوہ تمام یونانی مجمع الجزائر، قبرص، شام اور مصر بھی دے دیے جائیں روس، مولڈ یویا، ولاچیا، بلغاریہ، تھریس اور ان ایشیائی صوبوں کو جو باسفورس کے قریب واقع تھے، اپنی سلطنت میں شامل کرلے(۱) لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے "قومی رہزنی کی اس عظیم الشان اسکیم" میں قسطنطنیہ روس کے حصہ میں جا رہا تھا اور اس پر نپولین کسی طرح راضی نہ ہوا، دوسری طرف الکزنڈر بھی قسطنطنیہ سے دست کش ہونے پر مطلق تیار نہ تھا، اسی نقطہ پر پہنچ کر یہ ساری اسکیم درہم برہم ہوگئی، لارڈ ایورسلے اس اسکیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس میں شبہ نہیں کہ نپولین اپنے نئے حلیف ترکوں کو چھوڑ دینے اور ان کی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے لیے ان کے قدیم دشمن سے مل جانے پر راضی تھا،

(۱) تاریخ ترکان عثمانی از کریسی جلد دوم ص ۳۷۹

تاریخ میں غداری کی اس سے بڑی مثال نہیں مل سکتی''۔(۱)

انگلستان سے صلح: ان تجویزوں کی ناکامی کے باوجود مولڈیویا اور ولاچیا پر روسی فوجوں کا قبضہ بدستور قایم رہا، آسٹریا کے لیے یہ صورتِ حال نہایت تشویش ناک تھی، اسے روس اور فرانس کی سازش اور ان کے خفیہ منصوبوں کا شبہ ہوگیا تھا، یہ دیکھ کر کہ انگلستان ہی ایک ایسی طاقت ہے جو دولت عثمانیہ سے متحد ہوکر فرانس اور روس کے منصوبوں کو ناکام رکھ سکتی ہے اور اس طرح آسٹریا کے سر سے وہ خطرہ دور ہوسکتا ہے جو مولڈیویا اور ولاچیا پر روس کے قبضہ سے قایم تھا، اس نے دولت علیہ اور انگلستان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی، چنانچہ اسی کی وساطت سے جنوری ۱۸۰۹ء میں صلح نامہ دردانیال کا تکملہ ہوگیا۔

روس سے جنگ: روس کے رویہ سے ترکوں میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ جب ان کی خواہش کے مطابق باب عالی نے جنگ کا اعلان کیا تو سلطنت کے ہر حصہ سے بکثرت رضا کار محاذ پر جانے کے لیے جمع ہونے لگے لیکن فوج کا نظام اس قدر خراب تھا کہ ان پرجوش رضا کاروں کی خدمت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا جاسکا، ۱۸۰۹ء میں روسی جنرل بگریشن (Bagration) نے دریاے ڈینوب کو عبور کرکے متعدد ترکی قلعوں پر قبضہ کرلیا، دوسرے سال سلسٹریا کے اہم قلعہ پر بھی روسیوں کا قبضہ ہوگیا، اس کے بعد انھوں نے روسچق پر حملہ کیا، لیکن وہاں انھیں شدید نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا مگر اسی سال انھوں نے صدر اعظم کی فوج کو شکست دے کر روسچق پر دوبارہ حملہ کیا، اب کی بار وہ کامیاب رہے اور روسچق کے علاوہ سبسٹوا اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا، سبسٹوا کے بعد انھوں نے شوملہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو کوہ بلقان کو عبور کرنے کے لیے ضروری تھا لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

اس درمیان میں الکزنڈر اور نپولین کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے، ۱۸۱۱ء میں

---

(۱) ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص ۲۵۳

الکزنڈر کو نپولین کی طرف سے اس حد تک خطرہ لاحق ہوا کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف روسی فوجوں کے جارحانہ اقدام کو بالکل روک دیا اور اپنے جنرلوں کو حکم دیا کہ صرف مدافعانہ جنگ جاری رکھیں، ترک بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ انھوں نے دریائے ڈینوب کو عبور کرلیا مگر اپنے افسروں کی نااہلی کی وجہ سے انھیں آخر میں شکست ہوئی، یہ وہ وقت تھا جب الکزنڈر کو ہر لحہ نپولین کے حملہ کا اندیشہ تھا اور وہ اپنی تمام قوتیں اس کے مقابلہ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اس لیے فتح یاب ہونے کے باوجود اس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کردی مگر چونکہ وہ بسرآبیا کے علاوہ مولڈیویا اور ولاچیا کے لینے پر بھی مصر تھا اور محمود نے یہ مطالبہ سختی سے مسترد کردیا، اس لیے صلح کی کوشش ابتدا میں ناکام رہی، اس اثنا میں نپولین کے حملہ کا خطرہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور الکزنڈر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ترکوں سے صلح کرکے اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہوجائے، چنانچہ صلح کی گفتگو پھر شروع ہوئی اور آخر کار ۱۶ر جمادی الاولی ۱۲۲۷ھ مطابق ۲۸ر مئی ۱۸۱۲ء کو صلح نامہ بخارسٹ پر دولت عثمانیہ اور روس کے وکلا کے دستخط ہوگئے۔

صلح نامہ بخارسٹ: اس صلح نامہ کے رو سے دریائے پرتھ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، ولاچیا کا پورا صوبہ اور مولڈیویا کا بڑا حصہ جو دریائے پرتھ کے مغرب میں واقع تھا، دولت عثمانیہ کو واپس کردیا گیا، بسرآبیا اور مولڈیویا کے ایک جزر پر روس کا قبضہ باقی رہا، صلح نامہ کی ایک دفعہ سرویا سے متعلق بھی تھی، سلطان نے اہل سرویا کی گذشتہ باغیانہ شورشوں کو معاف کردیا اور ملک کے داخلی معاملات کا انتظام انہی کے ہاتھوں میں دے دیا، خراج کی رقم بھی کم کردی گئی اور اس کی وصولی ٹھیکہ داروں کے ہاتھ سے نکال کر شاہی خزانہ کے عہدہ داروں کے سپرد کردی گئی، سرویا پر سلطان کی فرماں روائی باقی رکھی گئی اور یہ طے پایا کہ بلغراد اور دوسرے قلعوں میں ترکی دستے پھر متعین کردیے جائیں۔

سرویا کی خودمختاری: لیکن سرویا اس فیصلہ سے مطمئن نہ ہوا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس نے پھر بغاوت شروع کر دی، قلعوں پر سروی فوجوں کا قبضہ تھا، باب عالی نے معاہدہ کے بموجب ان کے تخلیہ کا مطالبہ کیا، اہل سرویا نے اس کے جواب میں حکومت خود اختیاری کی تفویض چاہی، ہر فریق اپنے مطالبہ کی تعمیل کو مقدم قرار دیتا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۸۱۳ء میں سلطان نے سرویا کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی، قرہ جارج نے پھر علم بغاوت بلند کیا لیکن اب کی بار وہ بہت جلد ہمت ہار گیا اور اپنا تمام زر و جواہر دفن کر کے سرویا سے بھاگ گیا اور آسٹریا کی سلطنت میں پناہ لی، ترکوں نے سرویا کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا، امید تھی کہ پورے صوبہ پر ان کا تسلط ہو جائے گا لیکن قرہ جارج کے فرار ہونے کے بعد میلوش اوبرنیووچ (Milosch Obrenowitch) نامی ایک دوسرا قومی سردار سامنے آ گیا جس نے ۱۸۱۵ء میں اہل وطن کو منظم کر کے نہایت بہادری کے ساتھ ترکوں کا مقابلہ کیا اور چند ہی مہینوں میں ترکی دستوں کو شکست دے کر سرویا کے تمام علاقوں سے نکال دیا، صرف قلعوں پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، دوسرے سال سلطان نے ایک اور فوج روانہ کی لیکن یہ سرحد ہی تک پہنچ کر رک گئی اور صلح کی گفتگو شروع ہو گئی، جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا، واقعہ یہ تھا کہ باب عالی اس وقت زیادہ فوجیں سرویا میں بھیجنے کے لیے تیار نہ تھا، نپولین کی فتوحات کا خاتمہ واٹرلو کی شکست اور اس کی گرفتاری پر ہو چکا تھا اور یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ویانا میں ایک کانگریس منعقد کر کے یورپ کا نقشہ از سر نو مرتب کر رہی تھیں، اس کانگریس میں دولت عثمانیہ شریک نہیں کی گئی لیکن سرویا کا ایک وفد جو مدد کی درخواست لے کر گیا تھا باریاب کیا گیا، روس، آسٹریا اور پرشا کے فرماں رواؤں کا 'اتحاد مقدس' باب عالی کی تشویش کا باعث تھا، کیوں کہ روس کو حملہ کرنے کے لیے صرف بہانہ کی ضرورت تھی اور سرویا کی حمایت دولت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کا ایک اچھا ذریعہ تھی، ان حالات میں محمود نے مناسب سمجھا کہ جنگ جاری رکھنے کے بجائے سرویا والوں سے صلح کر لی جائے،

صلح نامہ میں اہل سرویا کو عام معافی دی گئی، محاصل کی وصولی انہی کے سپرد کر دی گئی، بارہ سرداروں کا ایک دیوان قایم کر کے ہر سردار کے انتخاب کا حق اس کے ضلع کے باشندوں کو دیا گیا، ملکی، مذہبی اور عدالتی خود اختیاری تسلیم کر لی گئی اور اہل سرویا کو ہتھیار رکھنے کی اجازت اور اپنا ایک امیر منتخب کرنے کا حق عطا کیا گیا، سرویا پر سلطان کی فرماں روائی اب بھی قایم رکھی گئی، گو یہ فرماں روائی سالانہ خراج اور بلغراد نیز چند دوسرے قلعوں پر قبضہ رکھنے تک محدود تھی۔

میلوش حکمراں سرویا: قرہ جارج نے ترکوں کو شکست کی خبر سن کر پھر وطن کا رخ کیا، ۱۸۱۷ء میں وہ خفیہ طور پر سرویا کی سرحد میں داخل ہوا مگر وہاں اب میلوش کی حکومت تھی، قرہ جارج کی واپسی سے میلوش کو تشویش پیدا ہوئی کیوں کہ پہلی جنگ آزادی میں اس کی شجاعت اور جاں فروشانہ خدمات نے اہل سرویا کے دلوں پر اس کی محبت اور احترام کے جو نقوش بٹھا دیے تھے، وہ دوسری جنگ میں اس کے فرار ہو جانے کے بعد بھی بالکل محو نہیں ہوئے تھے، میلوش نے اپنی سرداری کو خطرہ میں دیکھ کر قرہ جارج کو فریب سے قتل کرا دیا اور اپنی وفاداری کے ثبوت میں اس کا سر کاٹ کر باب عالی میں بھیج دیا، اسے اب کسی حریف کا خوف نہ تھا، نومبر ۱۸۱۷ء میں تمام ضلعوں کے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے اسے سرویا کا حکمراں (Prince) منتخب کر کے ملک کی حکومت اس کے خاندان کے لیے نسلاً بعد نسلٍ مستقل کر دی، شروع میں سلطان نے یہ لقب تسلیم نہیں کیا لیکن معاہدۂ اورنہ کے بعد ۱۸۳۰ء میں اس نے حکمراں کا لقب میلوش اور اس کے جانشینوں کے لیے باضابطہ طور پر منظور کر لیا۔

سلطنت کی عام کمزوری: سرویا کی بغاوت باب عالی کے ضعف کی تنہا مثال نہ تھی سلطنت کے ہر حصہ میں مرکزی حکومت کی کمزوری نمایاں تھی، پاشاؤں کی خودسری روز بروز بڑھتی جاتی تھی، اپیرس میں علی پاشا والی یانینا تقریباً خود مختار بن بیٹھا تھا اور اب وہ یونان، تھسلی اور جزائر ایونین کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا، اسی

طرح ودین، عکا اور بغداد کے پاشاؤں نے بھی چھوٹی چھوٹی خودمختار حکومتیں قایم کر لی تھیں، عرب میں وہابیوں نے تقریباً مکمل آزادی حاصل کر لی تھی اور حرمین شریفین پر بھی قبضہ کرلیا تھا، مصر میں محمد علی پاشا اپنے استقلال کی کوششوں میں مصروف تھا، ولاچیا، مولڈیویا اور یونان کے صوبے بھی بغاوت کے لیے بالکل تیار تھے، سلطنت کا کوئی حصہ قابل اطمینان حالت میں نہ تھا، ینی چری جن کی شجاعت اور وفاداری پر دولت عثمانیہ کی قوت کا مدار تھا اور جنھوں نے اول تین صدیوں میں سلطنت کے حدود ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع رقبوں تک پہنچا دیے تھے اب خود اپنی حکومت کے لیے ایک مستقل اور زبردست خطرہ بن کر رہ گئے تھے، روس سے جو لڑائیاں ہوئیں یا سرکش پاشاؤں کے مقابلہ میں جو مہمیں پیش آئیں ان میں اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہوگیا تھا کہ ینی چری میں وہ پہلی سی قوت باقی نہیں رہی، جہاں تک فوجی نظم وضبط کا تعلق تھا انیسویں صدی کے شروع میں وہ اس سے تقریباً خالی ہو چکے تھے، انھوں نے ان فوجی اصلاحات کے قبول کرنے سے جو یورپ میں جاری کی گئی تھیں اور جن کی وجہ سے یوروپین فوجوں کی برتری کا ثبوت ہر جنگ میں ملتا جاتا تھا قطعاً انکار کر دیا تھا، وہ ہر اصلاح کے مخالف تھے، خواہ فوجی ہو یا ملکی، سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا رکھنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا، دشمن کے مقابلہ میں تو ان کے قدم جمتے نہ تھے لیکن بغاوت اور سرکشی کے ذریعہ اپنی قوت کے مظاہرہ سے وہ کبھی نہ چوکتے، سلطان پر دباؤ ڈال کر جس شخص کو چاہتے وزارت کے عہدہ پر مامور کراتے اور جس وزیر سے ناخوش ہوتے اسے معزول کرا کے قتل کر دیتے، قسطنطنیہ کے باشندے ان کے خوف سے لرزاں رہتے تھے، صوبوں میں وہ ہر باغی پاشا کی رشوت قبول کرنے پر تیار ہو جاتے، ان کی سرکشی کا تجربہ محمود سے قبل بھی متعدد سلاطین کو ہو چکا تھا اور انھوں نے سلطنت کے امن وامان کے لیے ینی چری کے استیصال کی ضرورت بہت پہلے محسوس کر لی تھی لیکن یہ کام اتنا مشکل تھا کہ اس کے لیے محمود ہی جیسے صاحب عزم کی ضرورت تھی، تاہم اسے بھی اٹھارہ سال تک ان کی شورشیں انتہائی ضبط وتحمل کے ساتھ

برداشت کرنی پڑیں۔

افریقی مقبوضات: یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں کمزوری کی علامتیں ظاہر تھیں لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر افریقی مقبوضات میں نمایاں تھا، جب سے دولت عثمانیہ کی بحری قوت میں ضعف شروع ہوا، الجزائر، تونس اور طرابلس کے صوبے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے گئے اور انیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے قریب قریب مکمل آزادی حاصل کر لی، دولت عثمانیہ سے ان کا تعلق اس حد تک منقطع ہو چکا تھا کہ یوروپین حکومتیں ان کے بحری ڈاکوؤں کو جب موقع ملتا گرفتار کر لیتیں اور ان کے اس فعل سے باب عالی کو کوئی شکایت نہ ہوتی، افریقہ کے عثمانی مقبوضات میں سب سے زیادہ اہم صوبہ مصر کا تھا، لیکن وہاں بھی دولت علیہ کا اقتدار بہت کم رہ گیا تھا، عرصہ سے مصر کی اصلی حکومت مملوکوں کے ہاتھ میں تھی، باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں کا والی مقرر کر کے بھیجا جاتا تھا، اس کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ خراج کی معینہ رقم وصول کر کے پابندی کے ساتھ قسطنطنیہ بھیجتا رہے، مملوک اپنی منظم فوجی قوت کے زور سے سارے ملک پر چھائے ہوئے تھے، ۱۷۹۸ء میں نپولین نے انھیں شکست دے کر مصر پر قبضہ کر لیا تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرانسیسی فوج مصر سے نکل جانے پر مجبور ہوئی اور ۱۸۰۲ء میں صلح نامہ امیان کے رو سے یہ صوبہ دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا، واپسی کے بعد بھی مصر پر باب عالی کی حکومت صرف نام کے لیے تھی، اصلی اقتدار مملوکوں کا تھا جن کی قوت نپولین کے حملہ سے کمزور تو ضرور ہو گئی تھی مگر فنا نہیں ہوئی تھی، ۱۸۰۵ء میں سلطان نے محمد علی کو مصر کا پاشا مقرر کر کے بھیجا، محمد علی کے تقرر سے مصر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

محمد علی: محمد علی ۱۷۶۵ء میں کوالا نامی ایک قصبہ میں پیدا ہوا جو مقدونیا اور تھریس کی سرحد پر واقع تھا، اس کا باپ ایک چھوٹا سا زمیندار تھا، بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گیا، اس نے پڑھنا لکھنا کچھ نہ سیکھا، وہ اپنے ایک عزیز کے دیوان میں جو رشتہ میں اس کا چچا ہوتا تھا ملازم ہو گیا، یہ شخص باب عالی کی طرف سے کوالا کا حاکم تھا، ابتدا میں محمد علی نے تمبا کو کی

تجارت شروع کی جو مقدونیا کی بہت زرخیز تجارت تھی، لیکن جب ۱۷۹۸ء میں نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو باب عالی کے حکم سے محمد علی کے چچا نے تین سو البانی سپاہیوں کا ایک دستہ مصر روانہ کیا اور اپنے لڑکے علی آغا کو اس دستہ کا افسر مقرر کر کے محمد علی کو بحیثیت اس کے مشیر کے ساتھ کر دیا، اپنی دماغی قابلیت کی وجہ سے محمد علی بہت جلد اس دستہ کا حقیقی افسر بن گیا، گو بظاہر فوج کی کمان علی آغا کے ہاتھ میں تھی اس کے بعد چند معرکوں میں جو فرانسیسی فوج سے مصر میں پیش آئے محمد علی نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے، جس کے صلہ میں قپودان پاشا نے جو ترکی فوج کا سپہ سالار بھی تھا ۱۸۰۱ء میں اسے ترقی دے کر مصر کے نئے والی خسرو پاشا سے نہایت پرزور الفاظ میں اس کی سفارش کی، محمد علی ذہانت اور قابلیت میں خسرو پاشا سے بڑھا ہوا تھا، چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں اس نے باب عالی پر اپنی قابلیت کا سکہ کچھ ایسا بٹھایا اور ایسی تدبیریں کیں کہ ۱۸۰۵ء میں خسرو پاشا واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ خود محمد علی مصر کا حاکم مقرر کر دیا گیا، ۱۸۰۷ء میں اس نے ایک انگریزی فوج کو جو اسکندریہ پر قابض ہو گئی تھی شکست دے کر بھگا دیا، اس کے بعد اس کا اقتدار تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ پینتیس سال کی عمر میں وہ مصر کا سب سے زیادہ مقتدر آدمی بن گیا، یہ دیکھ کر مملوکوں نے اس کی مخالفت شروع کی، محمد علی ان کی قوت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ جب تک وہ فنا نہ ہو جائیں گے مصر پر پوری طرح تسلط قائم نہ ہو سکے گا، چنانچہ اس نے حملے کر کے انھیں کئی بار شکست دی اور ان کی قوت کو بہت کچھ نقصان پہنچایا، لیکن مملوکوں کا زور اب بھی کسی قدر باقی تھا، اب محمد علی نے فریب سے کام لیا اور ۵/صفر ۱۲۲۶ھ (یکم مارچ ۱۸۱۱ء) کو ان کے تقریباً پانچ سو بڑے بڑے سرداروں کو قاہرہ کے قلعہ میں مدعو کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ فریقین باہم صلح کر کے وہابیوں کے استیصال کے لیے متحدہ طور پر ایک مہم حجاز کو روانہ کریں، مملوک اس فریب میں آ گئے اور ان کے تمام سردار صلح کی گفتگو اور حجاز کی مہم پر غور کرنے کے لیے محمد علی کی پر تکلف دعوت میں شریک ہوئے، کھانے کے بعد محمد علی نے قلعہ کے دروازے بند کروا دئے اور پھر اپنے

البانی سپاہیوں کو اشارہ کیا، انھوں نے دیکھتے دیکھتے تمام مملوک سرداروں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنالیا، صرف ایک سردار اس قتل عام سے بچ کر نکل گیا، وہ قلعہ کی تیس فٹ بلند دیوار سے گھوڑا کودا کر بھاگا، باقی سب ہلاک ہوگئے، اس کے بعد تمام ملک میں مملوک کا قتل عام شروع ہوگیا اور ان کی پوری آبادی تقریباً نیست و نابود ہوگئی۔

حجاز کی مہم: محمد علی اب پورے مصر کا مالک تھا، ملک میں امن وامان قایم کرنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے طوسن پاشا کی سرکردگی میں وہابیوں کے خلاف حجاز کو فوجیں روانہ کیں، طوسن پاشا نے وہابیوں کو شکست دے کر مدینہ منورہ کو ان کے قبضہ سے چھڑالیا مگر مکہ معظمہ پر اب بھی انہی کا تسلط تھا اور انھوں نے طوسن پاشا کو طائف میں محصور کرلیا، یہ معلوم کر کے محمد علی پاشا خود مصر سے روانہ ہوا اور شعبان ۱۲۲۸ھ (اگست ۱۸۱۲ء) میں مکہ معظمہ پہنچ کر شریف غالب کو گرفتار کرلیا اور اسے مصر بھیج دیا اور اس کی جگہ یحییٰ بن سرور کو شریف مکہ مقرر کیا، مکہ معظمہ کے قبضہ سے نکل جانے سے وہابیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۱۹/ربیع الآخر ۱۲۲۹ھ (۱۷/اپریل ۱۸۱۴ء) کو ان کے امیر سعود کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد حجاز میں امن وامان ہوگیا اور لوگ بکثرت فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے آئے، محمد علی پاشا بھی حج سے فارغ ہو کر ۱۵/رجب ۱۲۳۰ھ کو مصر پہنچ گیا۔

وہابی بغاوت کا انسداد: امیر سعود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اور جانشین عبداللہ بن سعود نے طوسن پاشا سے صلح کی گفتگو کی اور اپنے پایہ تخت شہر درعیہ کو اس کے حوالہ کردینا منظور کیا لیکن جب طوسن پاشا نے اس کی اطلاع محمد علی کو دی تو اس نے مصر سے یہ جواب بھیجا کہ ابن سعود کا قسطنطنیہ جانا صلح کی ایک لازمی شرط ہے اور اگر وہ اسے منظور نہ کرے گا تو ایک تازہ فوج اس کے مقابلہ میں روانہ کی جائے گی، اس اثنا میں یہ سن کر مصری فوج محمد علی پاشا سے باغ ہوگئی ہے، طوسن پاشا حجاز سے روانہ ہوگیا اور ذیقعدہ ۱۲۳۰ھ (نومبر ۱۸۱۹ء) میں قاہرہ پہنچ گیا۔

قاہرہ میں امن قایم ہونے کے بعد محمد علی پاشا نے وہابیوں پر حملہ کرنے کے

لیے ازسرنو تیاری شروع کردی اور اپنے بڑے لڑکے ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی، ابراہیم پاشا مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد بلاد نجد کی طرف روانہ ہوا اور رس اور بعض دوسرے شہروں پر قبضہ کرتا ہوا ۲۹ر جمادی الاولی ۱۲۳۳ھ مطابق ۶ر اپریل ۱۸۱۸ء کو شہر درعیہ کے سامنے پہنچا، جس میں عبداللہ بن سعود اپنے زبردست لشکر کے ساتھ مقیم تھا اور اس شہر کا محاصرہ کرلیا، سات ماہ کے محاصرہ کی شدت سے عاجز آکر عبداللہ بن سعود نے ابراہیم پاشا سے صلح کی درخواست کی اور شرائط صلح طے کرنے کے لیے خود ابراہیم پاشا کے خیمہ میں آیا، ابراہیم پاشا نے اس کی بڑی تعظیم وتکریم کی، آخرکار ان شرائط پر صلح قرار پائی کہ درعیہ ابراہیم پاشا کے حوالہ کردیا جائے گا لیکن وہاں کے باشندوں کے جان و مال کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی، کوکب دری اور دوسرے جواہرات جن پر مدینہ منورہ کی فتح کے وقت وہابیوں نے قبضہ کرلیا تھا، واپس کردیے جائیں گے اور عبداللہ بن سعود سلطان کی خواہش کے مطابق قسطنطنیہ بھیج دیا جائے گا، چنانچہ عبداللہ بن سعود مصر کے راستہ سے قسطنطنیہ روانہ ہوگیا، قسطنطنیہ پہونچنے کے بعد ۱۹ر نومبر ۱۸۱۹ء کو وہ قتل کردیا گیا۔

محمد علی کی بغاوت: اس کے بعد محمد علی نے سنار اور نیوبیا کے علاقے فتح کرکے مملکتِ مصر میں شامل کرلیے، اس نے یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج تیار کی تھی، جس کی تنظیم وتربیت کے لیے اس نے فرانس کے ان آزمودہ کار فوجی افسروں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر اپنے ہاں بلالیا تھا جو نپولین کی ماتحتی میں کام کرچکے تھے، اس نے فرانسیسی انجینیروں کی مدد سے ایک زبردست بحری بیڑہ بھی تعمیر کرایا، گودی اور بندرگاہ بنوائی، توپخانے اور سلح خانے قایم کیے اور اسکندریہ سے قاہرہ تک ایک نہر تعمیر کرائی، حکومت اور انتظام کا ملکہ اسے فطرت کی طرف سے ملا تھا، وہ دشمنوں کے لیے نہایت سخت تھا مگر رعایا کے ساتھ اس کا سلوک ہمیشہ عدل وانصاف کا تھا، اس کی عدالت میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگوں کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا،

مصر والوں پر اس کے محصولوں کا بار گراں تھا اور اس کی فوج میں جبری بھرتی کے قوانین بھی سخت تھے، تاہم اس کے عہد حکومت میں ملک میں جس قدر امن و امان اور خوشحالی پھیلی اس سے پہلے مدت سے نہیں دیکھی گئی تھی، محمد علی نے نہ صرف مصر میں امن و امان قایم کیا، بلکہ ۱۸۲۵ء میں سلطان کی طلب پر اپنی فوجیں یونان میں بھیج کر وہاں کی زبردست بغاوت کا بھی استیصال کر دیا۔

بغاوت یونان: یونان کی بغاوت مختلف اسباب کا نتیجہ تھی، یہ اسباب مدت سے جمع ہو رہے تھے اور ان میں سے بعض خود دولت عثمانیہ کے پیدا کردہ تھے مثلاً ترکوں نے جب کوئی ملک فتح کیا تو وہاں کے باشندوں سے اپنی فرماں روائی تسلیم کرانے کے بعد صرف خراج لینے پر قناعت کی اور ان کے مذہب، ان کی زبان اور ان کے رسم و رواج سے کوئی تعرض نہیں کیا، انھوں نے مفتوحین کی عصبیت کبھی فنا نہیں کی، ان کا یہ طرز عمل تمام مفتوحہ قوموں کے ساتھ تھا مگر اس عموم میں یونانیوں کے ساتھ انھوں نے خاص خصوصیت برتی، بقول سر چارلس ایلیٹ (Eliot) ''جنوبی مشرقی یورپ پر حکومت ترکوں کی تھی لیکن اس (انیسویں) صدی تک اس کے مذہب، تعلیم، تجارت اور مالیات کا انتظام یونانیوں کے ہاتھ میں تھا'' (۱) اتنا ہی نہیں بلکہ امور سلطنت کا انتظام بھی بہت کچھ یونانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا، ترکوں نے یونان اور اس کے متعلقہ جزائر فتح کرنے کے بعد مقامی حکومت بڑی حد تک یونانیوں کو سپرد کر دی تھی، بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین کے یونانی جزائر میں یونانیوں کی خود اختیاری خاص طور پر نمایاں تھی، ان جزیروں میں بڑے بڑے تاجر اور جہاز راں تھے، جنھوں نے بغاوت میں خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا، شیویل اپنی کتاب ''جزیرہ نمائے بلقان اور مشرق ادنیٰ'' میں یونانیوں کی مقامی حکومت خود اختیاری کے متعلق بیان کرتا ہے کہ ''بحر ایجین کے جزیروں میں یہ حیرت انگیز حدود تک پہنچ گئی تھی، اس خطہ میں ہر جزیرہ، اکثر کسی تحریری سند شاہی کی بنا پر اپنے معاملات کا انتظام خود کرتا تھا

(1)The Estern Question by: Marritt, P. 198

اور سال میں ایک بار کے علاوہ جب خراج کی معہودہ رقم وصول کرنے کے لیے عثمانی عہدہ دار آتا تھا شاید ہی کبھی کوئی سرکاری عہدہ دار وہاں نظر آتا ہو، پھر تھسلی اور اپیرس کے پہاڑی علاقوں میں گاؤں کے باشندے نہ صرف اپنے ہاں کے ملکی انتظامات کے مالک تھے بلکہ انھیں ہتھیار رکھنے کا غیر معمولی حق بھی حاصل تھا، ان کے مسلح دستوں نے جوار ماٹولی (Armatoles) کے نام سے مشہور تھے، مفصلات کو ڈاکوؤں سے پاک رکھنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی تھی، یونانیوں میں حکومت خود اختیاری کی آخری مثال کے طور پر پیلوپونیس (Peloponnesus) کی حالت پر غور کیجیے جو موجودہ زمانہ میں موریا کے نام سے زیادہ مشہور ہے، ٹیکس کی فراہمی میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے موریا کے پاشا نے ان کی ذمہ داری دولت مند عیسائی زمینداروں کی ایک جماعت پر عائد کردی تھی جن کو پرائمیٹ (Primates) کہتے تھے اور یہ لوگ ضلعوں اور دیہاتوں کے منتخب شدہ نمایندوں سے مدد لیتے تھے، یہ پرائمیٹ ترکوں کے گماشتہ ہونے کی حیثیت سے اگرچہ نادانستہ اور اکثر شاید دانستہ بھی اپنے غریب ہم مذہبوں پر مظالم کرتے رہتے تھے تاہم چونکہ وہ حکومت اور رعایا کے درمیان اہل موریا کی ایک نمایندہ جماعت تھے اس لیے موافق حالات میں ایک حقیقی مجلس شوریٰ کی حیثیت اختیار کرسکتے تھے۔"(۱)

یونانیوں کی بحری قوت: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ بحرایڈریاٹک اور بحرایجین کے جزیروں میں تاجروں اور ماہر جہازرانوں کی ایک کثیر تعداد نے قومی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا، ترکی بحریہ میں جہازرانوں کا بڑا حصہ ابتدا ہی سے یونانیوں پر مشتمل تھا اور سلطنت عثمانیہ کی تجارت بھی بیشتر انہی کے ہاتھوں میں تھی، اٹھارہویں صدی میں دولت علیہ اور روس کی جنگ میں یونانیوں کو اپنی تجارت کے فروغ دینے کا بہت موقع ملا، صلح نامہ کینارجی (۱۷۷۴ء) کے ضمیمہ کے طور پر ۱۷۸۳ء میں روس اور دولت علیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا جس کے رو سے یونانی جہازوں کو مخصوص تجارتی رعایتیں اور روسی علم

(1)The Balkan Peninsula and the near east by- F. Schevill, P. 328

استعمال کرنے کی اجازت حاصل ہوگئی، اس کے بعد جب نپولین کے عہد میں فرانس اور انگلستان کی جنگ نے ترکی جہازوں کے سوا تمام جہازوں کی ناکہ بندی کردی تو یونانیوں نے روسی علم چھوڑ کر ترکی علم استعمال کرنا شروع کردیا، غرض اس زمانہ میں بھی جب یورپ کی تمام قومیں نپولین کے اٹھائے ہوئے طوفان میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھیں یونانی اپنی تجارت کو برابر ترقی دیتے رہے اور انھوں نے نہ صرف بہت زیادہ دولت پیدا کرلی بلکہ جہازرانی کے فن میں بھی ملکہ حاصل کرلیا، چونکہ شمالی افریقہ کے بحری قزاقوں سے انھیں خطرہ رہا کرتا تھا، اس لیے وہ اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے کچھ توپیں بھی رکھنے لگے تھے، اس طرح آہستہ آہستہ انھوں نے ایک ایسا بیڑا تیار کرلیا تھا جو آیندہ جنگ میں کام آسکتا تھا۔

ارماٹولی اور کلیفٹ: بحری قوت کے علاوہ یونانیوں میں بری طاقت بھی ایک حد تک پیدا ہوگئی تھی جس کا بڑا ذریعہ ارماٹولی (Armatoli) اور کلیفٹ (Klephts) تھے، بازنطینی قیصروں کے عہد میں دروں اور سڑکوں کی حفاظت کے لیے تھسلی کے سرحدی علاقوں کے وحشی پہاڑی باشندے ایک قسم کی بے ضابطہ ردیف (Militis) میں بھرتی کیے جاتے تھے، ان کو ارماٹولی کہتے تھے، سلاطین عثمانیہ نے اس نظام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے ترقی دی، چنانچہ خود باب عالی کی پالیسی کی وجہ سے یونان کے پہاڑی باشندے کئی پشتوں سے اسلحہ کے استعمال کے عادی تھے اور پہاڑی لڑائیوں میں ملکہ حاصل کرچکے تھے، ارماٹولی کے دستوں میں جن کی حیثیت نیشنل گارڈ کی تھی، صرف یونانی باشندے بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کے افسر بھی تمام تر یونانی ہی ہوتے تھے، ابتداءً ان کو کلیفٹ یعنی پہاڑی ڈاکوؤں سے ملک کی حفاظت کے لیے ہتھیار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور اکثر ڈاکوؤں ہی کے گروہ سے وہ بھرتی بھی کیے جاتے تھے لیکن جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں باب عالی کو ان کی تعداد اور تنظیم کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے ان کے دستے کم کرنے شروع کیے، یہ دیکھ کر ارماٹولی باغی ہوگئے اور

اپنے سابق ساتھیوں یعنی کلیفٹ کی جماعت میں شریک ہونے لگے، کلیفٹ وقتاً فوقتاً اپنے پہاڑی درّوں سے نکل کر قرب وجوار کے باشندوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ہتھیار بھی ان کے پاس بہت وافر مقدار میں رہا کرتے تھے، وہ اپنی قوت سے کسی قومی تحریک کو بہت کچھ مدد پہنچا سکتے تھے، یونان کی جنگ آزادی میں ارماٹولی اور کلیفٹ کی خدمات خاص طور پر نمایاں ہیں۔

حکومت میں یونانیوں کا اقتدار: یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے ملکی معاملات میں بھی بڑا اقتدار حاصل تھا، قسطنطنیہ کا ایک حصہ فنار کے نام سے مشہور تھا، اس میں یونانی کلیسا کا بطریق اور اونچے درجہ کے پادری اور اسقف رہا کرتے تھے، بعد میں بڑے بڑے دولت مند یونانیوں نے آکر اسی حصہ میں بود و باش اختیار کر لی، یہ لوگ کلیسا کے صیغۂ مال کے گماشتے بھی تھے اور باب عالی کی طرف سے بھی محصول جمع کرتے تھے، رفتہ رفتہ سترہویں صدی عیسوی میں فناریوں کا ایک جدید سیاسی طبقہ قایم ہو گیا اور سلطنت عثمانیہ کے دفتروں میں اکثر یونانی عہدہ دار اسی طبقہ کے لوگ ہونے لگے، تاہم احمد کوپریلی کے صدر اعظم ہونے سے پہلے عثمانی دفتروں میں جو یونانی کام کرتے تھے ان کے عہدے زیادہ بلند نہ تھے لیکن ۱۶۶۹ء میں کنیڈیا کی فتح کے بعد احمد کوپریلی نے اپنے سکریٹری پنایوتی (Panayoti) کے لیے جو ایک ممتاز فناری یونانی تھا ترجمان باب عالی (Dragoman of the Porte) کا ایک جدید عہدہ قایم کیا جو ایک نہایت اہم سیاسی عہدہ بن گیا، پنایوتی کے بعد ایک دوسرا لایق یونانی اس عہدہ پر مقرر کیا گیا، رفتہ رفتہ یہ عہدہ وزارتِ امور خارجہ کا عہدہ بن گیا، جس پر یونانیوں ہی کا تقرر ہوتا رہا اور سلطنت عثمانیہ کے غیر ملکی معاملات زیادہ تر انہی کے ہاتھوں میں رہے، کچھ دنوں کے بعد عثمانی بحریہ کے لیے بھی ایک مترجم کا عہدہ قایم کیا گیا اور اس پر بھی ایک یونانی ہی مقرر کیا گیا، یہ مترجم عثمانی امیر البحر کے سکریٹری کا منصب رکھتا تھا اور چونکہ امیر البحر جزائر اتچین کا گورنر بھی تھا اس لیے مترجم بحریہ (Dragoman of the Eleet) سے ان جزائر کی

یونانی آبادی کے تعلقات سرکاری طور پر قایم ہو گئے ، اٹھارہویں صدی کے شروع میں مولڈیویا اور ولاچیا کی امارت بھی دوسرے بڑے بڑے عہدوں کی طرح یونانیوں کو دی گئی ، یہ بڑے بڑے عہدہ دار اپنے ماتحت عہدوں پر اپنے ہی ہم وطن اور ہم قوم اشخاص کو مقرر کرنے لگے، یوں رفتہ رفتہ حکومت کے تمام شعبوں مین یونانیوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔

عام یونانیوں کی حالت: سلطنت عثمانیہ کی عام یونانی رعایا کی حالت بھی یورپ کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کہیں بہتر تھی ، جارج فنلے اپنی مستند شہرۂ آفاق تاریخ یونان میں لکھتا ہے:

> ''حکومت عثمانیہ گو بعض حیثیتوں سے یورپ میں سب سے زیادہ مستبد حکومت تھی ، تاہم دوسرے اعتبارات سے سب سے زیادہ متحمل اور روادار بھی تھی ، یہ جسم کو قید کرتی تھی لیکن دماغ کو آزاد چھوڑ دیتی تھی، اس کی عیسائی رعایا کے نیچے کے طبقے یورپ کے دوسرے حصوں کے مساوی طبقوں کی بہ نسبت ذہنی حیثیت سے عموماً زیادہ ترقی یافتہ تھے، یونانی نہ تو صنعت وحرفت کے کارخانوں کے غلام تھے اور نہ زرعی غلام، ان کی مزدوری زیادہ آزاد بھی تھی اور زیادہ نفع بخش بھی اور انھیں شہری حقوق اتنے ہی زیادہ حاصل تھے جتنے خود فرانس میں اسی طبقہ کے لوگوں کو انقلاب سے قبل حاصل تھے۔''
>
> ''اٹھارہویں صدی کے آخر کے قریب عثمانی تسلط کا بار اس قدر ہلکا ہو گیا تھا کہ یونانی ایک ترقی کرنے والی قوم بن گئے تھے، ان میں ایک بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے کاشتکار زمینداروں کی تھی ، جنھیں اپنی حالت کے سدھارنے کے مواقع اکثر حاصل تھے، شہروں میں مزدوروں اور تاجروں کی جفاکش آبادی کو دولت مند تاجروں کی

جماعت سے جن کو اکثر غیر ملکی حکومتوں کی حمایت حاصل ہوتی مدد ملتی رہتی تھی، ساحلی علاقوں میں عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی، جس میں زیادہ تر یونانی اور تھوڑے سے البانی شامل تھے، یونانیوں کو بڑی حد تک شخصی آزادی کے مواقع حاصل تھے، استحصال بالجبر کا بار ترک کسان اور تاجر پر اسی قدر تھا جس قدر یونانی کسان اور تاجر پر اور معاشرتی مدارج کی ترقی میں یونانیوں کے مقابلہ میں ترکوں کے لیے سیاسی رکاوٹیں عموماً زیادہ تھیں، صوبوں کے بہت کم ترک باشندوں کو انتظام حکومت میں کبھی بھی اتنا دخل حاصل ہوا جتنا اہل فنار کو باقاعدہ اور مستقل طور پر حاصل تھا، دیہاتی علاقوں میں اسلامی آبادی کے مسلمان افسر شاذ ہی لوگوں کو بے انصافی سے بچانے کی اتنی قدرت رکھتے تھے، جتنی یونانی جماعتوں کو حاصل تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں یونانیوں سے کم حقوق و مراعات حاصل تھے۔''(۱)

یورپین سیاحوں کا بیان ہے کہ یونانیوں کی مذہبی آزادی پر آئرلینڈ کے کیتھولک رشک کر سکتے تھے اور بلدی معاملات میں انھیں اس سے زیادہ اختیارات حاصل تھے جتنے فرانس کے باشندوں کو اپنے علاقوں میں اگرچہ بعض سیاحوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یونانی بڑے مصائب میں مبتلا تھے اور انھیں اپنی جان و مال کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہا کرتا تھا لیکن بعض دوسرے سیاحوں کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ یورپ کی کسی قوم پر محصول کا بار اتنا ہلکا نہ تھا جتنا یونانیوں پر اور نہ کسی قوم پر شخصی حیثیت سے اس قدر کم پابندیاں عائد تھیں، یونانی کلیسا کے پاس بڑی دولت تھی اور تمام ترکی میں اس کا سیاسی اقتدار بھی زیادہ تھا، یونانیوں کو مولڈیویا اور ولاچیا میں شاہانہ قوت حاصل تھی، یورپ میں

(۱) 'تاریخ یونان' از جارج فنلے جلد ۵ ص ۹-۷۸-۲۷، اکسفرڈ ۱۸۷۷ء

A History of Greece by George Finley Oxford 1877

سلطنت عثمانیہ کے محاصل کا بڑا حصہ یونان کے پرائمیٹ وصول کرتے تھے اور بہت سے اضلاع میں یونانی بلدیوں (میونسپلٹیوں) کو تقریباً غیر محدود اختیارات حاصل تھے (۱) روس، پولینڈ اور ہنگری کے عیسائی کاشتکاروں کی بہ نسبت سلطنت عثمانیہ میں عیسائی کاشتکاروں کو اپنی محنت کا پھل زیادہ ملتا تھا، یونانی شہری کو تقریر کی آزادی اس سے زیادہ حاصل تھی جتنی شہنشاہ نپولین اول کے عہد میں سلطنت فرانس کے شہریوں کو حاصل تھی اور اپنے قصبوں کے انتظامی معاملات میں انھیں اتنا ہی اختیار حاصل تھا جتنا فرانس کے باشندوں کو (۲) سلطنت عثمانیہ کے عیسائی باشندے 'رعایا' کا لفظ اپنے لیے تحقیر کا باعث سمجھتے تھے، دولت علیہ کے تمام عیسائی مورخوں نے بھی غلطی سے اس کو ایک تحقیری لقب خیال کیا ہے، بہر حال ترکوں نے یونانیوں کے ساتھ یہاں تک رواداری برتی تھی کہ انھیں 'رعایا' کے بجائے 'معاون' کہتے تھے، فرانسیسی مورخ والازوں کیئر لکھتا ہے: ''انھوں (ترکوں) نے یونانیوں کا یہاں تک لحاظ رکھا تھا کہ انھیں 'رعایا' کے تحقیری نام کے بجائے 'معاون' کا لقب دیا تھا۔'' (۳)

تعلیم اور تحریک آزادی: تعلیم میں بھی یونانی یورپ کی کسی قوم سے پیچھے نہ تھے بلکہ ان میں پڑھے لکھے آدمیوں کا تناسب غالباً یورپ کی دوسری عیسائی قوموں سے زیادہ تھا (۴) سلطان سلیم ثالث کے عہد سے یونانیوں میں تعلیم بہت ترقی کر گئی تھی اور تعلیم ہی ان کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، ان کے مدارس سلطنت کے حصہ میں قایم ہو گئے تھے، علاوہ بریں دولت مند اشخاص اپنے لڑکوں کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے تھے، جہاں وہ قومی آزادی کے خیالات سے متاثر ہوتے تھے اور واپس ہونے کے بعد اپنے وطن میں ان خیالات کی اشاعت کرتے تھے، ہر یونانی جو لکھ پڑھ سکتا تھا وہ قدیم یونانی لٹریچر سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا اور

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۷-۶ (۲) ایضاً ص ۱۷ (۳) تاریخ دولت عثمانیہ از والاثردن کیر (ترجمہ اردو) جلد اول ص ۴۰۴ (۴) فنلے جلد ۶ ص ۱۶

قدیم یونان کی عظمت کی یاد محکومی کے دور میں بھی اس کے سینہ کو گرم رکھتی تھی، ایک شاعر اور ایک ادیب کی کوششوں سے آزادی کی لہر پوری قوم میں دوڑ گئی، ریگاز (Rhigas) کی قومی نظموں نے اہل یونان کے جذبۂ حریت کو مشتعل کر دیا، وہ ایک خفیہ سیاسی انجمن کا بانی بھی تھا اور ریاستہائے بلقان کی مختلف سیاسی انجمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتا تھا، اپنی سازشوں کی بنا پر ۱۷۹۸ء میں وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، کوریز (Koraes) کی خدمات ریگاز سے زیادہ وقیع اور پائدار تھیں، اس نے سیاسی کتابیں بھی لکھیں لیکن اس کا اہم کارنامہ وہ مقدمات ہیں جو اس نے یونانی ادبیات عالیہ (کلاسکس) پر سلیس اور فصیح زبان میں لکھے ہیں، ان مقدمات سے اس نے سیاسی پروپگنڈے کا کام بھی لیا اور اس طرح یونان پرستی کی تحریک کو مدد پہنچائی اور ساتھ ہی ساتھ لسانی اصلاح کی تحریک بھی شروع کی جسے یونانی زبان کی نشاۃ ثانیہ کہہ سکتے ہیں، موجودہ یونانی زبان اسی کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔

ایلیسن فلپس (Alison Phillips) لکھتا ہے:

”مراعاتِ خصوصی (۱) سے پہلے بھی سلطان کی عیسائی رعایا اپنے مذہبی ارکان کے ادا کرنے، دولت جمع کرنے اور جس طرح چاہے تعلیم حاصل کرنے میں بالکل آزاد تھی، عیسائی کلیسا نیز حکومت کے اونچے درجہ تک ترقی کر سکتا تھا، ترجمان باب عالی یا کسی صوبہ کا گورنر ہو سکتا تھا، عثمانی حکومت میں کسانوں کا درجہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اکثر حصوں سے کہیں بہتر تھا، زرعی غلامی جو تمام عیسائی یورپ میں تقریباً عالمگیر تھی، ترکی میں مفقود ہو چکی تھی اور ترکی مملکت کے بہت سے حصوں میں کاشت کاروں کو ایسی خوش حالی حاصل تھی کہ اس سے

---

(۱) مراعات خصوصی یا Capitations وہ مراعات اور امتیازات تھے جو سلطنت عثمانیہ میں غیر ملکیوں کو حاصل تھے، ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

بعض ان قوموں کے کسان جو زیادہ مہذب سمجھی جاتی تھیں واقف بھی نہ تھے۔"(۱)

مذکورہ بالا حالات کی موجودگی میں یونانیوں کا علم بغاوت بلند کرنا تعجب سے خالی نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یونانیوں کو جو مراعات سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھیں وہی ان کی حوصلہ افزائی کا سبب بن گئیں، اس کے علاوہ دولت علیہ کی بڑھتی ہوئی کمزوری، اس کے اندرونی معاملات میں یوروپین حکومتوں کی مداخلت، یونانیوں کے ساتھ روس کی سازشیں اور پھر انقلاب فرانس کی عام ہنگامہ خیزی ان سب نے مل کر یونانی قوم کو جسے خود سلاطین عثمانیہ کی پالیسی نے ریاست اندر ریاست (Imperium in imperis) کے اختیارات دے کر شروع ہی سے ایک حد تک حکومت خود اختیاری تفویض کر دی تھی مکمل آزادی کے لیے آگے بڑھایا اور بالآخر انگلستان، روس اور فرانس کی حمایت نے اسے کامیاب کیا۔

انقلاب فرانس کا اثر: یونان کی تحریک آزادی پر انقلاب فرانس کا بہت زیادہ اثر پڑا، اس وقت یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جو فرانس کے عہد آفریں انقلاب سے متاثر نہ ہو، یونانیوں نے بھی اس انقلاب کا خیر مقدم کیا، ان پر پیرس کی ادبی انجمنوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ پڑا، بقول فنلے انھوں نے دیکھا کہ تحریر و تقریر سے تلوار کا کام لیا جا سکتا ہے یعنی حکومت الٹ دی جا سکتی ہیں، یونانی چونکہ تحریر و تقریر میں ہمیشہ سے ماہر رہے ہیں اس لیے انھوں نے سلطنت عثمانیہ کا تختہ الٹ دینے کی غرض سے ادبی مجلسیں اور خفیہ انجمنیں قایم کرنی شروع کر دیں، ان میں سے دو انجمنیں خاص طور پر اہم تھیں، ایک فائلومیوز سوسائٹی (Philomuse Society) جو ۱۸۱۲ء میں ایتھنز میں قایم ہوئی اور دوسری فائلیک ہیتریا (Philike Hetairia) جسے ۱۸۱۴ء میں تین یونانی تاجروں نے اوڈیسا

(۱) 'یونان کی جنگ آزادی' از ایلیسن فلپس مطبوعہ لندن ۱۸۹۷ء ص ۸

The War of Greet Independence by Alison Phillips London 1897

میں قایم کیا، فائلومیوز سوسائٹی ایک قسم کی ادبی انجمن تھی اور وہ اپنے سرمایہ سے یونانیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ کی یونی ورسٹیوں میں بھیجتی تھی، چنانچہ جن لوگوں نے یونان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا، ان میں سے بہتیروں نے اسی انجمن کی مالی مدد سے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی۔

ہتیریا: فائلیک ہتیریا ایک سیاسی انجمن تھی، جو خاص طور پر یونان میں انقلاب پیدا کرنے کی غرض سے قایم کی گئی تھی، فنلے کا بیان ہے کہ ’اس کے ابتدائی ارکان دیوالیے تاجر اور سازشی قسمت آزما تھے، انجمن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ عثمانیوں کا جوا کندھے سے اتارنے کے بعد مشرق میں یونانی سلطنت از سرنو قایم کی جائے اور اس کے لیے تمام یونانیوں کو فوجی حیثیت سے منظم کیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے انجمن نے ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا، اس کے بعض منصوبے عجیب و غریب تھے مثلاً سلطنت عثمانیہ کو فنا کردینے کے لیے اوڈیسا کے ارکان ہتیریا نے یہ تجویز کیا تھا کہ قسطنطنیہ میں آگ لگادی جائے، سلاح خانہ کو جلا دیا جائے، جنگی جہازوں کا بیڑا برباد کردیا جائے، سلطان اور اس کے وزیروں کو قتل کردیا جائے اور قسطنطنیہ کی پوری مسلمان آبادی تہ تیغ کردی جائے، فنلے ان منصوبوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ’یہ تجارت پیشہ مفسدہ پرداز خیال کرتے تھے کہ ایک سلاح خانہ میں آگ لگا کر اور ایک بادشاہ کو قتل کرکے وہ سلطنت کا تختہ الٹ سکتے ہیں، انھوں نے اس امکان کو نظر انداز کردیا تھا کہ اس سے کروڑوں جنگجو مسلمانوں کی آتشِ غضب بجا طور پر بھڑک اٹھتی اور وہ خونیں انتقام کے جوش میں ترکی حکومت کو بچانے کے لیے قسطنطنیہ کی طرف دوڑ پڑتے اور اگر یہ سازش کرنے والے عثمانی نظام حکومت کی تمام خرابیوں کے اصلی سرچشمہ کو نیست و نابود کرچکے ہوتے تو مسلمانوں نے ایک جدید اور زیادہ طاقتور ترکی سلطنت کی بنیاد رکھ دی ہوتی‘(۱) ہتیریا کی کامیابی کی بڑی وجہ وہ خیالات تھے جو عام طور پر اس وقت

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۰۰

سلطنت عثمانیہ کے متعلق پھیلے ہوئے تھے، عموماً یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ سلطنت اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے اور روس بہت جلد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا ہے، ہتیر یا اسی زمانہ میں قایم ہوئی جب یہ خیالات یونانیوں میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ اس کے ممبروں کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھتی گئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں تک پہونچ گئی اور بہت سے دولت منداور ذی اثر یونانی اس میں شامل ہو گئے، روس کے بہت سے فوجی افسر بھی اس کے ممبر ہو گئے تھے، ان کی شرکت کی وجہ سے عوام یہ سمجھتے تھے کہ آیندہ جنگ آزادی میں روس یونان کی مدد کرے گا، اسی بناپر لوگ بکثرت اس انجمن کے ممبر بنتے گئے، میریٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۲۰ء تک اس کے ممبروں کا شمار دو لاکھ تک پہنچ گیا تھا(۱) ہر طبقہ کے لوگ اس میں داخل ہوتے تھے، دلی خلوص اور جاں نثاری کے ساتھ یونان کی آزادی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا رکنیت کی ایک لازمی شرط تھی، جو لوگ انجمن میں داخل ہوتے تھے ان کو یہ حلف دیا جاتا تھا: اپنے مذہب اور وطن کے لیے جنگ کرو، اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے دشمنوں سے نفرت کرو، انھیں ستاؤ، انھیں بالکل نیست و نابود کردو"(۲) اس انجمن کا ایک اہم قانون یہ تھا کہ ہر ممبر کو اپنے لیے اسلحہ اور گولا بارود خود فراہم کرنا پڑتا تھا، انجمن کے ایجنٹ جن کو مبلغ یا داعی (Apostles) کہتے تھے سلطنت عثمانیہ کے ہر حصہ میں یونانی کلیسا کے پیرووں کے پاس بھیجے جاتے تھے تاکہ ترکوں کے خلاف نفرت اور روس کے ساتھ عقیدت کے جذبات پھیلائیں، ہتیر یا کی شاخیں اور اس کے نمایندے سلطنت عثمانیہ کے ہر یورپین صوبہ میں ایشیاے کوچک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اور ہر غیر مملکت میں جہاں یونانیوں کی کوئی تعداد آباد تھی پھیلے ہوئے تھے۔

روس کی سازشیں: جس چیز نے یونانیوں کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کی، وہ روس کی سرپرستی تھی، گو یہ سرپرستی تمام تر روس کے ذاتی اغراض پر منحصر تھی اور وہ شروع سے

(۱) میریٹ ص ۲۰۳ (۲) کریسی جلد ۲ ص ۲۰۱

یونانیوں کو بطور آلہ کار کے استعمال کرنا چاہتا تھا، پیٹر اعظم کے وقت ہی سے روس کے مدبرین نے یونانیوں کے مذہبی تعصب کو زار کے ساتھ سیاسی تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا شروع کر دیا تھا، دریائے پرتھ کے ساحل پر پیٹر کی حوصلہ شکن شکست نے کچھ دنوں کے لیے روس کے اثر کو بڑھنے سے روک دیا لیکن ملکہ این اور کیتھرائن ثانیہ کے دورانِ حکومت میں روس کے ایجنٹ سلطنت عثمانیہ کے یوروپین صوبوں میں نہایت سرگرمی کے ساتھ سازشوں کا جال پھیلاتے رہے اور یونانیوں کو دولت علیہ کے خلاف بغاوت کرنے پر برابر آمادہ کرتے رہے، فنلے لکھتا ہے کہ ''روس کی سازشیں جنھوں نے اہل یونان پر بہت سے مصائب ڈھائے ہیں عملی طور پر ۱۷۶۴ء میں شروع ہوگئی تھیں، چاندلر (Chandler) نے جو ۱۷۶۷ء میں یونان گیا تھا، لوگوں کو اکثر یہ گفتگو کرتے سنا کہ انھیں روس کی مدد سے جلد حکومت عثمانیہ سے نجات ملنے والی ہے''(۱) روس کی مدد کی حقیقت کیا تھی، اس کے متعلق بھی فنلے کا بیان قابل غور ہے، وہ لکھتا ہے: ''بدقسمتی سے روس کے اثر نے یونانیوں کی توجہ مقامی اصلاحات سے ہٹا کر فتح کے منصوبوں کی طرف مبذول کر دی، حکومت روس یونانیوں کو ایسی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوسروں کی مدد کے بغیر خود اپنی کوششوں سے آزادی حاصل کر سکیں، سلطان کی غیر مطمئن رعایا کی حیثیت سے وہ کیتھرائن کی پالیسی کے کارآمد آلے تھے لیکن مقامی حقوق و مراعات کے حاصل ہونے کی صورت میں جن سے انھیں (اہل) کیوس (Chios) کی طرح اپنی حالت کو بہتر بنانے کا موقع ملتا، وہ سلطان کی کارآمد رعایا بن جاتے اور آخر کار سلطنت عثمانیہ کے جائز وارث قرار دئے جاتے۔''(۲)

۱۸۲۰ء میں جب عثمانی فوجیں علی پاشا والی یانینا سے جنگ میں مصروف ہوئیں تو یونانیوں کا لب ولہجہ دفعۃً بدل گیا اور روسی ایجنٹوں کی سرگرمیاں بھی بہت بڑھ گئیں، فنلے کا بیان ہے کہ ''عیسائیوں نے جو روش اختیار کی وہ اکثر اوقات باغیانہ تھی،

(۱) فنلے جلد ۵ ص ۲۴۸ (۲) ایضاً ص ۲۶۷-۲۶۶

1984

روسی ایجنٹ ان کی پشت پناہی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے''، جن صوبوں میں یونانیوں کی تعداد زیادہ تھی وہاں عثمانی حکام کو بڑی دقتیں پیش آتی تھیں، روسیوں کے طرز عمل کی وجہ سے کسی پاشا کے لیے یونانیوں کی گستاخیوں کو روکنے کی غرض سے کوئی کارروائی کرنا بغیر اس کے کہ پہلے سے اس کے متعلق صریح احکام قسطنطنیہ سے حاصل کر لیے جائیں خطرہ سے خالی نہ تھا(۱)، ہتیریا کے ممبر زار روس الکزنڈر اول کا نام برابر استعمال کرتے تھے، جس کے متعلق یونانیوں کا یہ عام خیال تھا کہ وہ درپردہ اس انجمن کی مدد کر رہا ہے، تاہم چونکہ ہتیریا کی کارروائیاں بہت خفیہ ہوا کرتی تھیں اس لیے شروع میں باب عالی کو اس کا علم نہ ہوا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت عثمانیہ میں اس وقت تک جاسوسی کا نظام قایم نہیں ہوا تھا، چنانچہ جیسا کہ فنلے نے لکھا ہے ''نظام جاسوسی کی غیر موجودگی نے بہتیرے یونانیوں کی رائے میں سلطان کی حکومت کو وینس، آسٹریا اور خود روس کی حکومت کے مقابلہ میں قابل ترجیح بنا دیا تھا''، بہرحال ۱۸۲۰ء کے دوران میں یونانیوں کے طرز عمل میں جو غیر معمولی فرق نمایاں ہوا اسے ترک نظر انداز نہ کر سکے اور سلطان اور وزرائے سلطنت کو بار بار اس کی طرف متوجہ کیا گیا، روس کے ایجنٹ ایک طرف ہتیریا کی سازشوں کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف اس کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔

برأت: یونانیوں کی اس بدلی ہوئی روش کا ایک خاص سبب تھا، کچھ دنوں سے سلطنت عثمانیہ میں ایک دستور 'برأت' کا جاری ہو گیا تھا، جس کے رو سے سلطان کی رعایا کسی دوسری حکومت کی جس سے دولت علیہ کے دوستانہ تعلقات ہوں رعایا بن سکتی تھی، یونانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ رعایت حاصل کر کے مغربی حکومتوں کی رعایا بن گئی تھی، اس رعایت کی وجہ سے یہ لوگ اکثر سلطنت کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہتے لیکن سزا سے محفوظ رہتے، ان کو 'براتلی' کہتے تھے، یہ ترکی آبادی میں رہتے تھے اور

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۰۰

جہت سے بڑے بڑے محصولوں سے جن کو مسلمان بھی ادا کرتے تھے بری تھے، یہ لوگ تجارت کرتے لیکن نہ تو ان محصولوں کو ادا کرتے اور نہ ان قوانین کی پابندی کرتے جو تجارت سے متعلق سلطنت عثمانیہ میں رائج تھے، یہاں تک کہ عثمانی پولیس انھیں گرفتار بھی نہیں کرسکتی تھی، کیوں کہ جس حکومت کی رعایا وہ بن گئے تھے اس کا قنصل یا سفیر ان کی حمایت کرتا تھا، اسی طبقہ کے لوگ یونانی انقلاب کے سب سے زیادہ سرگرم کارکن تھے، اگر ان کی سازشیں کھل بھی جاتیں تو وہ اس حمایت کی وجہ سے سزا سے قطعی طور پر محفوظ رہتے۔(۱)

ہتیریا کے سردار اوائل ۱۸۲۰ء میں علم بغاوت بلند کرنے کی تیاریاں کر رہی رہے تھے کہ علی پاشا والی یانینا اور باب عالی میں جنگ چھڑ گئی اور بغاوت شروع کرنے کے لیے یہ موقع انھیں بہت مناسب ہاتھ آ گیا کیوں کہ بہترین عثمانی فوجیں اس وقت علی پاشا کے مقابلہ میں مصروف تھیں۔

علی پاشا: اس وقت تک باب عالی ہتیریا کی خفیہ کارروائیوں سے بے خبر تھا اور سلطان محمود سلطنت کے سرکش پاشاؤں کی سرکوبی کا تہیہ کر کے سب سے پہلے علی پاشا والی یانینا کو زیر کرنے کے لیے فوجیں روانہ کر رہا تھا، علی پاشا ۱۷۵۰ء میں البانیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں تپیلن (Tepelene) میں پیدا ہوا، جہاں اس کے اجداد کئی پشتوں سے سرداری کرتے آئے تھے، علی کے باپ نے ہمسایہ پہاڑی سرداروں سے لڑائی کرنے میں اپنے بیشتر موروثی مقبوضات کھو دئے تھے، بچپن ہی میں علی یتیم ہو گیا تھا مگر اس کی ماں نے خاندان کی سرداری کو قایم رکھا، ایک روز وہ ایک حریف قبیلہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئی تھی اور اس قبیلہ کے لوگوں نے اسے اور اس کی لڑکی کو ستایا تھا، اس نے علی کو جو ابھی بچہ ہی تھا قسم دی کہ بڑا ہو کر اس اہانت کا سخت انتقام لے، چنانچہ علی نے اس قسم کو پورا کیا اور اس قبیلہ سے نہایت ہولناک انتقام لیا، اپنی حیرت انگیز جرأت کی بنا پر وہ پندرہ سال کی

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۰۷

عمر میں ایک بڑی جماعت کا سردار بن گیا تھا، قرب و جوار کے علاقوں میں لوٹ مار کرنا اس کا مرغوب مشغلہ تھا، چند سال کے اندر اس نے اپنے خاندانی علاقوں کا بڑا حصہ دشمنوں سے واپس لے لیا اور البانیا میں اس کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت روز بروز پھیلتی گئی، ۱۷۸۸ء میں جب دولت علیہ اور آسٹریا میں جنگ ہوئی تو علی نے عثمانی فوج میں گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے صلہ میں وہ ٹریکالا (واقع تھسلی) کا پاشا بنا دیا گیا، اس کے بعد وہ اپیرس میں یانینا کا پاشا بن بیٹھا، وہ نہایت ذہین اور طباع تھا اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں بڑے سے بڑے فریب اور مظالم سے بھی باز نہ آتا، رفتہ رفتہ اس نے ہمسایہ پہاڑی علاقوں پر اپنا تسلط پوری طرح قایم کرلیا اور یانینا کو پایہ تخت بنا کر ایک خود مختار فرماں روا کی طرح حکومت کرنے لگا، دشمنوں کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ظالمانہ تھا لیکن اپنی رعایا کے ساتھ وہ عدل و انصاف کا برتاؤ کرتا اور جو شہر اور علاقے اس کے زیر حکومت تھے وہاں ہر طرف امن و خوشحالی نمایاں تھی (۱) وہ علوم و فنون کا بڑا سرپرست تھا، اس کی مملکت میں متعدد کالج، اسکول اور کتب خانے قایم تھے اور اس کے عہد حکومت میں یانینا یونانی قوم کا ادبی مرکز بن گیا تھا، چونکہ جنوبی البانیا کی ادبی زبان یونانی تھی اس لیے مسلمان اور عیسائی دونوں اسے پڑھتے تھے، مسلمان نظمیں اور نغمے، خطوط اور حساب کتاب یونانی زبان میں لکھتے تھے، جن کے بہت سے قلمی نسخے تیار کیے جاتے تھے لیکن مسلمانوں کی لکھی ہوئی نظموں اور نغموں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ (۲)

انقلابِ فرانس کے بعد علی پاشا نے نپولین اور یورپ کے دوسرے فرماں رواؤں سے مراسلت کا سلسلہ قایم کر رکھا تھا، جو اسے گو باضابطہ نہیں مگر عملاً ایک خود مختار حکمراں تسلیم کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ علی پاشا اپنی حکومت میں پورے البانیا، تھسلی، یونان اور جزائر آئیجین کو شامل کرنا چاہتا تھا، اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہوسکا لیکن ۱۸۱۹ء تک وہ اپنے

(۱) کریسی جلد ۲ ص ۴۰۳ (۲) فنلے جلد ۶ ص ۵۹

مقبوضات میں اضافہ کرتا چلا گیا، محمود کے لیے اس خودسر پاشا کی سرکشی عرصہ سے تشویش کا باعث تھی، اوائل ۱۸۲۰ء میں علی نے ایک ایسی حرکت کی جس سے محمود کو فوراً اس فتنہ کے استیصال کی جانب متوجہ ہونا پڑا، علی کا ایک دوست اسماعیل پاشو بے تھا، جس سے وہ کسی بات پر خفا ہو گیا اور آخر کار اس کی جان کا دشمن ہو گیا، اسماعیل پاشو بے یانینا سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلا آیا اور سلطان کے دربار میں ملازم ہو گیا، علی نے اپنے دو آدمیوں کو اسماعیل پاشو بے کو قتل کرنے کے لیے قسطنطنیہ بھیجا، چنانچہ ان لوگوں نے ایک روز دن کے وقت جامع ایا صوفیہ کے دروازہ پر اسماعیل پاشو بے پر حملہ کیا مگر وہ بچ گیا اور یہ دونوں گرفتار کر لیے گئے، انھوں نے صاف صاف بیان کیا کہ علی پاشا نے انھیں اس قاتلانہ مہم پر مامور کیا تھا، انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ علی پاشا نے اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ اپنی مہم میں کامیاب رہے تو دیوان کے معتمد ارکان انھیں سزا سے بچانے کے لیے تیار ملیں گے، یہ معلوم کر کے کہ علی پاشا رشوت کے ذریعہ سے دیوان میں بھی اس قدر اثر رکھتا ہے، محمود سخت برہم ہوا، حملہ آور تو فوراً قتل کر دیے گئے اور علی بغاوت کا مجرم قرار دیا گیا، اسے چالیس روز کی مہلت دی گئی کہ باب عالی میں حاضر ہو کر معذرت پیش کرے لیکن یہ مدت گذر گئی اور علی نہ آیا، اس کے بعد وہ قانون کی حمایت سے محروم کر دیا گیا اور محمود نے اعلان کرا دیا کہ جو شخص بھی اس کی سفارش کرے گا وہ فوراً قتل کر دیا جائے گا، اس نے اسماعیل پاشو بے کو یانینا کا پاشا مقرر کر کے علی پاشا کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔

علی پاشا، اسماعیل پاشو بے کا مقابلہ کامیابی سے کرتا رہا اور تقریباً دو سال تک قابو میں نہ آیا، آخر کار ۱۸۲۲ء کے شروع میں محمود نے مشہور عثمانی جنرل خورشید پاشا کو اس مہم پر روانہ کیا، خورشید پاشا کے پہنچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور چند ہی دنوں میں علی پاشا کو یانینا میں محصور ہو جانا پڑا، فروری ۱۸۲۲ء میں خورشید پاشا نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر سلطان کے پاس قسطنطنیہ بھیج دیا۔

علی پاشا کی بغاوت سے یونانیوں کو بڑی مدد ملی، باب عالی کی توجہ ہتیر یا کی

سازشوں کی طرف مبذول نہ ہونے پائی اور بغاوت یونان کے ابتدائی مہینوں میں عثمانی فوج کا بڑا حصہ اس کے بہترین جنرل خورشید پاشا کی سرکردگی میں یانینا کے محاصرہ میں مشغول رہا اور یہ فرصت یونانیوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔

مولڈیویا کی بغاوت: یونان کی انقلابی جماعت کو باب عالی اور علی پاشا کی جنگ بہت غنیمت معلوم ہوئی اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں مطلق کوتاہی نہیں کی، فروری ۱۸۲۱ء میں ہپسیلانٹی (Hypsilanti) نامی ایک یونانی امیر نے جس کا باپ یکے بعد دیگرے مولڈیویا اور ولاچیا کا حاکم رہ چکا تھا اور جو خود اس وقت ہتیریا کا سردار اور روسی فوج کا ایک ممتاز افسر تھا ایک دستہ کے ساتھ مولڈیویا میں داخل ہوکر علم بغاوت بلند کردیا اور تمام یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی، یونانیوں کو روس سے بہت کچھ توقعات تھیں، زار الکزنڈر کا وزیر خارجہ کاونٹ کاپوڈی آسٹریا (Capodi Istria) نسلاً یونانی اور ہتیریا کا ایک رکن تھا، ہپسیلانٹی کاونٹ مذکور کا ایڈی کانگ تھا، اس بناپر عام خیال یہ تھا کہ ہپسیلانٹی کی پشت پر روس کی طاقت بھی ہے، چنانچہ اس نے مولڈیویا میں داخل ہونے کے بعد وہاں کے باشندوں کے نام بغاوت کا جو دعوت نامہ شایع کیا اس میں یہ اعلان بھی کیا تھا کہ یہ تحریک 'ایک بڑی طاقت' کی تائید اور حمایت سے شروع کی گئی ہے، چوں کہ روسی فوجیں مولڈیویا میں آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی تھیں، اس لیے وہی صوبہ بغاوت کی ابتدا کے لیے منتخب کیا گیا مگر یہ انتخاب غلط ثابت ہوا مولڈیویا کے باشندے یونانیوں کے مظالم سے تنگ آکر ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور انھوں نے باغیوں کی مدد میں مطلق سرگرمی نہیں دکھائی، ایلیسن فلپس لکھتا ہے:

> "رومانی کسانوں کو فناری یونانیوں کی جماعت رہائی دلانے والوں کے لباس میں محض مضحکہ خیز اور ایک دامِ فریب معلوم ہوئی، اس وقت تک وہ یونانیوں کو صرف اپنے ہوسپودار (۱) اور اس

(۱) مولڈیویا اور ولاچیا کے والی جن کو تقریباً شاہانہ اختیارات حاصل تھے 'ہوسپودار' کہے جاتے تھے

کے ماتحت افسروں کے ذریعہ سے جانتے تھے، جو ظلم و تشدد کے ساتھ ان سے محصول وصول کرتے اور جن کی حکومت میں ان کی حالت ان کسانوں سے زیادہ مصیبت کی تھی جو براہ راست سلطان کے زیر حکومت تھے، روس کے نام سے بھی ان کے دلوں میں شکریہ کا جذبہ نہیں پیدا ہوا کیوں کہ ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۲ء تک جب مولڈ یویا اور ولاچیا کی ریاستیں روس کے قبضہ میں رہیں، وہاں کے باشندے حملہ آوروں کے استحصال بالجبر سے مصیبت کی آخری حد تک پہنچ گئے تھے اور اپنے مکانوں اور کھیتوں کو زار کی ظالمانہ پالیسی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ چکے تھے۔''(۱)

بغاوت کا آغاز گلاٹز (Galatz) یاسی اور بعض دوسرے مقامات پر ترکوں کے قتلِ عام سے کیا گیا، ہر طبقہ کے ترک، تاجر، سپاہی، جہاز راں سب دفعۃً گرفتار کر کے نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دئے گئے، گلاٹز کے مقامی باشندوں نے ان کارروائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا، یہ کام صرف ہتیر یا کے ممبروں نے انجام دیا، یاسی (پایہ تخت مولڈ یویا) میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد صرف پچاس تھی جو ہوسپودار کے دربار میں بطور گارڈ آف آنر کے مقیم تھے، جان اور مال کی حفاظت کے وعدہ پر پہلے ان سے ہتھیار رکھ دینے کو کہا گیا، جب انھوں نے ہتھیار رکھ دئے تو سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، انہی کے ساتھ تمام مسلمان تاجر بھی جو یاسی میں مقیم تھے قتل کر دئے گئے، پِسیلانٹی ان کے قتل کے وقت خود موجود تھا، اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یونانیوں نے موقع پایا مسلمانوں کے قتل و غارت گری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔(۲)

انتقام: گلاٹز اور یاسی کے قتلِ عام کی خبر بہت کچھ مبالغہ کے ساتھ تیزی سے ہر طرف

---

(۱) ایلیسن فلپس ص ۳۱ (۲) فنلے جلد ۶ ص ۱۲۰

پھیل گئی اور مسلمانوں نے مدافعت کے لیے ہتھیار سنبھال لیے، فنلے لکھتا ہے:

"یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس نازک موقع پر عثمانی تسلط کو سب سے زیادہ موثر مدد یونانیوں کی سفاکی سے پہنچی نہ کہ سلطان محمود کی سرگرمی سے، اہل ہتیریا کے مظالم نے ابتدا ہی سے انقلاب کے جنگ استیصال ہونے کا اعلان کر دیا تھا، مسلمانوں نے خون آشام مسرت کے ساتھ اپنے دشمنوں کا یہ فیصلہ قبول کر لیا کیوں کہ ان کے نزدیک اس چیز نے ان کے مقصد کو انصاف اور خدا کے منشا کے مطابق بنا دیا، انھوں نے اپنے بھائیوں کے خون کا انتقام لینے اور اپنی قوم اور اپنے مذہب کو خونخوار حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ہتھیار سنبھال لیے۔"(۱)

قسطنطنیہ میں جب ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو مسلمانوں کو دفعۃً معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے ان کے خلاف ایک زبردست سازش کا جال پھیلا رکھا ہے، انتقام کے جوش میں انھوں نے قسطنطنیہ کے سیکڑوں یونانیوں کو قتل کر ڈالا، سمرنا اور بعض دوسرے شہروں میں بھی بہت سے یونانی قتل کر دیے گئے۔

ہتیریا سے بطریق اور زار کی مخالفت: ہپسیلانٹی نے بغاوت کا علم مذہب کے نام پر بلند کیا تھا اور زار روس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی بھی پوری کوشش کی تھی لیکن گلاٹز اور یاسی کا قتل عام خود اس کی تحریک کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوا، بطریق قسطنطنیہ نے ہتیریا کے خلاف کفر کا فتویٰ شایع کیا اور ہپسیلانٹی اور اس کے ساتھیوں پر لعنت بھیجی، چنانچہ اب ہپسیلانٹی کی مہم کوئی مذہبی مہم نہ رہ گئی، اہل رومانیا (مولڈیویا اور ولاچیا) نے بھی ہپسیلانٹی کی اسکیم کے خلاف جسے وہ یونانیوں کے حب جاہ کا نتیجہ قرار دیتے تھے، اب اپنی شدید نفرت کا اظہار شروع کیا، اس کے خدم و حشم کی بدکرداریوں اور اس کی فوجوں میں

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۲۱

نظم وضبط کے فقدان نے اہل ولاچیا کو متنفر کر دیا تھا، اسی درمیان میں یہ خبر پہونچی کہ روس نے ہتیریا سے اپنی کامل بے تعلقی کا اعلان کر دیا ہے اور زار الکزنڈر نے پسیلانٹی کی روش پر صاف لفظوں میں نفریں کی ہے، اتحاد مقدس کے ارکان (روس، آسٹریا، پرشا) نے لیباخ (Laybach) کی مجلس سے اپنا یہ فیصلہ شایع کیا کہ وہ ہر قسم کی انقلابی تحریکوں کے مخالف ہیں اور الکزنڈر نے اس کے ثبوت میں سلطان کے ساتھ صلح قایم رکھنے کا اعلان کیا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ عثمانی فوجیں ولاچیا اور مولڈیویا میں داخل ہو کر ان شورشوں کو رفع کر دیں جو پسیلانٹی کے 'مجنونانہ منصوبہ' سے پیدا ہوگئی تھیں، اس کے ساتھ ہی اس نے پسیلانٹی کو روس کی ملازمت سے برخاست کر دیا اور اسے حکم دیا کہ فوراً ہتھیار رکھ دے (۱) لیکن پسیلانٹی اپنی روش پر قایم رہا اور بقول فلپس جھوٹ پر جھوٹ گڑھتا رہا اس نے اپنے فوجی سرداروں سے بیان کیا کہ الکزنڈر نے انقلاب کی مذمت علانیہ اس وجہ سے کی ہے تاکہ یورپ میں امن وامان قایم رہے، حالاں کہ نجی طور پر اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہوں اور اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ (۲)

بغاوت مولڈیویا کا استیصال: بہر حال زار کے اعلان سے مولڈیویا میں باغیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور عثمانی فوج نے بخارسٹ (پایہ تخت ولاچیا) پر قبضہ کر لیا، ۱۹/ جون ۱۸۲۱ء کو ترکوں نے ڈراگشان کے مقام پر پسیلانٹی کے ساتھیوں کو زبردست شکست دے کر بغاوت مولڈیویا کا خاتمہ کر دیا، پسیلانٹی بھاگ کر ہنگری پہنچا اور وہاں ۱۸۲۷ء تک وہ مٹرنخ وزیر اعظم سلطنت آسٹریا کے حکم سے قید رہا، دوسرے سال وہ مر گیا، دراگشان کی جنگ کے چار روز بعد ترکوں نے مولڈیویا کے صدر مقام یاسی پر بھی قبضہ کر لیا۔

موریا میں ترکوں کا قتل عام: لیکن مولڈیویا کی بغاوت کے فرو ہونے سے پہلے اس

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۲۶ (۲) ایلیسن فلپس ص ۳۸

کے شعلے موریا اور جزائر یونان میں بھڑک چکے تھے، موریا کے یونانی ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کر کے اٹھے تھے، وہ اپنے انقلابی گیت میں اس عزم کا اعلان یوں کرتے پھرتے تھے: ''ترک اب زندہ نہ رہنے پائیں گے، نہ موریا میں نہ دنیا کے کسی حصہ میں''، میریٹ لکھتا ہے کہ موریا میں تو یہ دھمکی تقریباً حرف بحرف پوری ہوئی، اپریل ۱۸۲۱ء میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور پچیس ہزار ترک تہ تیغ کر دیے گئے، صرف وہی بچ رہے جو بھاگ کر قلعہ بند شہروں میں پہونچ سکے، ایک ماہ کے اندر موریا میں عثمانی تسلط کا خاتمہ ہو گیا(۱)، عیسائی مورخین بھی اقرار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا استیصال پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم کا نتیجہ تھا، اس قتل عام کا باعث عوام کے انتقامی جذبات یا کلیفٹ (پہاڑی ڈاکوؤں) کی طبعی خونخواری سے زیادہ ارکان ہتیریا اور یونان کے اہل قلم اور خطیبوں کی کوششیں تھیں، جنھوں نے اپنا تمام زور قلم اور ساری خطابت ہر یونانی کے سینہ کو انتقام کے شدید ترین جذبات سے پر کرنے میں صرف کر دی تھی، ان کا قول تھا کہ 'انقلاب کو خون کا بپتسما دے کر' صلح کو ناممکن بنا دینا چاہیے۔(۲)

تین مہینے کے اندر ان قلعوں کے فوجی دستے بھی ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے جن میں اس قتل عام سے بچے بچائے لوگوں نے بھاگ کر پناہ لی تھی، ایور سلے کا بیان ہے کہ اکثر صورتوں میں ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ محصورین کی جانیں محفوظ رہیں گی لیکن اس کی پابندی کسی صورت میں بھی نہیں کی گئی، فوجی دستے، ترکی باشندے، اور وہ لوگ جو مفصلات سے بھاگ کر وہاں جمع ہوئے تھے، سب کے سب سفاکانہ طور پر قتل کر دیے گئے۔''(۳)

باب عالی کی طرف سے جوابی کارروائی: شروع میں ان واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہونچی تو سلطان نے صدر اعظم کو حکم دیا کہ سرکاری عہدہ داروں میں سے چند برآوردہ یونانیوں کو منتخب کر کے ان سے ان کے ہم وطنوں کے افعال کی ضمانت لے لی

(۱) میریٹ ص ۲۰۵ (۲) فنلے جلد ۲ ص ۱۵۲ (۳) لارڈ ایورسلے ص ۲۶۱

جائے، اس سے مقصود یہ تھا کہ باغیوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ جائے مگر موریا کے یونانیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ ان یونانی عہدہ داروں کے محلکے ضبط کر لیے گئے اور انھیں مسلمان مقتولین کے انتقام میں پھانسی دے دی گئی، ۱۶/اپریل ۱۸۲۱ء کو ترجمان باب عالی موروزی (Murusi) جو ایک ممتاز یونانی تھا اپنے سرکاری لباس میں قتل کیا گیا اور آیندہ ہفتہ میں متعدد نامور یونانیوں کو پھانسی دی گئی۔

گریگوریوس کی پھانسی: ۲۲/اپریل ۱۸۲۱ء ''ایسٹر سنڈے'' کے روز یونانی کلیسا کے بطریق اعظم گریگوریوس کو ارکان ہتیریا کی باغیانہ اسکیم میں شریک ہونے کے جرم میں سلطان کے حکم سے پھانسی کی سزا دی گئی، پھانسی سے پہلے وہ باضابطہ طور پر اپنے عہدہ سے معزول کیا گیا اور کلیسا کی مجلس نے ایک دوسرے بطریق کو اس کی جگہ منتخب کرلیا، اس واقعہ سے قسطنطنیہ سے لے کر سینٹ پیٹرس برگ تک دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

گریگوریوس کی لاش تین روز تک دار پر لٹکتی رہی، اس کے بعد وہ یہودیوں کے سپرد کر دی گئی، جو اسے قسطنطنیہ کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور سمندر میں پھینک آئے، بعض یونانیوں نے رات کے وقت اسے پانی سے نکال کر ایک جہاز پر اوڈیسا پہنچا دیا، وہاں یہ مشہور کیا گیا کہ سمندر نے معجزہ کے طور پر اس شہید کی لاش کو اوپر ڈال دیا تھا اور روس کے ایک تجارتی جہاز نے جو ادھر سے گذر رہا تھا اسے اٹھالیا، بہرحال روسیوں نے پورے مذہبی رسوم اور فوجی شان کے ساتھ لاش کو دفن کیا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: مسیحی دنیا نے یہ سمجھا کہ گریگوریوس کی لاش کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا حکم یہودیوں کو اس لیے دیا گیا تھا کہ عیسائی مذہب کی مزید تذلیل کی جائے، حالاں کہ یہ خیال غلط تھا، بقول فنلے یہ کارروائی اس وقت عثمانیوں کے قانونِ فوجداری کا ایک جز تھی اور اس کا نفاذ مسلمان اور عیسائی دونوں پر یکساں ہوتا تھا، گریگوریوس کے پھانسی دیے جانے کے ایک سال بعد ٹھیک یہی برتاؤ ینی چری کے ایک سردار حسن بیرقدار کی لاش کے ساتھ بھی کیا گیا، جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کی ایک جماعت

لے کر بہت سے عیسائی خاندانوں کو لوٹا مارا تھا، سلطان کے حکم سے سپاہیوں کا ایک دستہ عیسائیوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، حسن اسی دستہ کا مقابلہ کرتے ہوئے ۲۲/جون ۱۸۲۲ء کو گولی سے مارا گیا اور اس کی لاش بھی یہودیوں کو دے دی گئی جو اسے قسطنطنیہ کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور سمندر میں ڈال دیا۔(۱)

یونانیوں کا قتل: مذکورہ بالا اشخاص کے علاوہ جن کو سلطان کے حکم سے موت کی سزا دی گئی، قسطنطنیہ میں سیکڑوں یونانی عام مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس وقت ترکوں کے بعض بااثر طبقوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ مذہبی تعصب کو برانگیختہ کر کے قسطنطنیہ کے مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف مشتعل کر دیں، بعض علما اور ینی چری کو یہ شبہ تھا کہ محمود ان کے مراعاتِ خصوصی میں تخفیف کرنی چاہتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی، وہ علانیہ تمام مسلمانوں کو مقتولین موریا کے انتقام کی دعوت دیتے تھے، ان کے پیدا کردہ ہنگاموں سے قسطنطنیہ میں تقریباً تین ہفتے طوائف الملوکی برپا رہی، اراذل و انفار عیسائیوں کے محلوں میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، ایک روز وہ بطریق کے مکان میں گھس گئے، راہب جان لے کر چھتوں کے راستہ سے بھاگے اور پڑوس کے ترکوں کے مکانات میں پناہ لی، فنلے لکھتا ہے:

"مسلمانوں کی شرافت کا یہ واقعہ ضرور قلمبند کرنے کے قابل ہے کہ انھوں نے عیسائی پادریوں کو اپنے ہاں پوشیدہ رکھ کر عوام کے غیظ وغضب سے بچا لیا" (۲) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونانیوں کی بغاوت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی بغاوت برپا ہوا چاہتی ہے، مسلمانوں کی بغاوت کو روکنے اور ینی چری کو قابو میں رکھنے کی غرض سے محمود نے اس فوج کے تین سرداروں کو دیوان میں مستقل جگہوں پر مقرر کر دیا۔

سمرنا کا حال قسطنطنیہ سے بھی زیادہ خراب تھا، ایشیائے کوچک کے متعدد گروہ جو مولڈیویا کے باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تھے، شمال کی طرف

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۸۸ (۲) ایضاً ص ۱۸۹

کوچ کرنے کی بجائے سمرنا میں داخل ہو گئے، جہاں عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی اور جہاں بغیر لڑے بھڑے انھیں بہت کچھ مالِ غنیمت اور غلاموں کے حاصل ہونے کی امید تھی، چنانچہ شہر اور قرب وجوار کے دیہاتوں میں کئی روز تک قتل و غارت گری جاری رہی، اونچے طبقہ کے ترکوں نے عیسائیوں کے بچانے کی کوشش کی، اس کی سزا میں عام مسلمانوں نے خود ملاے سمرنا اور متعدد اعیان کو قتل کر دیا۔

یونانی سفاکیاں: مسلمانوں کا جوشِ انتقام یونانی سفاکیوں کا قدرتی نتیجہ تھا، دورانِ بغاوت میں یونانیوں نے وحشت و بربریت کی ایسی ہولناک مثالیں پیش کیں کہ ان کے اعتراف سے عیسائیوں کا قلم بھی گریز نہ کر سکا، شروع ہی میں یونانیوں نے ایک ترکی جہاز کو گرفتار کر لیا تھا جس پر سابق شیخ الاسلام اپنے تمام خاندان کے ساتھ حج کے لیے جا رہے تھے، قسطنطنیہ میں جب یونانیوں کے خلاف شورش برپا ہوئی تو موصوف نے ایک فرمان شایع کر کے مسلمانوں کو پرامن رہنے کی نصیحت کی تھی اور یونانیوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے روکا تھا، ان کے اس رویہ سے مسلمان خود ان کے مخالف ہو گئے اور سلطان محمود کو اس مخالفت کی شدت سے مجبور ہو کر انھیں شیخ الاسلام کے منصب سے معزول کر دینا پڑا تھا، اس کے بعد وہ سفر حج کے لیے روانہ ہو گئے، لیکن ابھی جزائر اتجین تک پہنچے تھے کہ یونانیوں نے ان کے جہاز کو گرفتار کر لیا، انھوں نے سب سے پہلے شیخ الاسلام کی نظر کے سامنے ان کی لڑکیوں اور خاندان والوں کو ذبح کر کے سمندر میں پھینک دیا، اس کے بعد دوسرے ترک خاندان جو اس جہاز پر تھے قتل کیے گئے، آخر میں خود شیخ الاسلام کو سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کیا، بقول مصطفیٰ کامل پاشا یہ جزا تھی اس نصیحت کی جو شیخ الاسلام موصوف نے مسلمانوں کو پرامن رہنے اور یونانیوں کے ساتھ زیادتی نہ کرنے کی کی تھی، فنلے لکھتا ہے: ''معذور و مجبور بوڑھے مرد، اونچے طبقہ کی عورتیں خوبصورت لونڈی غلام اور کم سن بچے جہاز کے عرشہ پر گائے بیل کی طرح ذبح کر دیے گئے، اس ظالمانہ کارروائی کو ہلکا کرنے کی کوشش بعد کو یہ کہہ کر کی گئی کہ یہ ایک انتقامی فعل

تھا، یہ بیان غلط ہے جو لوگ ان مظالم کے مرتکب ہوئے، انھوں نے شیخ الاسلام کے قتل سے پہلے اپنے بطریق کی پھانسی کا حال نہیں سنا تھا، اصل یہ ہے کہ شروع ہی سے سمندر اور خشکی دونوں جگہ لڑائی کا مقصد ترکوں کو نیست و نابود کر دینا تھا۔(۱)

انگریزی جنرل گارڈن (Gordon) یونانیوں کا پر جوش حامی، جو دورانِ بغاوت یونانیوں کے ساتھ ترکوں سے لڑا ہے، اپنی ''تاریخ انقلاب یونان'' میں لکھتا ہے:

''یونانیوں نے جو بھی قومی یا شخصی مظالم برداشت کیے ہوں ان کے انتقام کی درندگی کو حق بجانب ثابت کرنا ناممکن ہے۔''(۲)

یونانیوں اور ترکوں کا پہلا باقاعدہ مقابلہ موریا کے پایہ تخت ٹریپولٹزا کے قریب والٹی کے مقام پر ہوا جس میں ترکوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد باغیوں نے نوارینو اور ٹریپولٹزا کا محاصرہ کر لیا، ۱۹/اگست ۱۸۲۱ء کو نوارینو کا فوجی دستہ فاقہ کشی سے عاجز آکر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا، ہتھیار اس شرط پر ڈالے گئے تھے کہ قلعہ کا تمام سامان، زرو جواہر اور سونے چاندی کے برتن یونانیوں کے حوالہ کر دئے جائیں گے اور اس کے معاوضہ میں ترکوں کو مصر یا تونس روانہ کر دیا جائے گا، اس معاہدہ کے مطابق جب ترکوں نے تمام سامان دے دیا تو یونانیوں نے نقضِ عہد کر کے ان کا قتل عام شروع کیا اور ایک گھنٹہ کے اندر تمام مرد، عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالا، فرانٹزس (Phrantzes) نامی ایک یونانی پادری جس نے انقلاب یونان کی ایک مستند تاریخ لکھی ہے، اس موقع پر موجود تھا، اس نے نوارینو کے چشم دید حالات بیان کیے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ عورتیں بندوق کی گولیوں اور تیغوں کے زخم سے مجروح ہو کر سمندر کی طرف بھاگتی تھیں اور انھیں عمداً گولیوں سے مارا جاتا تھا، مائیں شیر خوار بچوں کو سینوں سے لگائے ہوئے اپنی برہنگی کو چھپانے کی غرض سے (ظالموں نے ان کے کپڑے بھی چھین لیے تھے) سمندر میں کود پڑتی تھیں لیکن جب وہ پانی میں چھپنے کی کوشش کرتیں تو یہ سنگ دل رئفل بردار انھیں

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۱۷۴ (۲) ایضاً ۱۹۳

گولیوں کا نشانہ بناتے، شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں سے چھین کر چٹانوں سے ٹکراتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، تین چار سال کے بچے زندہ سمندر میں پھینک دیے جاتے تھے۔(۱)

ٹریپولٹزا کا محاصرہ چھ مہینے تک جاری رہا، پانی ختم ہو جانے سے بالآخر وہاں بھی ترکوں کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، یونانی توپ خانہ کا ایک نوجوان فرانسیسی افسر کرنل ریبا دیونانی فوجوں کے شہر میں داخل ہونے کے وقت وہاں موجود تھا، اس نے صاف گوئی کے ساتھ یونانی سپاہیوں کے وحشیانہ مظالم بیان کیے ہیں جو تین روز تک خود اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے رہے، وہ لکھتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے پہلے عموماً شدید جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی، اڑتالیس گھنٹے کے بعد یونانیوں نے (قتل عام سے بچے ہوئے) مرد، عورت، بوڑھے بچے خصوصاً عورتوں اور بچوں کو جمع کیا اور پہاڑ کی ایک گھاٹی میں لے جا کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا۔(۲)

اس واقعہ کے دو سال بعد خود فنلے کا گذر اس مقام سے ہوا، وہ بیان کرتا ہے کہ میں نے بغیر دفن کی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر دیکھے، جو موسم سرما کی بارش اور گرمیوں کی دھوپ سے سفید ہو گئی تھیں، بہت سی ہڈیوں کے ناپ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بچوں کی ہڈیاں ہیں۔(۳)

ایلیسن فلپس اہل یونان کی غداریوں اور سفاکیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ اس بغاوت کی امتیازی صفت غداری اور غیر محدود سفاکی تھی، ایک وحشی قوم کی زیادتیوں کا لحاظ کرنا جس کے صدیوں کے دبے ہوئے شدید بغض وعناد کو بالآخر نکلنے کا موقع ملا تھا، شاید روا ہو سکتا ہے لیکن کوئی شے اس بے دردانہ غداری کا عذر

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۲۱۵ (۲) ایضاً ص ۲۱۹ (۳) ایضاً ص ۲۱۹ فٹ نوٹ

برأت نہیں ہوسکتی، جو تقریباً ہر موقع پر قتل وخون سے پہلے برتی جاتی تھی اور چوں کہ یورپ نے ترکوں کے ظالمانہ انتقامات پر بڑی لعنت ملامت کی ہے، اس لیے تاریخ کے اصول انصاف کے رو سے ہمارے لیے ان جرائم کا چھپانا جائز نہیں جو ان انتقامات کے محرک ہوئے۔''(۱)

باغیوں کے ساتھ مغرب کی ہمدردی: ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۴ء تک بغاوت کی شورش مسلسل قایم رہی، اس درمیان میں نہ صرف موریا بلکہ خلیج کورنتھ کے شمال میں تھسلی کی سرحد تک تمام یونانی علاقے جن میں ایتھنز بھی شامل تھا عملاً خودمختار ہوگئے اور ایک قومی حکومت قایم کر لی گئی، یورپ نے اہل یونان کے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کی، یونان کے علوم قدیمہ اور دین مسیحی کے نام پر ایک زبردست تحریک تمام یورپ میں پھیل گئی، جس کے خاص علمبردار انگلستان اور فرانس کے مشہور شاعر لارڈ بائرن (Byron) اور وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) تھے۔

ان ممالک میں یونان کی مدد کے لیے متعدد انجمنیں قایم ہوئیں اور بہت سے والنٹیر وہاں روانہ ہوگئے، بائرن خود جنوری ۱۸۲۴ء میں یونان آ کر باغیوں کی فوج میں شامل ہوا لیکن تین ہی مہینے کے بعد اپریل میں وہ ملیریا کا شکار ہوگیا، تاہم اس قلیل مدت میں اس پر یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ یونانی سردار نفاق، سازش اور خودغرضی میں مبتلا ہیں اور جس بلند تخیل کو سامنے رکھ کر یہ جنگ شروع کی گئی ہے، اس کی حقیقت شراب سے زیادہ نہیں، ایسا ہی تجربہ دوسرے یونان پرستوں کو بھی ہوا، چنانچہ فرانسیسی والنٹیر وں کی ایک جماعت نے یونان پہنچ کر جو حالات بچشم خود مشاہدہ کیے ان سے متاثر ہوکر اس نے فرانسیسی امیر البحر سے درخواست کی کہ اسے فرانس واپس بھیج دیا جائے، مشہور فرانسیسی مصنف الفرید لمیتر نے اس درخواست کو اپنی کتاب میں جو استقلال یونان پر اس نے لکھی ہے نقل کیا ہے، ہم مصطفےٰ کامل پاشا کے حوالہ سے اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ذیل میں

(۱) یونان کی جنگ آزادی ص ۵۷

درج کرتے ہیں۔

"ہمارے فرانس سے روانہ ہونے سے پہلے لوگ یونانیوں کی شجاعت اور بہادری کی تعریف کرتے تھے کہ وہ دلیری اور عظمت میں اپنے اسلاف سے بڑھ کر ہیں لیکن ہم نے یہاں ایسے لوگوں کو پایا جو حب مال میں جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو جہالت اور وحشت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔"(۱)

کمانڈر بوجول بغاوتِ یونان کے ذکر میں ۲۲/دسمبر ۱۸۲۷ء کو لکھتا ہے:

"میں مشرق میں آیا اور میں یونانیوں کا بہت بڑا مددگار تھا اور تجربہ سے پہلے ان کے متعلق میرے حسن ظن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ وہ وطنیت، شجاعت اور اتحاد سے بالکل خالی ہیں، ان کے ہر رئیس کی خواہش یہ ہے کہ دولت مند ہو جائے، طوائف الملوکی بلاد یونان میں انتہا کو پہنچ گئی ہے اور بیشتر حکام جو ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں مسلح بحری ڈاکوؤں کی حیثیت سے مشہور ہیں، اگر دول (عظمیٰ) مداخلت نہ کرتیں تو یونانی اس سال سپر ڈال دیتے، یوروپین اقوام کے منونِ کرم ہو کر بھی یونانی ڈاکو خود انہی قوموں کی تجارت پر حملے کرتے تھے۔(۲)

برطانیہ کی معاندانہ روش: ان حالات کے باوجود مسیحی یورپ سے باغیوں کو برابر مدد پہنچتی رہی، دولت عثمانیہ کے ساتھ انگلستان کے تعلقات دوستانہ تھے، لیکن انگلستان نے بھی یونانیوں کی مدد اس طرح علانیہ شروع کی کہ بالآخر اوائل ۱۸۲۴ء میں دونوں حکومتوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، سلطان کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ لندن کے لارڈ میئر (Lord Meyor) نے یونانیوں کی مدد کے لیے ایک بڑی رقم روانہ کی ہے اور لارڈ

---

(۱) المسألۃ الشرقیہ از مصطفیٰ کمال پاشا، حصہ اول ص ۸۰ (۲) ایضاً ص ۸۱-۸۰

بائرن اور کرنل اسٹین ہوپ (لارڈ ہیرنگٹن) (Cornal Stanhope, Earl of Harrington) جو انگلستان کی شاہی فوج کا افسر تھا، کھلم کھلا یونانی فوج میں شامل ہو گئے ہیں، جزائر آیونین کے برطانوی افسروں نے باغی ارماٹولی کو پناہ دی ہے اور انگریز ساہوکاروں نے باغیوں کے لیے روپیہ بھیجا ہے، سلطان نے ان باتوں کو حکومت برطانیہ کے معاندانہ ارادوں کی طرف منسوب کیا، چنانچہ ۹/اپریل ۱۸۲۴ء کو برطانوی سفیر لارڈ اسٹینگفورڈ (Stingford) سے اس طرز عمل کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا، رئیس آفندی (عثمانی وزیر خارجہ) نے سفیر مذکور سے کہا کہ یہ بات خلاف عقل ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ کسی شکل کی ہو اتنی طاقت نہیں رکھتی کہ اپنی رعایا کو ان کی من مانی لڑائیوں سے باز رکھ سکے یا غیر حکومتوں کے ساتھ جو معاہدے ہو چکے ہیں انھیں توڑنے پر ان کو سزا دے سکے، اگر ایسا ہی ہے تو پھر یورپ کا امن جسے قایم رکھنے کے لیے حکومت برطانیہ اس قدر فکرمندی ظاہر کر رہی ہے، غیر سرکاری افراد کی خواہشات پر منحصر ہو کر رہ جائے گا، کیوں کہ اس وقت ایک مملکت دوسری مملکت سے یہ کہہ سکے گی کہ ''میں آپ کی مخلص اور وفادار دوست ہوں لیکن میری استدعا ہے کہ آپ بس اسی سے مطمئن رہیں اور ناراض نہ ہوں، اگر میری رعایا میں سے کچھ لوگ آپ کی رعایا پر چڑھ دوڑیں اور ان کے گلے کاٹ ڈالیں'' فنلے لکھتا ہے کہ ''اس بے لاگ اور منصفانہ احتجاج میں آخر میں قطعی طور پر یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ برطانوی رعایا کو ترکی کے خلاف جنگ کرنے اور یونانیوں کی اسلحہ، روپیہ اور گولے بارود سے مدد کرنے سے روکا جائے''(۱) لیکن بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد حکومت برطانیہ نے اس نقاب کو بھی اٹھا دیا اور یونانیوں کی حمایت میں علانیہ طور پر میدان میں آ گئی۔

مصر کی مدد: چار سال کی کوششوں کے باوجود جب بغاوت کا استیصال نہ ہو سکا بلکہ باغیوں کی قوت روز بروز بڑھتی ہی گئی تو ۱۹۲۴ء میں سلطان نے محمد علی پاشا والی مصر کو مدد

(۱) فنلے جلد ۷ ص ۸

کے لیے طلب کیا اور اس خدمت کے معاوضہ میں محمد علی کی خواہش پر شام، دمشق اور کریٹ کے علاقوں کو مصر کی پاشائی میں شامل کر دینے کا وعدہ کیا، چنانچہ مصری بیڑہ جس پر دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سوار فوج تھی محمد علی پاشا کے لڑکے ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں ۲۵ر جولائی ۱۸۲۴ء کو اسکندریہ سے روانہ ہوا اور یونان پہنچ کر موڈن میں لنگر انداز ہوا، مصری فوج کے ایک حصہ نے وہاں سے کوچ کر کے نوارینو کا محاصرہ کر لیا، یونانیوں کی بہترین فوج جو سات ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی اس اہم قلعہ کو بچانے کے لیے بڑھی مگر ابراہیم پاشا کے سپاہیوں نے جن کی تعداد اس معرکہ میں صرف تین ہزار تھی حملہ کر کے انھیں بری طرح شکست دی، یونانی نہایت انتشار کی حالت میں بھاگ کھڑے ہوئے، ایورسلے لکھتا ہے کہ ''یہ جنگ اس بات کا ثبوت تھی کہ بہترین یونانی فوجیں بھی کسی لڑائی میں اور تربیت یافتہ مصریوں کا جم کر مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں''(۱) ۲۷ر رمضان ۱۲۴۰ھ (۱۶ر مئی ۱۸۲۵ء) کو ابراہیم فاتحانہ شان سے نوارینو میں داخل ہوا۔

قلعہ کا فوجی دستہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو چکا تھا مگر یونانیوں کو یاد تھا کہ جب ترکوں نے نوارینو میں ہتھیار ڈالے تھے تو ان کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کیوں کر کی گئی تھی، اسی سلوک کی توقع وہ اپنے لیے بھی کرتے تھے، غداری اور معاہدہ شکنی جن لوگوں کا قومی شعار تھا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انتقام کے موقع پر بھی کوئی فاتح عفوو درگذر کی مثال پیش کر سکتا ہے اور مفتوحین کی جان کی حفاظت خود اپنے سپاہیوں کے ذریعہ کرا سکتا ہے لیکن ابراہیم نے یہ کر دکھایا، معاہدہ کے مطابق اس نے پورے دستہ کو فرانسیسی اور آسٹروی جہازوں پر کارتو وار وانہ کر دیا، مسلمانوں کا ایک گروہ جنھیں نوارینو کے قتل عام کی یاد اب تک بے چین کیے ہوئے تھی انتقام کی فکر میں اکٹھا ہو گیا تھا مگر ابراہیم نے اس کی پیش بینی کر کے عیسائیوں کی حفاظت کی تدبیر پہلے سے کر دی تھی، سوار فوج کے ایک دستہ نے ترکوں کو قریب آنے سے روکے رکھا اور نہتے یونانی عرب پیدل فوج

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۲۶۴

کی سنگینوں کے سایہ میں جہازوں تک پہنچا دیے گئے۔(۱)

موریا کی تسخیر: نوارینوں کی فتح کے بعد ابراہیم پاشا نے یکے بعد دیگرے موریا کے تمام اہم شہروں اور قلعوں پر قبضہ کرلیا، ۲۲؍اپریل ۱۸۲۶ء کو مغربی یونان کا سب سے اہم قلعہ مسولونگی فتح ہوگیا اور جون ۱۸۲۷ء میں لارڈ کوشرین (Cochrane) جنرل چرچ (Church) اور دوسرے انگریز افسروں کی پوری مدد کے باوجود ایتھنز کو بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے اور کورنتھ پر بھی ترکوں کا قبضہ ہوگیا، اب سارے موریا میں عثمانی تسلط قایم تھا، یونان کی قومی حکومت کو جو دورانِ بغاوت میں قایم کرلی گئی تھی جزیرہ پوروس (Poros) میں منتقل ہوجانا پڑا، بحری جنگ میں بھی یونانیوں کو شکست ہوئی، ان شکستوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یونانی سرداروں میں خود آپس ہی میں نفاق پیدا ہوگیا، جس نے ان کی رہی سہی قوت کو بالکل توڑ دیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر دولِ عظمیٰ اس موقع پر مداخلت نہ کرتیں اور یونانیوں کی حمایت میں دولت علیہ سے خود ہی برسر پیکار نہ ہوجاتی تو بغاوت کا استیصال مکمل طور پر ہوجاتا اور یونان میں پھر ترکی حکومت قایم ہوجاتی۔

ینی چری کا استیصال: ابراہیم پاشا کی کامیابیوں نے سلطان کو یونان کی طرف سے ایک حد تک مطمئن کر کے سلطنت کی اندرونی خرابیوں کی جانب توجہ کرنے کا موقع دیا، عرصہ سے دولت عثمانیہ کے زوال کا اصلی باعث ینی چری فوجیں ہورہی تھیں، وہ ہر اصلاح کی مخالفت کرتیں اور اپنی بدعنوانیوں کو قایم رکھنے کے لیے سلطان سلیم جیسے مدبر اور بیدار مغز فرماں روا کے قتل سے بھی باز نہ آئیں، اصلاح پسند وزرا کی ایک خاصی تعداد ان کی سرکشی کا شکار ہوچکی تھی، خود محمود کو ان کے ہاتھوں جو تلخ گھونٹ پینے پڑے اس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے، نہ صرف یہ کہ سلطنت کے لیے وہ ایک مستقل فتنہ ہوکر رہ گئی تھیں بلکہ بیرونی دشمنوں کے مقابلہ میں بھی اب ان پر مطلق اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا، ۱۱-۱۸۱۰ء کی جنگ اور پھر بغاوتِ یونان کے دوران میں یہ پوری طرح ثابت ہوگیا تھا کہ ان کی

---

(۱) فنلے جلد ۶ ص ۴۶۴

زبردست تنظیم اور غیر معمولی شجاعت اب باقی نہیں رہی اور عثمانی فتوحات جن فوجوں کی رہینِ منت تھیں وہ دشمن کے مقابلہ میں اب جم کر لڑ بھی نہیں سکتی تھیں، یونان میں مصری فوج کی کامیابی نے جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھی ینی چری کی فرسودگی اور کمزوری کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا، محمود کے علاوہ قسطنطنیہ کے عام باشندے، ارکانِ دیوان اور جماعتِ علما بھی دونوں کے فرق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، محمود نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ینی چری کو جو مدت سے مارِ آستین بنے ہوئے تھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا عزم کر لیا، اس کے لیے وہ پہلے ہی سے در پردہ تیاریاں کر رہا تھا، اس نے رفتہ رفتہ توپچیوں کی فوج بڑھالی تھی اور اس میں انہی اشخاص کو افسر مقرر کیا تھا جن کی وفاداری پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، چنانچہ ۱۸۲۶ء میں جب ینی چری کے استیصال کا اس نے قطعی فیصلہ کیا اس کے توپچیوں کی تعداد چودہ ہزار تک پہونچ چکی تھی، اس فوج کا افسر اعلیٰ ابراہیم سلطان محمود کا نہایت معتمد سردار تھا، محمود نے ینی چری کا آغا حسین نامی ایک افسر کو مقرر کیا تھا جو اس کے احکام کی تعمیل کے لیے ہمہ تن تیار تھا، اس نے علما کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا اور چند دنوں پیشتر مفتی اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا تھا جو اس کا ہمنوا اور موید تھا۔

ان تیاریوں کے بعد محمود نے وزرا اور علما کی ایک مجلس منعقد کی جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کفار پر غالب آنے کے لیے ضروری ہے کہ عثمانی فوجیں از سرِ نو با قاعدہ منظّم کی جائیں، اس کے بعد تمام حاضرین مجلس کے دستخطوں سے ایک فتویٰ اس مضمون کا شایع کیا گیا کہ ینی چری کے ہر دستہ سے سپاہیوں کی ایک معین تعداد جدید فوجی قواعد سیکھنے کے لیے بھیجی جائے، اس فتوے سے ینی چری میں بڑی برہمی پھیلی اور انھوں نے ۱۵ رجون ۱۸۲۶ء کو ات میدان میں جمع ہو کر اپنی شوربے کی دیگیں الٹ دیں جو گویا بغاوت کا اعلان تھا اور خاص خاص وزیروں کے قتل کا مطالبہ کرتی ہوئی قصر سلطانی کی طرف بڑھیں، محمود مقابلہ کے لیے تیار تھا، اس نے علمِ نبوی کو اپنے ہاتھ میں لے کر بلند کیا

اور تمام مسلمانوں کو بادشاہ وقت اور امیر المومنین کی حمایت کے لیے بلایا، اس علم کو دیکھ کر لوگ جوق جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے، فوراً ہی توپچیوں کی فوج اور ایشیائی دستے بھی جو اسی وقت کے لیے سقوطری میں مقیم تھے موقع پر پہنچ گئے، جوں ہی ینی چری سڑکوں میں داخل ہو کر محل کی طرف بڑھے، ابراہیم نے توپچیوں کو گولہ باری کا حکم دیا، ینی چری گولوں کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہوئے اور رات میدان میں اکٹھا ہو کر تھوڑی دیر تک اپنی بندوقوں سے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن گولوں کی باڑھ سے تنگ آ کر انھیں وہاں سے بھی ہٹنا پڑا اور اب انھوں نے اپنی بارکوں میں جا کر پناہ لی اور وہاں بہت جم کر مقابلہ کیا، محمود نے تمام توپیں بارکوں کے سامنے لگوا دیں اور مسلسل گولہ باری ہونے لگی، تھوڑی دیر میں تمام بارکیں جل کر برباد ہو گئیں اور ینی چری کا ایک ایک سپاہی ہلاک ہو گیا، قسطنطنیہ میں جتنے ینی چری اس طرح مارے گئے ان کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے، ان کے علاوہ ہزاروں جو سلطنت کے مختلف حصوں میں تھے چن چن کر قتل کر دئے گئے اور یہ پوری فوج بالکل ختم کر دی گئی یہاں تک کہ اس کا نام بھی سرکاری دفتروں سے مٹا دیا گیا۔

محمود کے کارنامے: عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمود کو جن بیش از بیش مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے حیرت انگیز عزم و استقلال نے ان تمام مشکلات کو اٹھارہ سال کی قلیل مدت میں دور کر دیا، سلطنت عثمانیہ کی بنیاد جو ۱۸۰۸ء میں متزلزل ہو گئی تھی، ۱۸۲۶ء میں پھر مستحکم نظر آنے لگی، ابتداء تقریباً ہر بڑے صوبہ میں شورش برپا تھی، محمود نے سب کو فرو کیا، سب سے بڑا سرکش والی یانینا علی پاشا تھا وہ گرفتار کر کے قتل کیا گیا، عرب میں وہابیوں کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا، مصر میں مملوک نیست و نابود کر دئے گئے، محمد علی پاشا کی طرف سے سرکشی کی کوئی علامت ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی، برخلاف اس کے اس کی بری اور بحری فوجیں ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں یونان کو دولت علیہ کے لیے از سر نو فتح کر رہی تھیں، اس درمیان میں مولڈیویا اور ولاچیا

کی بغاوتیں بھی فرو کی گئیں اور سرویا کے قلعوں پر بھی عثمانی فوجوں کا قبضہ ہو گیا، سب سے آخر محمود نے ینی چری کا استیصال کر کے سلطنت عثمانیہ کو اس کے سب سے بڑے اندرونی خطرہ سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائی، یہ سب کچھ محمود نے تنہا اپنی خداداد قابلیت اور آہنی عزم کی قوت سے کیا۔

دول عظمٰی کی دشمنی: ینی چری کو ختم کرنے کے بعد محمود نے اپنی نئی فوج کی تعداد جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھی اور جس کا لباس بھی یورپین طرز کا تھا بڑھا کر پینتالیس ہزار کر لی، توپچیوں کی فوج اس کے علاوہ تھی، اس کا ارادہ تھا کہ فوج کی تعداد بتدریج ڈھائی لاکھ تک پہنچا دے لیکن دول عظمٰی خصوصاً روس جو ہر موقع پر دولت عثمانیہ کی اصلاح اور ترقی کی راہ میں حائل ہو جاتی تھیں، محمود کی فوجی اصلاحات کا آغاز دیکھ کر جو دیگر اصلاحات کا مقدمہ تھیں اس قدر خوف زدہ ہوئیں کہ انھوں نے فوراً جنگ چھیڑ دی اور ان اصلاحات کو مکمل ہونے کا موقع نہ دیا، محمود کے عہد کے ایک نہایت مستند مورخ فان مولٹکی (Yon Moltke) کی رائے ہے کہ اگر ینی چری کے استیصال کے بعد ترکی کو امن وسکون کے دس سال میسر آ جاتے تو سلطان محمود کی فوجی اصلاحات اس مدت میں کچھ قوت حاصل کر لیتیں اور ایک قابل اعتماد فوج کی مدد سے سلطان اپنے ملک کے نظم ونسق میں ضروری اصلاحات جاری کر لیتا، سلطنت عثمانیہ کی مردہ شاخوں میں نئی روح پھونک دیتا اور اپنے پڑوسیوں کے لیے خوفناک بن جاتا، لیکن روس نے ان میں سے ایک بات بھی نہ ہونے دی اور سلطان کی فوجی اصلاحات کو شروع ہی میں ختم کر دیا[1] مولٹکی کے بیان کی تصدیق سب سے زیادہ ان مراسلات سے ہوتی ہے جو ۲۹-۱۸۲۸ء کو جنگ میں روس کے بڑے بڑے مدبرین نے ایک دوسرے کو بھیجے تھے اور جن میں انھوں نے صاف طور پر ظاہر کر دیا تھا کہ محمود کی اصلاحات کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ روس فوراً جنگ چھیڑ دے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ دولت عثمانیہ نے محمود

(۱) مولٹکی بحوالہ کریسی جلد ۲ ص ۴۱۳

کے زیر سیادت جتنی طاقت حاصل کر لی ہے اتنی طاقت مدت سے اسے حاصل نہ تھی اور اس دور اندیشی پر اپنے آپ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے جدید ترکی فوجوں کو زیادہ قوت حاصل کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ ابتدا ہی میں ان کا زور توڑنے کی تدبیر کر دی۔(۱)

محمود کی فوجی اصلاحات کے پورے طور پر بار آور نہ ہونے کے دو خاص اسباب تھے، ایک تو روس کی وہ معاندانہ کوششیں جن کا اعتراف اس کے ذمہ دار ارکانِ حکومت نے صاف الفاظ میں کیا ہے، دوسرے حکومت برطانیہ کا یونانیوں کی حمایت میں دولت علیہ سے برسر پیکار ہو جانا، روس اور سلطنت عثمانیہ کے تعلقات قرنوں سے خراب تھے اور جب سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوا روس نے کوئی موقع اس کی کمزوری سے فائدہ کا نہ چھوڑا، یونان کی بغاوت روس کے لیے ایک بہترین موقع تھی لیکن انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کے بعد ویانا کی کانگریس نے یورپ میں از سر نو امن وامان قایم کرنے کی جو کوشش کی تھی اس کے لحاظ سے توقع نہ تھی کہ یونان کے باغیوں کو کسی یورپین حکومت سے علانیہ مدد مل سکے گی، ان کو سب سے زیادہ امید روس سے تھی مگر الکزنڈر اول یونانیوں سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود نفس بغاوت کا سخت مخالف تھا اور یونان کے باغیوں کی مدد کر کے خود اپنی رعایا میں بغاوت کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا، اسی بنا پر اس کی حیات تک یونانیوں کو روس سے کوئی مدد نہ مل سکی لیکن ۲۴ر دسمبر ۱۸۲۵ء کو الکزنڈر کا انتقال ہو گیا اور روس کے تخت پر اس کا بھائی نکولس (Nicholas) آیا جو تمام تر روس کے قومی جذبات کا مجسمہ تھا اور ترکوں کو یورپ سے نکال دینا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا، نکولس کا تخت نشین ہونا ہی دولت عثمانیہ سے جنگ چھڑ جانے کے لیے کافی تھا، روس کی اندرونی سیاست نے اس میں اور بھی جلدی کی، سینٹ پیٹرس برگ میں ایک جماعت نکولس کی تخت نشینی کی مخالف تھی، یہاں تک کہ فوج بھی اس سے متاثر ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ عنقریب خانہ جنگی شروع ہو جائے گی،

(۱) کریسی ص ۱۴-۱۳ء

دارالسلطنت کے مدبروں کے نزدیک خانہ جنگی کو رفع کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ سلطنت عثمانیہ سے جنگ چھیڑ دی جائے (۱) لڑائی کے لیے بہانہ تلاش کرنا کچھ مشکل نہ تھا، سرویا، مولڈیویا اور ولاچیا کے معاملات جو معرضِ التوا میں تھے ان کے متعلق گفتگو پھر شروع کر دی گئی اور روسی وزیروں نے ایسا لب ولہجہ اختیار کیا کہ اس سے ان کا اصلی مقصد صاف ظاہر ہوتا تھا، چنانچہ اگست ۱۸۲۶ء میں جب کہ ینی چری کے استیصال کو صرف دو مہینے گذرے تھے، روس کی طرف سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ ایشیا کے بعض قلعے جو اس کے دعوے کے مطابق صلح نامۂ بخارسٹ میں اسے دیئے جا چکے تھے فوراً حوالہ کر دیئے جائیں، مولڈیویا اور ولاچیا کے باشندوں کو وہ تمام حقوق دیئے جائیں جو بغاوت سے پہلے انھیں حاصل تھے اور اہل سرویا کے سیاسی حقوق کے تسلیم کرنے میں مزید تاخیر نہ کی جائے، ترکوں کو ان مطالبات پر طیش آیا مگر ینی چری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور جدید فوج اس وقت تک اتنی تیار نہ تھی کہ روس کا مقابلہ کر سکے، اس لیے محمود کو مجبوراً دینا پڑا اور ۲۸/صفر ۱۲۴۲ھ مطابق ۷/اکتوبر ۱۸۲۶ء کو معاہدہ آق کرمان پر دستخط ہو گئے۔

معاہدۂ آق کرمان: اس معاہدہ میں صلح نامہ بخارسٹ کی ازسرنو تصدیق کی گئی اور یہ طے پایا کہ مولڈیویا اور ولاچیا کے باشندوں کو وہ تمام حقوق پھر دیئے جائیں جو صلح نامہ مذکور نیز خط شریف ۱۸۰۲ء کے رو سے انھیں مل چکے تھے، ان ولایتوں کے آیندہ امیروں (ہوسپودار) کا انتخاب وہیں کے رؤسا اپنی جماعت میں سے سات سال کے لیے کیا کریں، باب عالی کو حق نہ ہوگا کہ ان میں سے کسی امیر کو روس کی منظوری کے بغیر معزول کرے، مولڈیویا کے رؤسا کو جو ۱۸۲۱ء کی بغاوت میں شریک تھے اور پھر روس جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے وطن واپس آنے اور اپنی جائداد اور املاک پر قابض ہونے کی اجازت دی جائے، سرویا کی آیندہ حکومت سے متعلق وہاں کے باشندے اپنے نمایندوں کے ذریعہ باب عالی سے معاملات طے کر لیں اور جو کچھ طے ہوا سے فوراً ایک خط شریف میں

---

(۱) مولٹکی بحوالہ کریسی جلد ۲ ص ۴۱۵

شایع کر کے اس معاہدہ میں شامل کر دیا جائے، سرویا کو جو حقوق دیے جائیں ان میں مندرجہ ذیل امور کی تصریح خاص طور پر کر دی جائے: مذہبی آزادی، اپنے سرداروں کا آزاد انتخاب، حکومتِ خود اختیاری، جو علاقے سرویا سے علاحدہ کر لیے گئے تھے ان کا دوبارہ الحاق، متعدد محصولوں کو ملا کر صرف ایک محصول کا نفاذ، تجارتی آزادی، شفاخانوں مدرسوں اور مطبعوں کا قیام اور یہ قانون کہ قلعوں کے فوجی دستوں کے علاوہ کسی مسلمان کو سرویا میں رہنے کی اجازت نہ دی جائے، معاہدہ کی دوسری دفعات بھی دولت علیہ کے خلاف ہی تھیں مثلاً شمالی افریقہ کے بحری قزاقوں سے روسی تاجروں کو جو نقصان پہنچے اس کی تلافی کا ذمہ دار باب عالی ہوگا اور اب تک جن حکومتوں کو بحر اسود میں جہاز رانی کا حق حاصل نہ تھا اگر آیندہ انھیں یہ حق دیا جائے تو باب عالی ذمہ دار ہوگا کہ اس اجازت سے روس کی تجارت کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔

مسیحی اتحاد: محمود نے مذکورہ بالا شرایط کی سختی صرف اس خیال سے گوارا کر لی تھی کہ فی الحال جنگ سے مہلت مل جائے گی اور فوجی و ملکی اصلاحات جاری کی جاسکیں گی، جن کے لیے امن کی فرصت ضروری تھی لیکن یورپ کی مسیحی طاقتوں کے لیے دولت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا اس سے بہتر موقع مشکل سے میسر آسکتا تھا، جب کہ ایک طرف ینی چری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور دوسری طرف سلطنت کی بقیہ فوجیں یونانی بغاوت کے فرو کرنے میں مصروف تھیں روس تو قدیم دشمن تھا ان حکومتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ کیا جو مدت سے دوستی کا دم بھر رہی تھیں، چنانچہ انگلستان اور فرانس نے یونان کی در پردہ ہمدردی سے نکل کر علانیہ حمایت شروع کر دی، ۶ رجولائی ۱۸۲۷ء کو روس، انگلستان اور فرانس کے درمیان لندن میں ایک معاہدہ ہوا جس کا مقصد جنگ یونان کی خوں ریزی کو ختم کرنا اور ترکوں اور یونانیوں میں صلح کرا دینا ظاہر کیا گیا، ارکان معاہدہ نے محاربین کے درمیان مصالحت کرا دینے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور صلح کی بنیادی شرط یہ قرار دی کہ یونان کو عملاً بالکل آزاد کر دیا جائے، سلطان کی فرماں روائی

صرف نام کے لیے باقی رہے اور اسے ایک معین رقم بطور سالانہ خراج کے ملتی رہے، جسے یونانی خود ہی جمع کر کے بھیج دیا کریں گے، ان شرایط پر گفتگو کرنے کے لیے یہ طے پایا کہ جنگ فوراً روک دی جائے اور اگر باب عالی دولِ عظمٰی کی وساطت قبول کرنے سے انکار کرے تو یونان کو ایک آزاد حکومت تسلیم کر کے اس سے بین الاقوامی تعلقات قایم کر لیے جائیں، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق روس انگلستان اور فرانس کے سفیروں نے باب عالی سے جنگ روک دینے اور مذکورہ بالا شرایط پر صلح کر لینے کا مطالبہ پیش کیا، محمود نے اس مطالبہ کو فوراً مسترد کر دیا اور جواب دیا کہ غیر حکومتوں کو سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، خصوصاً جبکہ وہ ملک جسے عثمانی مقبوضات سے علاحدہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، صدیوں سے دولت علیہ کے زیر حکومت رہ چکا ہے اور وہ جماعت جس کی پاسداری میں اتحادیوں نے بین الاقوامی قوانین کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، ڈاکوؤں اور باغیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

واقعۂ نوارینو: دولِ ثلاثہ نے جب یہ دیکھا کہ ابراہیم پاشا کو موریا میں شاندار کامیابی حاصل ہو رہی ہے اور اس نے یونانیوں کو ہر موقع پر شکست دے کر بغاوت کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے تو انھوں نے یونان کی حمایت میں اپنے جنگی بیڑے بھیج کر امیر البحروں کے ذریعہ سے ابراہیم پاشا سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ باغیوں کے خلاف اب کوئی کارروائی نہ کرے اور اپنے جہازوں اور فوج کو لے کر مصر واپس چلا جائے، ابراہیم پاشا نے جواب دیا کہ وہ اپنے والد یا باب عالی کے احکام کے بغیر ایسا کرنے سے معذور ہے، البتہ اس نے باب عالی کے احکام کے پہنچنے تک عارضی صلح منظور کر لی لیکن یوروپین امیر البحروں نے اس معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور برابر یونانیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، مہلت جنگ سے فائدہ اٹھا کر یونانی ان مقامات پر حملہ کرنے لگے جنھیں ابراہیم پاشا فتح کر چکا تھا، انگریز اور یوروپین افسر بھی یونانی فوجوں میں شامل تھے، ابراہیم پاشا نے ان کارروائیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا مگر دولِ عظمٰی کے امیر البحروں نے اس کی مطلق

پروا نہیں کی، برخلاف اس کے جب ابراہیم پاشا نے شہر پتراس (Patras) کو بچانے کے لیے جس پر یونانیوں نے حملہ کر دیا تھا، نوارینو کی بندرگاہ سے نکلنا چاہا تو انگریز امیر البحر کوڈرنگٹن (Codrington) نے جو اتحادی بیڑوں کا سر عسکر تھا معاہدۂ صلح کا حوالہ دے کر اسے روک دیا۔

اتحادی بیڑا عثمانی بیڑے کی ناکہ بندی کرنے کے لیے خلیج نوارینوں میں داخل ہو گیا تھا، کوڈرنگٹن کو یہ ہدایت تھی کہ ابراہیم پاشا تک کسی قسم کی مدد نہ پہنچنے دے گو اس کے لیے بالآخر توپ سے کام لینا پڑے، ابراہیم پاشا نے یہ دیکھ کر کہ دولِ متحدہ کی حوصلہ افزائی سے باغیوں کی شورش پھر بڑھ رہی ہے، موریا کے اندرونی علاقوں میں جا کر اس فتنہ کو روکنے کی کوشش کی، کوڈرنگٹن نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ۲۰/اکتوبر ۱۸۲۷ء کو دفعۃً ترکی مصری جہازوں پر جو خلیج نوارینو میں لنگر انداز تھے حملہ کر دیا، حملہ کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ عثمانی بیڑے سے ایک گولی آ کر ایک انگریز کو لگی اور وہ مر گیا، اس ایک مسیحی جان کے بدلہ میں تقریباً پورا عثمانی بیڑا برباد کر دیا گیا، جس میں ہزاروں مسلمان ہلاک ہو گئے، عثمانی بیڑے میں کشتیوں کی تعداد تو ضرور زیادہ تھی لیکن جنگی جہازوں کی تعداد اور مجموعی حیثیت سے اتحادی بیڑا اس سے بہت بہتر تھا(۱) چار گھنٹے تک شدید جنگ ہوتی رہی، ترکوں اور مصریوں نے نہایت شجاعت سے مقابلہ کیا مگر آخر میں چند کشتیوں کے علاوہ باقی سب جہاز برباد ہو گئے۔

اس واقعہ سے تمام یورپ متحیر ہو گیا اور بقول میریٹ انگلستان کی حکومت میں تو اس سے سراسیمگی پیدا ہو گئی، اس وقت تک دول متحدہ میں سے کسی نے بھی دولت عثمانیہ سے جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، اس لیے واقعہ نوارینو کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، چنانچہ ۲۹/جنوری ۱۸۲۸ء کو شاہ انگلستان نے اس واقعہ پر اپنے 'شدید غم' کا اظہار کیا کہ 'ایک قدیم حلیف کی بحری فوجوں سے لڑائی ہو گئی'' (۲) اور قوی امید ظاہر کی کہ ''اس

---

(۱) کریسی جلد۲ص۴۲۰ (۲) میریٹ ص ۲۲۰

حادثۂ مشئومہ کے بعد پھر جنگ وجدل کی نوبت نہ آئے گی"(۱) لیکن موسیو الفرید لمیّر نے صحیح لکھا ہے کہ اتحادی بیڑے نے جو کچھ کیا وہ فرانس، روس اور انگلستان کی متفقہ رائے سے کیا۔(۲)

نوارینو کی شکست کا اثر: نوارینو کا حادثہ دولت عثمانیہ کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا، اس سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ابراہیم پاشا کا بحری تعلق مصر سے منقطع ہو گیا بلکہ جنگ یونان کا بھی خاتمہ ہو گیا اور یونان کے باغی ایک خودمختار مملکت کے حاکم بن گئے، ابراہیم پاشا کو اپنی فوجیں لے کر مصر واپس چلا جانا پڑا، اس کے بعد فرانسیسی جنرل میسن (Maison) اتحادیوں کی طرف سے موریا میں داخل ہوا اور اس نے بقیہ ترکی فوجوں کو بھی وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا، نوارینو کے واقعہ سے بحر اسود پر روس کا تسلط بھی قایم ہو گیا، جو آیندہ جنگ میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ اس سے وارنا کی فتح آسان ہو گئی اور روسی فوجیں بلقان کو عبور کر کے قسطنطنیہ کے حملہ کے قصد سے آگے بڑھ سکیں۔

ان واقعات کے باوجود سلطان محمود نے معاہدۂ لندن کے شرایط منظور کرنے سے قطعی انکار کر دیا، البتہ وزرا نے سلطنت کی کمزوری کو محسوس کر کے اس بات کی کوشش کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے، چنانچہ انھوں نے یونان سے متعلق کچھ تجویزیں اتحادیوں کے سامنے ان کی سفیروں کے ذریعہ سے پیش کرنی چاہیں، وہ تجویزیں یہ تھیں کہ بابِ عالی تمام باغیوں کو معاف کر دے گا، محصولوں اور خراج کی باقی ماندہ رقم سے دست بردار ہو جائے گا جو جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں انھیں واپس کر دے گا، یونانیوں کے تمام سابق حقوق از سر نو عطا کر دے گا اور اس بات کی ضمانت دے گا کہ حکومت پہلے کی بہ نسبت زیادہ نرمی سے کی جائے گی مگر سفرا معاہدۂ لندن کے شرائط پر مصر رہے اور ان میں سے کسی تجویز کو منظور نہیں کیا(۳) ۸؍دسمبر ۱۸۲۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے، یہ ان

(۱) میریٹ ص ۲۲۱ (۲) مصطفےٰ کامل پاشا ص ۱۱۷ (۳) کریسی جلد ۲ ص ۴۲۱

حکومتوں کی طرف سے تعلقات کے منقطع ہونے کا اعلان تھا، رئیس آفندی نے معاملات کو سلجھانے کی ایک بار اور کوشش کی مگر روسی سفیر نے اس کے مراسلہ کا کوئی جواب بھی نہیں دیا، حقیقت یہ تھی کہ زار نکولس جنگ کے لیے بالکل تیار تھا، وہ بسرآبیا کے علاقہ میں نئی فوجیں بھرتی کررہا تھا اور بحراسود کی بندرگاہوں میں فوجی سامان اور جہازوں کو اکٹھا کررہا تھا کہ ضرورت کے وقت عثمانی مقبوضات پر بلاتاخیر حملہ کیا جاسکے، باب عالی اور روس کے درمیان بعض شکایتیں عرصہ سے چلی آرہی تھیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود نکولس جیسے زار کے لیے جنگ کا حیلہ بن سکتی تھی مثلاً مولڈیویا، ولاچیا اور سرویا کے معاملات ہر موقع پر روس کے کام آسکتے تھے، دوسری طرف باب عالی ایشیا کے چند قلعوں کا دعویدار تھا جن پر روس غاصبانہ قابض تھا، ان حالات سے محمود کو یقین ہوگیا تھا کہ نکولس جنگ کے لیے بالکل تیار ہے اور عنقریب حملہ کردے گا، لہٰذا بجائے اس کے کہ وہ روس کے حملہ کا انتظار کرے ۲۰ر دسمبر ۱۸۲۷ء کو اس سے خود ہی اعلان جنگ کردیا۔

جنگ روس: مئی ۱۸۲۸ء میں زار نکولس خود میدان میں آیا اور دریائے پرتھ کو عبور کرکے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ مولڈیویا میں داخل ہوگیا، تقریباً اسی وقت روسی بیڑہ بھی درۂ دانیال میں داخل ہوا۔

سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں ایک لاکھ روسی فوجیں روانہ کی گئی تھیں، ان کے علاوہ جنرل کاونٹ پاسکی ویش (Count Paskiwetsch) تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایشیائی صوبوں میں داخل ہوا اور سولہ ہزار کا ایک لشکر وقت ضرورت کے لیے الگ محفوظ رکھا، بحری قوت میں روس کی فوقیت مسلم تھی، چھوٹے جہازوں کے علاوہ بحراسود میں اس کے سولہ بڑے بڑے جنگی جہاز لڑائی کے لیے تیار تھے، نیز بحر یونان میں اس کا وہ بیڑا بھی موجود تھا جس نے نوارینو میں ترکی بیڑے کو شکست دینے میں مدد کی تھی، اس جنگ میں شروع سے آخر تک روس کی بحری طاقت اس کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی، برخلاف اس کے دولت علیہ کی بری اور بحری دونوں قوتیں روس

کے مقابلہ میں بہت کمزور تھیں، بری فوجوں کی تعداد جو نظام جدید کے مطابق مرتب کی گئی تھی صرف اڑتالیس ہزار تھی، ان میں زیادہ تر نوجوان تھے جو اس امید پر بھرتی کیے گئے تھے کہ فوجی اصلاحات کے خلاف ان کی بدظنی بڑی عمر کے ترکوں کی طرح شدید نہ ہوگی لیکن ناتجربہ کاری کے باوجود جو چیز ان نوجوانوں کو آزمودہ کار سپاہیوں پر فوقیت دیتی تھی وہ ان کی اطاعت شعاری تھی، میدان جنگ میں انھوں نے اپنی شجاعت سے روسیوں کے دانت کھٹے کر دئے، روسی سفیر متعینہ پیرس ۱۹/نومبر ۱۸۲۸ء کو لکھتا ہے: ایسی حالت میں جب کہ اصلاحات کی پوری تکمیل نہیں ہوئی اور وہ ابتدائی حالت میں ہیں، سلطان نے ہمارا باضابطہ اور شدت سے مقابلہ کیا ہے تو اس صورت میں ان کا مقابلہ کس قدر زبردست ہوتا جب کہ ان کو تکمیل کا موقع مل جاتا اور وہ پایہ کمال کو پہنچ جاتے''(۱) ان جدید فوجوں کے علاوہ جاگیرداروں کی بے ضابطہ فوجیں بھی طلب کی گئی تھیں لیکن چونکہ یوروپین صوبوں میں محمود کی اصلاحات کے خلاف عام بیزاری پھیلی ہوئی تھی اس لیے جاگیری فوجوں کا بڑا حصہ صرف ایشیائی صوبوں سے فراہم ہوسکا، یوروپین صوبوں نے بہت کم مدد کی، چنانچہ بوسنیا نے جو ایک نہایت جنگجو صوبہ تھا اور اس میں زیادہ تر مسلمان آباد تھے کوئی فوج نہیں بھیجی، فوجی افسروں میں بھی بہتیرے اب تک نظامِ قدیم کے دلدادہ تھے اور بقول کریسی اصلاحات کی وجہ سے سلطان سے ان کی بیزاری تقریباً اتنی ہی شدید تھی جتنی روسی کفار کے خلاف ان کی نفرت۔

مئی ۱۸۲۸ء میں روسی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا پر قبضہ کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور دریاے ڈینوب کو عبور کر کے ۱۵/جون کو ابرائیل کا قلعہ فتح کرلیا، اس کے بعد انھوں نے شوملہ اور وارنا کا رخ کیا، شوملہ پر انھوں نے کئی حملے کیے مگر کامیابی نہیں ہوئی اور آخر میں شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، وارنا سے بھی انھیں اسی طرح پسپا ہونا پڑتا لیکن یوسف پاشا کمانڈر وارنا کی غداری سے جو قلعہ کے تقریباً پورے دستہ کے ساتھ دشمن سے

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از ولا ڑون کیئر (ترجمہ اردو) جلد اول ص ۴۵۹

جاملا، یہ اہم قلعہ بآسانی فتح ہوگیا، اس کے بعد سلسٹریا کا محاصرہ شروع ہوا مگر اس میں روسیوں کو ناکامی ہوئی اور اسی معرکہ پر یوروپین ٹرکی میں ۱۸۲۸ء کی جنگ کا خاتمہ ہوگیا، فان مولنکی جو اس جنگ میں دولت علیہ کی طرف سے شریک تھا لکھتا ہے: "اگر ہم ان زبردست قربانیوں کا لحاظ کریں جو ۱۸۲۸ء کی جنگ میں روس کو برداشت کرنا پڑیں تو یہ بتانا مشکل ہوگا کہ فتح ان کی ہوئی یا ترکوں کی، پہلی جنگ کا فیصلہ دوسری جنگ کے نتیجہ پر منحصر رہا۔"(۱)

ایشیا میں روسیوں کی کامیابی زیادہ نمایاں تھی، اناپا (Anapa) ہرٹ وٹز (Hertwitz) اور بعض دوسرے قلعوں پر ان کا قبضہ ہوگیا، جس کی وجہ سے دوسرے سال ایشیائے کوچک کا داخلہ آسان ہوگیا لیکن اصلی مہم یورپ کی تھی اور اسی پر مغربی حکومتوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں، چنانچہ جب ۱۸۲۹ء میں جنگ دوبارہ شروع ہوئی تو نکولس نے سال گذشتہ سے بہتر اور زیادہ تعداد میں فوجیں روانہ کیں اور ان کا سپہ سالار مارشل ڈیبش (Diebits ck) کو مقرر کیا۔

ایک شدید غلطی اور شدید تر غلط فہمی: شوملہ کی عثمانی فوج نے ۱۷ مئی ۱۸۲۹ء کو جنگ چھیڑ کر پراوادی کو روسیوں کے قبضہ سے چھڑا لینے کی کوشش کی، مقابلہ ابھی جاری ہی تھا کہ مارشل ڈیبش جس نے ۱۸ مئی کو سلسٹریا کا محاصرہ شروع کر دیا تھا، اپنی فوج کا بڑا حصہ لے کر پراوادی کی طرف تیزی سے روانہ ہوا اور پراوادی اور شوملہ کے درمیان کولیوشا (Kulewtsha) کے مقام پر ترکوں کو شکست دی، عثمانی سرعسکر صدر اعظم رشید پاشا نے شکست خوردہ فوج کو دوبارہ شوملہ میں جمع کرنے کی کوشش کی مگر یہ خیال کرکے کہ ڈیبش اب شوملہ پر حملہ کرے گا، اس نے ان دستیوں کا بڑا حصہ طلب کر لیا جو کوہِ بلقان کے دروں کی حفاظت کے لیے متعین کیے گئے تھے، یہ ایک نہایت شدید غلطی تھی جس کا خمیازہ دولت علیہ کو بہت جلد بھگتنا پڑا، اس وقت تک کوئی حملہ آور فوج ان

(۱) کریسی ج ۲ ص ۴۲۴

دروں کو عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن رشید پاشا کی اس حیرت انگیز غلطی کی وجہ سے مارشل ڈیبش کے لیے یہ محال ممکن ہوگیا، ۲۶رجون کو سلسٹریا کا محاصرہ ختم ہوا اور روسیوں نے اس مشہور قلعہ پر قبضہ کرلیا، ادھر سے فارغ ہوکر ڈیبش فوراً بلقان کی مہم پر روانہ ہوگیا، بحر اسود اور بحر انجین میں روسی فوجوں کی مدد کے لیے جنگی بیڑے پہلے سے تیار تھے، ڈیبش نے دس ہزار کا ایک دستہ شوملہ میں صدر اعظم کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لیے چھوڑا اور صرف تیس ہزار سپاہیوں کو لے کر بلقان کے دروں کی طرف بڑھا، اسے علم تھا کہ قسطنطنیہ اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے بڑے شہروں میں محمود کی اصلاحات کے خلاف عام طور پر بیزاری پھیلی ہوئی ہے، جس سے رومیلیا اور البانیا کی فوجیں بھی متاثر ہیں، ان حالات سے اس کے حوصلے اور بھی بڑھے ہوئے تھے، ۱۱رجولائی کو نہایت خاموشی کے ساتھ روانہ ہوکر نوروز کی قلیل مدت میں اس نے کوہِ بلقان کے درّوں کو عبور کرلیا اور جنوبی وادی تک پہنچ گیا، درّوں کی حفاظت کے لیے جو دستے متعین کیے گئے تھے، ان کی قوت رشید پاشا کی ناعاقبت اندیشی سے پہلے ہی کمزور ہوچکی تھی، اس لیے وہ ڈیبش کی فوج کو روک نہ سکے، روسی جب پہاڑوں کو طے کرکے وادی میں پہنچے تو ان کی تعداد پیچش اور طاعون سے بہت کچھ گھٹ چکی تھی، لیکن ترکوں کو اس کی خبر نہ تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ڈیبش کے ساتھ کم سے کم ایک لاکھ آدمی ہوں گے، نیز انھیں یہ بھی خیال تھا کہ شوملہ سے روانہ ہونے کے قبل ڈیبش نے صدر اعظم کی فوج کو برباد کردیا ہوگا، ورنہ اس کے لیے کوہِ بلقان کا عبور کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا، اس خیال سے ان کے ہاتھ پیر اور بھی پھول گئے، ڈیبش متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا چلا گیا، یہاں تک کہ ۲۰راگست ۱۸۲۹ء کو سلطنت عثمانیہ کے قدیم پایہ تخت ادرنہ کے فوجی دستہ نے بھی صرف بیس ہزار روسی سپاہیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

طلسم قوت: ڈیبش نے اس مہم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا تھا کہ رومیلیا کی عثمانی رعایا کو روسی فوجوں کی غارت گری سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے، یہ دانشمندی اس کے حق

میں نہایت مفید ثابت ہوئی، عیسائی آبادی نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا اور مسلمان بھی یہ دیکھ کر کہ جان و مال، ناموس و مذہب یا مقامی حکومت خود اختیاری کسی چیز سے تعرض نہیں کیا جاتا، ہتھیار ڈال دینے کے بعد بدستور اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے، اس تدبیر سے ڈیبش کی چھوٹی سی فوج قدم قدم پر لڑائیاں لڑنے سے بچ گئی، جن میں الجھ کر اسے بالآخر برباد ہو جانا پڑتا اور ڈیبش کی فوجی قوت کا طلسم کامیابی کے ساتھ ترکوں پر قایم رہا، وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اورنہ سے آگے بڑھ کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کرے گا تو یہ فریب زیادہ دنوں تک قایم نہ رہ سکے گا اور چونکہ قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے محمود نے فوجیں فراہم کر لی تھیں اور مسلمانوں کا جوش غیرت سقوطِ اورنہ کے بعد انتہائی درجہ تک پہنچ چکا تھا، اس لیے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کا خیال ایک خواب سے زیادہ نہ تھا، علاوہ بریں رشید پاشا کی فوج شوملہ سے نکل کر پشت کی طرف سے حملہ کر سکتی تھی، دس ہزار کا جو دستہ ڈیبش نے پیچھے چھوڑ دیا تھا وہ صدر اعظم کو روکنے کے لیے کافی نہ تھا، دوسری طرف سکودرا کا پاشا مصطفیٰ جس نے اب تک خودسری کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی تھی، اب تیس ہزار بہترین البانی فوج کے ساتھ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے مستعد تھا، ایسی صورت میں ڈیبش کی کامیابی کی طرف یہی ایک تدبیر تھی کہ جس طرح ممکن ہو اپنی فوجی قوت کا طلسم قایم رکھتے ہوئے صلح کی کوشش کرے، اس کی خوش قسمتی سے نہ صرف قسطنطنیہ کے باشندوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی بلکہ عثمانی مدبرین اور یوروپین سفرا بھی اس کی فوج کی اصلی حالت سے بے خبر تھے، وہ سمجھتے تھے کہ روسی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار ہے، اسی درمیان میں ینی چری کے حامیوں نے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی لیکن محمود چونکہ پہلے سے تیار تھا، اس لیے فوراً ہی یہ شورش رفع کر دی گئی اور تمام باغی قتل کر دیے گئے، تاہم قسطنطنیہ میں نئی شورشوں کا خطرہ اب بھی محسوس کیا جاتا تھا، ایسی حالت میں وزرائے سلطنت اور یوروپین سفیروں نے متفقہ طور پر محمود سے درخواست کی کہ دولت عثمانیہ کو تباہی سے بچانے کے لیے جس طرح ممکن ہو روس سے صلح کر لی جائے، مغربی

حکومتوں کے اس نیک مشورہ کا سبب تو ظاہر ہے، وہ کسی حال میں بھی قسطنطنیہ پر روس کا قبضہ گوارا نہیں کر سکتی تھیں، البتہ عثمانی وزرا کا اصرار نیک نیتی پر مبنی تھا، محمود یوں دب کر صلح کرنے کے لیے مطلق آمادہ نہ تھا، لیکن جب ہر چہار طرف سے سخت اصرار ہونے لگا تو مجبور ہو کر اس نے مارشل ڈیبش کے پاس عثمانی نمایندوں کو بھیجنا منظور کر لیا، ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۸۲۹ء کو صلح نامہ اورنہ پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔

صلح نامۂ اورنہ: اس صلح نامہ کے رو سے زار نے یوروپین ٹرکی کے وہ تمام مقامات دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے جن پر روسی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، البتہ دریاے ڈینوب کا دہانہ اور مولڈیویا کا ایک حصہ جو ڈینوب کے بائیں ساحل پر واقع تھا، سلطنت روس میں شامل کر لیا گیا، وسطِ یورپ خصوصاً آسٹریا کی تجارت کے لیے اس علاقہ اور ڈینوب کے دہانہ کا قبضہ نہایت اہم تھا، ایشیا میں آناپا اخلتزیک اور چند دوسرے قلعوں اور علاقوں کے علاوہ بقیہ تمام فتوحات سے روس دست بردار ہو گیا، مولڈیویا اور ولاچیا کے لیے یہ طے پایا کہ ان کے امیروں کا انتخاب آیندہ مدۃ العمر کے لیے ہوا کرے گا، کسی ترک افسر کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا اور نہ ان ریاستوں میں کسی مسلمان کو بود و باش اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، وہاں کے مسلمانوں کو اٹھارہ ماہ کی مہلت دی گئی کہ اپنی جائدادیں فروخت کر ڈالیں، باب عالی کی فرماں روائی صرف نام کے لیے باقی رہ گئی اور اس کے لیے جو سالانہ خراج منظور ہوا، وہ بھی دو سال کے لیے معاف کر دیا گیا، ایسی ہی آزادی سرویا کو بھی دی گئی اور یہ قرار پایا کہ معاہدہ آق کرمان کی ان تمام دفعات پر جن کا تعلق سرویا سے ہے فوراً عمل درآمد شروع کر دیا جائے، بلغراد اور اورسوا کے قلعوں کے علاوہ سرویا کے اور تمام قلعوں سے ترکی دستے ہٹا لیے جائیں اور کوئی ترک اس صوبہ کے کسی دوسرے حصہ میں نہ رہنے پائے، سلسٹر یا دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا لیکن یہ طے پایا کہ ڈینوب کے دوسرے قلعے مسمار کر دیے جائیں، یہ بھی طے پایا کہ بحر اسود، باسفورس اور دردانیال کو روس کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا جائے، دورانِ جنگ میں روس

کی تجارت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لیے ساڑھے سات سو پونڈ بطور تاوان ادا کیے جائیں اور اس کے علاوہ پچاس لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ حکومت روس کو ادا کیے جائیں، اس رقم کی ادائیگی کے لیے دس سالانہ قسطیں مقرر کردی گئیں اور روس کو یہ حق دیا گیا کہ جب تک پوری رقم ادا نہ ہو جائے وہ اپنے مقبوضات سے کلیۃً دست بردار نہ ہو، چنانچہ یہ تصریح کردی گئی کہ پہلی قسط کی ادائیگی کے بعد روسی فوجیں اور نہ کا تخلیہ کریں گی، دوسری قسط کے بعد کوہِ بلقان سے واپس چلی جائیں گی، تیسری قسط کے بعد دریائے ڈینوب کے اس پار چلی جائیں گی اور جب تک بقیہ قسطیں ادا نہ کی جائیں گی یعنی دسویں سال تک مولڈیویا اور ولاچیا پر روس کا قبضہ باقی رہے گا۔

صلح نامہ کی دفعہ نمبر (۱۰) کے رو سے باب عالی نے معاہدۂ لندن مورخہ جولائی ۱۸۲۷ء نیز منضبطہ لندن مورخہ مارچ ۱۸۲۹ء کے شرائط جو انگلستان، فرانس اور روس کے درمیان طے ہوئے تھے منظور کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ یونان ایک خود مختار مملکت قرار پایا، اس کی حد خلیج ارتا (Arta) اور خلیج وولو (Volo) کے درمیانی خط سے متعین کردی گئی، اس خط کے شمال میں تھسلی اور البانیا کے صوبے دولت عثمانیہ کے سرحدی صوبے قرار پائے، جزائر آئیونین پر برطانیہ کا قبضہ قایم رہا، لیکن کریٹ اور وہ جزیرے جو تھریس اور ایشیائی ساحل سے قریب تھے، دولت علیہ کی فرماں روائی میں رہنے دیے گئے۔

محمود کو اس صلح نامہ سے بے حد صدمہ ہوا، اس پر دستخط کرتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہفتوں شدید حزن و ملال کی حالت میں وہ محل میں پڑا رہا اور کہیں باہر نہیں نکلا، اس صدمہ کی شدت اس وقت اور بھی بے پایاں ہو گئی جب صلح نامہ کے تکملہ کے بعد اسے روسی فوج کی اصل قوت کا علم ہوا اور اس نے معلوم کیا کہ ڈیبش کا پورا لشکر سترہ ہزار سے زیادہ نہ تھا، اگر روسی فوج کے متعلق غلط اطلاعات کی بنا پر وہ اپنے وزیروں کے اصرار سے مجبور نہ ہو گیا ہوتا اور چند دنوں اور صلح سے انکار کرتا رہتا تو ڈیبش کی دھمکیوں کی ساری حقیقت بہت جلد کھل جاتی اور اس کی خستہ و پریشان حال فوج

کا کوئی سپاہی سلامتی کے ساتھ واپس نہ جا سکتا۔

ہجومِ مصائب: صلح نامہ اورنہ کے دوسرے ہی سال جولائی ۱۸۳۰ء میں دولت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا، یہ صوبہ اگرچہ دولت علیہ سے عملاً آزاد ہو چکا تھا تاہم اس کی فرماں روائی اب بھی تسلیم کرتا تھا اور اس کے عامل کا تقرر باب عالی ہی کی طرف سے ہوا کرتا تھا لیکن چوں کہ جنگ روس میں عثمانی فوجوں کو بہت نقصان پہنچ چکا تھا اور صلح کے بعد سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، اس لیے محمود کو یہ تلخ گھونٹ بھی مجبوراً پینا پڑا، عام طور پر لوگوں نے گذشتہ جنگ کی شکستوں کا سبب محمود کی فوجی اصلاحات کو قرار دینا شروع کیا اور یہ خیال اس کثرت سے پھیلتا گیا کہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۳ء تک سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں برپا ہو گئیں، یوروپین صوبوں میں زیادہ شدید بوسنیا اور البانیا کی بغاوتیں تھیں جن کے فرو کرنے میں صدر اعظم رشید پاشا کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور شاہی خزانہ پر جو پہلے ہی تقریباً خالی ہو چکا تھا اور بھی زیادہ بار پڑتا گیا، ایشیائی صوبوں کی شورشیں بھی کم تشویش ناک نہ تھیں مگر سب سے زیادہ خطرناک مصر کی حالت تھی جو عنقریب اعلانِ جنگ کرنے والا تھا، محمد علی پاشا کے حوصلے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے، وہ صرف نام کے لیے باب عالی کا مطیع تھا، ورنہ حقیقتاً ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، مصر میں اپنی حکومت کو پوری طرح مستحکم کر کے وہ تو اب خود سلطنت عثمانیہ کے تخت کا حوصلہ کر رہا تھا، نوارینو کی شکست کے بعد اس نے اپنا جنگی بیڑہ از سر نو تعمیر کر لیا تھا، اس کے پاس ایک آموزدہ کار اور اعلیٰ درجہ کی تربیت یافتہ فوج تھی جس کے افسر زیادہ تر فرانسیسی تھے اور اس فوج کا سپہ سالار خود اس کا لڑکا ابراہیم پاشا تھا جس کی فوجی قابلیت اور شجاعت کا سکہ جنگ یونان میں بیٹھ چکا تھا۔

محمد علی کی بغاوت: یونان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے جب محمود نے محمد علی پاشا کو طلب کیا تھا تو اس خدمت کے معاوضہ میں اسے مصر کے علاوہ شام، دمشق، طرابلس

(واقع ایشیا) اور کریٹ کا والی بھی بنا دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن چونکہ جنگ یونان کا نتیجہ دولت علیہ کے خلاف رہا اور ابراہیم پاشا موریا کا تخلیہ کر کے اپنی فوج کے ساتھ مصر واپس چلا گیا، اس لیے محمد علی نے جب ان چار ولایتوں کی درخواست کی تو محمود نے صرف کریٹ کا عطا کیا جانا منظور کیا، یہ بات محمد علی جیسے شخص کو سخت ناگوار ہوئی، اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا لیکن شام پر حملہ کرنے کے لیے موقع کا انتظار کرتا رہا، اتفاق سے ۱۸۳۱ء میں اسے ایک حیلہ ہاتھ آ گیا، کچھ مصریوں نے بھاگ کر عکا میں پناہ لی تھی، محمد علی نے عبداللہ پاشا والی عکا کو لکھا کہ ان 'باغیوں' کو حوالہ کر دو، اس نے انکار کیا، یہ عذر محمد علی کے لیے بہت کافی تھا فوراً ایک زبردست فوج ابراہیم پاشا کی سرکردگی میں روانہ کی، ابراہیم پاشا نے شام میں داخل ہو کر سب سے پہلے عکا کا محاصرہ کر لیا، لیکن جب اس کی فتح میں دیر ہوئی تو کچھ فوج وہاں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گیا اور یافا، غزہ اور بیت المقدس پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا، ۲۷رمئی ۱۸۳۲ء کو عکا بھی فتح ہو گیا اور ۱۵رجون کو ابراہیم نے دمشق پر بھی قبضہ کر لیا۔

ابراہیم پاشا کے حملہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان نے ایک فوج حسین پاشا کی قیادت میں روانہ کی لیکن ابراہیم ترکوں کے مقدمۃ الجیش کو شکست دے کر حلب میں داخل ہو گیا، ۲۹رجولائی کو بیلان کے مقام پر اس نے خود حسین پاشا کو سخت شکست دی، ایشیائے کوچک کا راستہ اب کھلا ہوا تھا، محمود نے رشید پاشا کو تازہ فوج کے ساتھ روانہ کیا، ۲۹راکتوبر ۱۸۳۲ء کو قونیہ میں مقابلہ ہوا جس میں رشید پاشا کو شکست ہوئی، اس کے بعد ابراہیم کوتاہیہ کی طرف بڑھا اور وہاں پہنچ کر بروصہ کا قصد کیا، جو دولت عثمانیہ کا پہلا پایہ تخت رہ چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی طرح ایشیائے کوچک پر بھی بہت جلد اس کا تسلط قائم ہو جائے گا، ان فتوحات کے بعد آیندہ سال قسطنطنیہ پر حملہ کا خطرہ ایک بالکل قدرتی امر تھا۔

محمود نے اس خطرہ کو محسوس کر کے سب سے پہلے برطانیہ سے مدد کی خواہش

کی، لیکن اس نے صاف جواب دیا، روس اس موقع کا منتظر ہی تھا، چنانچہ دسمبر ۱۸۳۲ء میں نکولس نے جنرل موراویف (Mouravieff) کو خاص اس غرض سے قسطنطنیہ بھیجا کہ سلطان کے سامنے ابراہیم کی فتوحات کا خطرہ ظاہر کر کے قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے روس کی مدد پیش کرے لیکن باوجود اس خطرہ کے محمود کو روس کی مدد قبول کرنے میں تامل تھا، موراویف کو جب باب عالی میں ناکامی ہوئی تو وہ سیدھا اسکندریہ پہنچا تا کہ محمد علی پر دباؤ ڈال کر کم سے کم ابراہیم پاشا کو آگے بڑھنے سے روکے، زار کی اس تشویش کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ قسطنطنیہ پر ابراہیم کا قبضہ ہو جائے گا بلکہ وہ متعدد معاہدے بھی معرضِ خطر میں تھے جو روس اور دولت علیہ کے درمیان ہو چکے تھے اور جن سے روس نے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے، زار جو بحر روم میں اپنے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے آبنائے باسفورس اور دردانیال کو کھلا رکھنا چاہتا تھا اس بات کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ آل عثمان کے کمزور فرماں رواؤں کے بجائے محمد علی کا طاقت ور خاندان قسطنطنیہ کے تخت پر قابض ہو جائے۔

روس کی مدد: اس درمیان میں محمود کو اندازہ ہو گیا تھا کہ روس سے مدد لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں، چنانچہ اس نے نہ صرف ایک جنگی بیڑے کی خواہش کی بلکہ بری فوج بھی طلب کی، ۲۰ رفروری ۱۸۳۳ء کو چار جنگی جہاز، چھ ہزار فوج لے کر باسفورس میں داخل ہوئے اور قسطنطنیہ کے سامنے لنگر انداز ہوئے، ان جہازوں کی آمد سے برطانیہ اور فرانس دونوں کو نہایت تشویش ہوئی اور انھوں نے سلطان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ روسی بیڑہ واپس کر دیا جائے، زار نے جواب دیا کہ جب تک ابراہیم اپنی فوج کے ساتھ کوہ طور کے اس پار لوٹ نہ جائے گا اس کے جہاز واپس نہ جائیں گے، ادھر محمد علی کو اصرار تھا کہ پورا شام، فلسطین کا ایک حصہ اور اطنہ کی اہم بندرگاہ اور ضلع اس کے حوالہ کر دیا جائے، مارچ میں سلطان نے شام، حلب اور دمشق دے کر صلح کر لینی چاہی مگر محمد علی نے اپنے مطالبات میں کوئی تخفیف منظور نہیں کی۔

معاہدہ کوتاہیہ: مجبوراً محمود نے ایک دوسرا جنگی بیڑا اور بری فوج روس سے طلب کی، ۵/اپریل کو بارہ ہزار روسی فوج سقوطری کے قریب اتری، یہ دیکھ کر انگلستان اور فرانس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی کیوں کہ قسطنطنیہ میں روسی اقتدار کا قایم ہوجانا ان کے مصالح کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انھوں نے محمد علی اور محمود دونوں پر صلح کے لیے پھر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور اب کی بار اپنی کوششوں میں کامیاب رہے، ۸/اپریل ۱۸۳۳ء کو باب عالی اور محمد علی پاشا کے درمیان کوتاہیہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کے رو سے محمد علی کے تمام مطالبات منظور کر لیے گئے، ۲۰/مئی کو سلطان نے ایک فرمان کے ذریعہ مصر و کریٹ کے علاوہ بیت المقدس، طرابلس، حلب، دمشق اور اطنہ کی حکومتیں بھی محمد علی کو عطا کیں یعنی تقریباً وہ تمام علاقے اس کو دے دیے گئے جنھیں سلطان سلیم اول کی فتوحات نے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کیا تھا۔

معاہدہ خونکار اسکلہ سی: قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے اب روسی فوجوں کی ضرورت نہ تھی، لیکن ان کی واپسی سے قبل باب عالی کو روس کے ساتھ ایک جارحانہ اور مدافعانہ معاہدہ کرنا پڑا جو 'معاہدہ خونکار اسکلہ سی' (۸/جولائی ۱۸۳۳ء) کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ سے روس کو دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا ایک قانونی حیلہ ہاتھ آ گیا، اس کی ایک نہایت اہم خفیہ دفعہ یہ تھی کہ روس کے مطالبہ پر دردانیال دوسرے ملکوں کے جنگی بیڑوں کے لیے بند کر دیا جائے گا، روس کے جنگی جہازوں کو باسفورس اور دردانیال سے گذرنے کی عام اجازت دی گئی۔

محمد علی سے دوبارہ جنگ: معاہدہ کوتاہیہ کے بعد صرف چند سال تک محمد علی سے صلح رہی، ۱۸۳۹ء میں جنگ پھر شروع ہوگئی، محمود کے لیے شام اور فلسطین کے علاقوں میں محمد علی کے منصوبے تشویش کا باعث ہو رہے تھے، دوسری طرف محمد علی حکومت خود اختیاری سے کم پر قانع نہ تھا اور جو ولایتیں اسے دی گئی تھیں ان کا خود مختار فرماں روا بننا چاہتا تھا، دونوں اپنی جگہ غیر مطمئن تھے اور آیندہ جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ابتدا محمد علی نے کی، ۱۸۳۸ء میں جب وہ اپنی تیاریاں مکمل کر چکا تو باب عالی میں سالانہ خراج بھیجنے سے انکار کر دیا، یہ گویا عملی خود مختاری کا اعلان تھا اس کے بعد حرم نبویؐ کی حفاظت کے لیے جو ترکی دستہ مقرر تھا، اسے برطرف کر کے اس نے اپنا عربی دستہ وہاں متعین کر دیا، یہ سلطان کی فرماں روائی سے آزاد ہونے کا دوسرا اعلان تھا، محمود نے اس کے پاس حکم بھیجا کہ ترکی دستہ حرم نبویؐ میں پھر متعین کر دیا جائے، خراج کا بقایا ادا کر دیا جائے اور ولایت مصر پر محض ایک والی کی حیثیت سے حکمرانی کی جائے لیکن محمد علی نے ان میں سے ہر حکم کی تعمیل سے انکار کیا، اس پر محمود نے ایک فوج حافظ پاشا کی قیادت میں شام پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی اور قپودان احمد فوضی پاشا کو جنگی بیڑے کے ساتھ اس کی مدد کے لیے مامور کیا، ۲۵/جون ۱۸۳۹ء کو نزیب کے مقام پر حافظ پاشا اور ابراہیم پاشا کا مقابلہ ہوا، عثمانی فوج کے پورے پورے دستے جن کے غدار افسر محمد علی سے رشوت لے چکے تھے جنگ کے درمیان ہی میں دشمن سے جا ملے، جو باقی رہ گئے تھے وہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور منتشر ہو گئے، پورا توپخانہ، تمام سامانِ رسد اور اسلحہ ابراہیم پاشا کے ہاتھ آیا۔

عثمانی بیڑے کی سرگذشت اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور عبرت انگیز تھی، بجائے اس کے کہ احمد فوضی پاشا، شام پہونچ کر حافظ پاشا کی مدد کرتا وہ اپنے جہازوں کو لیے ہوئے سیدھا اسکندریہ چلا گیا اور وہاں ۱۳/جولائی کو پورا بیڑہ محمد علی کے حوالہ کر دیا، غداری کی ایسی حیرت انگیز مثال تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔

محمود کی وفات: لیکن قبل اس کے کہ ان واقعات کی اطلاع اس تک پہنچے یکم جولائی ۱۸۳۹ء کو محمود اپنی زندگی کے آخری مرحلے سے فارغ ہو چکا تھا، موت کی دست گیری نے ان روح فرسا حادثات کے صدمہ سے بچا لیا۔

محمود کی عظمت: عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سے زندگی کے آخری لمحہ تک محمود کو گوناگوں مشکلات و مصائب کا سامنا رہا، غیروں سے زیادہ اپنوں نے دشمنی کا

ثبوت دیا اور مخالفت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن سلطنت کی خدمت و اصلاح کا فرض جو اس نے اپنے لیے مقرر کر لیا تھا اس کی انجام دہی سے تمام مصیبتوں اور مخالفتوں کے باوجود وہ کسی وقت بھی غافل نہ رہا، اصلاحات کی جو اسکیم اس نے مرتب کی تھی اس پر لڑائیوں اور بغاوتوں کی کثرت سے اس کی حیات میں پوری طرح عمل درآمد نہ ہو سکا اور یہ کام اس کے فرزند و جانشین سلطان عبدالمجید خاں کے لیے ملتوی رہا، تاہم جن اصلاحات کو وہ جاری کر سکا وہ بھی اپنی اہمیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ اس کے نام کو بقائے دوام کی سند دے چکی ہیں۔

محمود کا سب سے بڑا کارنامہ ینی چری کا استیصال ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ینی چری صرف فوجی اصلاحات کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ ہر قسم کی اصلاحات کو بری نظر سے دیکھتے تھے، کیوں کہ موجودہ نظام کی ابتری ہی میں انھیں اپنا فائدہ دکھائی دیتا تھا، برخلاف اس کے محمود پر یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو چکی تھی کہ جب تک حکومت کے ہر شعبہ میں بنیادی اصلاحات جاری نہ ہوں گی سلطنت عثمانیہ روز بروز تباہی و بربادی سے قریب ہوتی جائے گی، یہی یقین تھا جس نے اصلاحات کے جاری کرنے میں اسے اس قدر متشدد بنا دیا تھا، جو شخص ان کی نکتہ چینی یا مخالفت کرتا اسے سخت سزا دی جاتی تھی، بکتاشی درویش ینی چری کے شروع سے حامی تھے، ینی چری کی طرح یہ لوگ بھی اصلاحات کے مخالف تھے، ان کے استیصال کے بعد درویشوں نے اپنے مذہبی اثر سے قسطنطنیہ کے باشندوں کو ابھارنے کی کوشش کی، محمود نے اس فرقہ کو خلافِ قانون قرار دے کر جلا وطن کر دیا اور ان کے تکیوں کو برباد کر ڈالا، بکتاشیوں کے تین بڑے بڑے پیشوا شرعی فتویٰ کی بنا پر قتل کر دیے گئے۔

ینی چری کو ختم کرنے کے بعد محمود نے قدیم فوجی نظام کو منسوخ کر دیا، چنانچہ سپاہی، سلح دار، علوفہ جی اور دوسری قدیم فوجیں ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ نئی فوجیں جو یورپ کے فوجی نظام کے مطابق مرتب اور مسلح کی گئی تھیں قایم کی گئیں، اس نے اسی

سلسلہ میں نظام جاگیری کو بھی منسوخ کر دیا، جس میں بہت زیادہ ابتری پھیلی ہوئی تھی، تیمار اور زعامت کی جاگیریں یا تو ضبط کر لی گئیں یا صرف جاگیرداروں کی مدت حیات تک کے لیے چھوڑ دی گئیں اور زمینوں کی جو آمدنی اب تک جاگیرداروں کو ملا کرتی تھی وہ اب سرکاری خزانہ کو منتقل کر دی گئی، نظام جاگیری کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر درہ بے تقریباً ہر صوبہ میں چھوٹے چھوٹے خود مختار فرماں روا بن بیٹھے، ان کی قوت کے توڑنے میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور برسوں لگ گئے، اکثر بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن محمود کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا، بالآخر اسے کامیابی ہوئی، یہاں تک کہ پوری سلطنت میں جزیرہ قبرص ہی ایک ایسا مقام رہ گیا جہاں کے درہ بے اپنے سابق اختیارات کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔

اب تک جو لوگ قتل یا جلاوطن کیے جاتے تھے، ان کی ساری املاک سلطنت کے حق میں ضبط کر لی جاتی تھی اور یہ سرکاری خزانہ کے لیے آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا جو عدالت ان معاملات کے لیے قایم تھی، چوں کہ اس میں بے عنوانیاں بہت ہونے لگی تھیں اس لیے محمود نے اسے بند کر دیا، اسی طرح اس نے پاشاؤں کے ہاتھ سے سزائے موت کے اختیارات بھی لے لیے جو انھیں اپنے علاقوں میں حاصل تھے اور جن کی بنا پر وہ ملزم کو برأت کا موقع دیئے بغیر جب چاہتے قتل کرا دیتے تھے، اس نے ایک فرمان کے ذریعہ اعلان کرا دیا کہ کوئی شخص خواہ وہ ترک ہو یا عیسائی مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کے بغیر قتل نہ کیا جائے اور ہر ملزم کو اپیل کا حق دیا جائے کہ پہلے وہ قاضی عسکر کی عدالت میں اسے پیش کرے اور اگر وہاں بھی فیصلہ اس کے خلاف ہو تو خود سلطان کے حضور میں اپیل کرے۔

سلیمان اعظم کے وقت سے ایک دستور یہ ہو گیا تھا کہ سلاطین نے دیوان میں آنا ترک کر دیا تھا، جہاں کی ساری کارروائی صدر اعظم کی صدارت میں ہوا کرتی تھی، سلطنت عثمانیہ کے منجملہ دیگر اسبابِ زوال کے ایک سبب یہ بھی تھا، محمود نے اس دستور کو توڑا اور پابندی کے ساتھ دیوان میں آنا شروع کیا۔

اوقاف کے انتظام میں بڑی بے عنوانیاں ہو رہی تھیں، اس لیے محمود نے ان

جائدادوں کو سرکاری نگرانی میں لے لیا۔

فروری ۱۸۳۴ء میں ایک فرمان شائع کر کے محمود نے ان ٹیکسوں کو منسوخ کر دیا جو سرکاری حکام دورہ کے زمانہ میں صوبوں کے باشندوں پر مدت سے لگاتے آئے تھے، اسی فرمان میں ششماہی دو قسطوں کے علاوہ محاصل کی دوسری تمام وصولی خلافِ قانون قرار دی گئی، جزیہ کی تشخیص اور وصولی میں بھی سرکاری عمال کی تعدیوں سے اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، محمود نے قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے یہ کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس کے ارکان قاضی، صوبہ کا گورنر اور اعیان یعنی ہر ضلع کے عیسائیوں کے بلدی سردار مقرر کیے گئے، مالیات میں اس نے اور بھی متعدد اصلاح جاری کیں، اس کی قطع و برید سے خود قصر سلطانی بھی نہ بچ سکا، چنانچہ محل کے تمام بے کار اور غیر مفید عہدہ دار برطرف کر دئے گئے۔

ان اہم اصلاحات کے علاوہ محمود نے لباس میں بھی بعض نمایاں اصلاحیں کیں مثلاً عمامہ کی بجائے ترکی ٹوپی پہننا، سلطنت کے ہر حصہ میں ضروری قرار دیا اور خود فرانسیسی لباس اختیار کر کے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی، فوج کے لیے یوروپین لباس پہلے ہی جاری کیا جا چکا تھا۔

محمود کو تمام رعایا خصوصاً عیسائیوں کا بڑا خیال رہتا تھا، ان کی حالت سے براہِ راست آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس نے سلطنت کے یورپی علاقوں کا دورہ کیا، ژون کیئر لکھتا ہے:

> ''اس نے مطالبات کا خیر مقدم کیا، شکایات کو سنا، حق تلفی کی دادرسی کی، سب شکووں کو دور کیا اور اپنے اس منشا کو اچھی طرح سے ظاہر کر دیا کہ اس کی تمام رعایا میں بغیر امتیاز قوم و ملت انصاف کی حکمرانی رہے گی۔(۱)

(۱) ولا ژون کیئر (ترجمہ اردو) ص ۴۶۲

سلطان عبدالمجید خان

۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء

محمود ثانی کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عبدالمجید خان سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، دولت عثمانیہ کی حالت اس وقت بہت نازک تھی، نزیب کی فیصلہ کن شکست کے بعد جس سے ابراہیم پاشا کے لیے قسطنطنیہ کا راستہ صاف ہو گیا تھا، اطلاع آئی کہ امیر البحر احمد پاشا غنیم سے مل گیا اور ترکی بیڑہ کو اسکندریہ لے جا کر محمد علی کے سپرد کر دیا، یہ خبر اس قدر وحشت اثر تھی کہ نوعمر سلطان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے محمد علی سے صلح کی گفتگو شروع کر دی، محمد علی نے صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مصر، شام، طرابلس (واقع ایشیائے کوچک) اطنہ اور کریٹ کی پاشائیاں اسے نسلاً بعد نسلٍ تفویض کر دی جائیں اور وعدہ کیا کہ اگر اس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا تو وہ ترکی بیڑہ کو سلطان کی خدمت میں واپس کر دے گا، دیوان ابھی اس مطالبہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ انگلستان، فرانس، روس، آسٹریا اور پرشا کے سفیروں نے محمد علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو اپنی حکومتوں کے مصالح کے خلاف دیکھ کر سلطان سے درخواست کی کہ ابھی کوئی جواب نہ دیا جائے، انھوں نے امید دلائی کہ دولِ عظمیٰ کے اثر سے یہ معاملہ سلطنت عثمانیہ کے مفاد کے مطابق طے کر دیا جائے گا، فرانس بظاہر اس تحریک میں شریک تھا لیکن در پردہ وہ محمد علی کا حامی تھا، چنانچہ جب ۱۵؍جولائی ۱۸۴۰ء کو دولت عثمانیہ انگلستان، روس، آسٹریا اور پرشا کے

نمایندوں نے لندن میں وہ شرایط طے کرنے چاہے جو محمد علی اور باب عالی کے درمیان صلح کی بنیاد قرار پانے والے تھے تو فرانس نے اس معاہدہ میں شرکت نہیں کی، بہر حال اتحادیوں نے محمد علی کو الٹی میٹم دیا کہ دس روز کے اندر سلطان کی اطاعت قبول کر کے اپنی فوجیں شام سے ہٹالے، جس کے معاوضہ میں مصر کی پاشائی اس کی نسل کے لیے اور شام کی پاشائی خود اس کی مدتِ حیات کے لیے مستقل کر دی جائے گی، ورنہ اگر مدتِ معینہ کے اندر اس نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو شام کی پاشائی سے اسے دست بردار ہونا پڑے گا اور مصر کی پاشائی بھی صرف اس کی حیات کے لیے محدود کر دی جائے گی، الٹی میٹم میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ اگر یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا یا اس کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو اتحادیوں کے بحری بیڑے فوراً مصر اور شام کی ناکہ بندی شروع کر دیں گے، محمد علی کو فرانس سے مدد کی توقع تھی، اس بنا پر اس نے شرایط صلح کو نامنظور کر دیا، چنانچہ انگریزی بیڑہ روس اور آسٹریا کے چند جنگی جہازوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھا، ۲۹/اگست ۱۸۴۰ء کو بیروت گولہ باری کے بعد فتح ہو گیا اور عثمانی فوجوں نے جو انگریزی جہازوں پر آئی تھی، مصری دستہ کو وہاں سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد انگریزی بیڑہ نے عکا پر گولہ باری شروع کی اور ۳/نومبر کو وہ بھی فتح ہو گیا پھر یکے بعد دیگرے شام کے دوسرے قلعے بھی محمد علی کے ہاتھ سے نکلتے گئے اور عثمانی فوجوں نے انگریزوں نیز مقامی باشندوں کی مدد سے جو تھوڑے ہی دنوں میں مصری حکومت کی سختی سے گھبرا اٹھے تھے نومبر کے آخر تک پورے شام پر اپنا تسلط قایم کیا۔

محمد علی سے صلح: شام کی فتح کے بعد انگریزی بیڑہ اسکندریہ کی طرف بڑھا، محمد علی کو اس وقت تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اتحادیوں کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا، چنانچہ اس نے امیر البحر نپیئر (Napier) سے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ترکی بیڑہ کو واپس کر دینے نیز کنیڈیا (کریٹ) اور ان چند ایشیائی علاقوں سے جو ابھی تک اس کے قبضہ میں تھے، اپنی فوجیں ہٹا لینے پر رضا مندی ظاہر کی، صلح کی گفتگو میں اتحادیوں کے علاوہ فرانس بھی

شریک ہوا، بالآخر ۲۰ رستمبر ۱۸۴۱ء کو یہ طے پایا کہ صرف مصر کی پاشائی محمد علی اور اس کے ورثہ کے لیے مستقل کردی جائے، بقیہ تمام علاقے اس کے قبضہ سے نکال لیے گئے، مصر کی سالانہ آمدنی کا ایک ربع بطور خراج مقرر کیا گیا، جو اسے ہر سال باب عالی میں پیش کرنا تھا، بعد میں چار لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم مقرر کردی گئی، اس کے علاوہ باب عالی کی طلب پر چند بحری اور فوجی دستوں کی فراہمی بھی لازمی قرار دی گئی، اس معاہدہ کے رو سے اس پر یہ پابندی بھی عاید کردی گئی کہ مصر میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھے۔

محمد علی پاشا اور باب عالی کے معاملات کے طے ہو جانے کے بعد اتحادیوں اور باب عالی کے درمیان ایک علاحدہ معاہدہ ہوا جس کے رو سے ترکی جہازوں کے علاوہ تمام دوسری حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ دردانیال اور آبنائے باسفورس میں ممنوع قرار دیا گیا، اس کے بعد بارہ سال تک دولت عثمانیہ کو کسی غیر ملکی طاقت سے جنگ پیش نہیں آئی اور امن وسکون کی اس فرصت میں سلطان کو ان اصلاحات کے جاری کرنے کا موقع ملا جن کی ابتدا سلطان محمود ثانی نے کردی تھی، وقتاً فوقتاً سلطنت کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں، لیکن سرلشکر عمر پاشا نے ہر موقع پر انھیں جلد فرو کردیا۔

خط شریف گلخانہ: سلطان محمود نے اپنی حکومت کے آخری سالوں میں اصلاحات کی ایک مکمل تجویز تیار کرلی تھی لیکن مسلسل جنگوں نے ان کے نفاذ کی مہلت نہ دی، تاہم اپنی وفات سے قبل اس نے وارثِ سلطنت شہزادہ عبدالمجید کو ان اصلاحات کی اہمیت اچھی طرح سمجھا دی تھی، چنانچہ عبدالمجید نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے چار ہی ماہ بعد اپنے قصر گلخانہ سے سلطان محمود کے تیار کردہ فرمان کا اعلان کیا جو تاریخ میں 'خط شریف گلخانہ' کے نام سے مشہور ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے سلطنت عثمانی کا اہم ترین دستور خیال کیا جاتا ہے، اس کا ملخص ترجمہ درجِ ذیل ہے:

''یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ حکومت عثمانیہ کے ابتدائی دور

میں قرآن مجید کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت وعظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثنا اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوش حالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

ڈیڑھ سو برس سے مسلسل حادثات اور مختلف اسباب سے شرع شریف اور قوانین سلطنت کی پابندی جاتی رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ قوت اور خوش حالی ضعف اور افلاس سے بدل گئی ہے کیوں کہ جو سلطنت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ہم ابتدا ہی سے ان امور پر غور کر رہے ہیں اور تخت نشینی کے روز سے آج تک فلاحِ عامہ، صوبوں کی اصلاحِ حال اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے، اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافی حالات، زمین کی زرخیزی اور باشندوں کی موزونی طبع اور ذکاوتِ فہم کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں یقین آ جائے گا کہ موثر طریقوں کے دریافت اور استعمال کرنے پر امید ہے کہ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سالوں میں حاصل ہو جائے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد اور نبی کریم ﷺ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم ونسق پیدا کرنے کی کوشش کریں، یہ قوانین خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے۔

(۱) رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

(۲) محاصل کی وصولی کا ایک باقاعدہ نظام۔

(۳) فوج کی بھرتی اور اس کی مدتِ ملازمت کی تعیین کے لیے بھی ایسا ہی با قاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت درجہ اہم ہے کیوں کہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مختلف اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لیے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے لگائے جائیں۔

اگر چہ خدا کی عنایت سے ہماری رعایا کچھ عرصہ سے اجاروں کی مصیبت سے نجات پا چکی ہے جن کو اب تک غلطی سے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تاہم ایک مہلک دستور اب بھی جاری ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں یعنی وہ مراعات جو 'التزامات' کے نام سے مشہور ہیں۔

اس نظام کے تحت صوبہ کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص کی مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا ہے کیوں کہ حاکم اگر نیک نہیں ہے تو وہ اپنے فائدے کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ ملت عثمانیہ کے ہر فرد پر اتنا ہی محصول لگایا جائے جتنا اس کی حیثیت کے موافق ہو اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بری اور بحری فوجوں کے اخراجات کی تعیین خاص قوانین کے ذریعہ کر دی جائے، اگر چہ ملک کی حفاظت کا خیال سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے

لیے سپاہی فراہم کریں، تاہم ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لیے جو ہر طبع مہیا کرے قوانین مقرر کر دیے جائیں، نیز فوجی سپاہیوں کی مدتِ ملازمت کم کر کے چار یا پانچ سال کر دی جائے، کیوں کہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کیے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا ناانصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت وحرفت کو ایک مہلک صدمہ پہنچانا ہے، اسی طرح سپاہیوں کو تمام عمر فوجی خدمت میں رکھنے کے لیے ان کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے، سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت، نہ خوش حالی نہ امن، برخلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

لہٰذا آیندہ ہر ملزم کے مقدمہ کی سماعت علانیہ طور پر ہمارے شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا علانیہ زہر دے کر یا کسی دوسرے طریقے سے مار ڈالے۔

کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو، ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال واسباب پر قابض رہے گا اور پوری آزادی کے ساتھ اسے فروخت یا منتقل کر سکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہوگا، مثلاً کسی مجرم کے بے گناہ ورثا اپنے قانونی حقوق سے محروم نہ کیے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال واسباب ضبط کیا جائے گا۔

یہ مراعات ہماری تمام رعایا کے لیے خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتی ہو یکساں طور پر جاری ہوں گی اور وہ بلا استثنا ان سے مستفید ہوگی۔

پس جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کے قانون کا تقاضا ہے سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔

دوسرے امور کے لیے چوں کہ ضروری ہے کہ اہل الرائے کے اتفاق سے طے کیے جائیں، اس لیے ہماری مجلس عدل (Council of Justice) جس میں متعین دنوں میں ہمارے وزرا اور اعیانِ سلطنت بھی شریک ہوا کریں گے، جان و مال کی حفاظت اور محاصل کی تشخیص کے متعلق بنیادی قوانین مرتب کرنے کی غرض سے منعقد ہوتی رہے گی، ان مجالس میں ہر شخص اپنے خیالات و آرا کا اظہار آزادی سے کرے گا۔

جو قوانین فوجی ملازمت سے متعلق ہوں گے ان پر مجلس حربی میں بحث ہوگی جس کا اجلاس سرعسکر کے محل میں ہوا کرے گا جس وقت کوئی قانون طے کر لیا جائے گا وہ فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس غرض سے کہ وہ ہمیشہ کے لیے قایم اور قابل نفاذ ہو جائے ہم اس کی منظوری اپنے دستِ خاص سے اس کے اوپر لکھ دیں گے۔

چونکہ ان قوانین کا مقصد تمام تر مذہب، حکومت، قوم اور سلطنت کا احیا ہے، اس لیے ہم عہد کرتے ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کریں گے جو ان کے مخالف ہو۔

اپنے اس عہد کی ضمانت کے طور پر ہمارا ارادہ ہے کہ اس

فرمان کو سلطنت کے تمام علما اور اعیان کی موجودگی میں اس ایوان میں رکھ دینے کے بعد جس میں نبی کریم ﷺ کے تبرکات رکھے ہوئے ہیں قادر مطلق کے نام پر خود بھی اس کی پابندی کا حلف لیں اور علما و اعیان کو بھی اس کا حلف دلوائیں۔

اس کے بعد علما یا اعیان میں سے کوئی شخص یا کوئی اور جو بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کرے گا اسے بلالحاظ اس کے رتبہ یا شہرت کے وہ سزا دی جائے گی جو جرم کے ثابت ہونے کی حالت میں مقرر ہے، اس کے لیے تعزیری قوانین کا ایک مجموعہ منضبط کیا جائے گا۔

چونکہ آج سے سلطنت کے تمام عہدہ داران کو معقول تنخواہیں دی جائیں گی اور جن لوگوں کی خدمات کا معاوضہ اس وقت کافی نہیں ملتا انھیں بھی ترقی دے دی جائے گی، اس لیے رشوت ستانی کے خلاف جس کی ممانعت قوانین الٰہی میں آئی ہے اور جو زوالِ سلطنت کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے، سخت قانون نافذ کیا جائے گا۔

ان قوانین سے چونکہ قدیم دستوروں کی مکمل تجدید ہوتی ہے اور وہ بالکل بدل جاتے ہیں، اس لیے یہ فرمانِ سلطانی قسطنطنیہ اور ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں شایع کر دیا جائے گا اور حلیف طاقتوں کے تمام سفیروں کو جو قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اس کی نقلیں باضابطہ طور پر بھیج دی جائیں گی تاکہ وہ ان قوانین کی مراعات کے شاہد رہیں جو خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ قایم رہیں گی۔

خدائے قدیر ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے جو لوگ ان قوانین کے خلاف کوئی بات کریں ان پر عذابِ الٰہی نازل ہو اور وہ

ہر قسم کی خوشی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔"(۱)

دستور ثانی ۱۸۵۶ء: ۲۱رفروری ۱۸۵۶ء کو سلطان عبدالمجید نے حکومت عثمانیہ کے دوسرے اہم دستور کا اعلان کیا، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"تمام رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت جو "خط شریف گلخانہ" میں کی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے، اس باب میں رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا۔

ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دیے گئے ہیں از سرِ نو توثیق کی جاتی ہے، ان حقوق و مراعات پر بلاتاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انھیں ترقی دی جائے گی اور اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی، جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کیے تھے ان میں اس جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے ہوا کرے گا۔

نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔

وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں، مقررہ تنخواہیں بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو

(۱) کریسی جلد ۶ ص ۵۵-۴۵۲

ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی، پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا، اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ کو ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقہ کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القاب و امتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں، اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے، اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

ملکی اور فوجی عہدے تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے، تقرر صرف قواعد و ضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بنا پر ہوگا۔

ہر فرقہ کو علوم و فنون کے مدارس قایم کرنے کی اجازت ہے، البتہ نصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا

جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی۔

وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں کے ہوں گے مخلوط عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے اور ان کا اجلاس برسر عام ہوا کرے گا، صوبوں اور سنجقوں کے دیوانی کے مقدمات بھی مخلوط عدالتوں میں وکیل اور قاضی کی موجودگی میں پیش ہوں گے اور ان عدالتوں کا اجلاس بھی برسرِ عام ہوگا۔

جن مقدمات میں فریقین ایک ہی فرقہ کے ہوں گے یا جو مقدمات عدالت سے متعلق ہونگے وہ فریقین کی خواہش کے مطابق یا ان کے بطریق کے سامنے پیش ہوں گے یا ان کی قومی مجلس کے۔

ایک ضابطہ تجارت و ضابطہ فوجداری نیز وہ تمام قواعدو ضوابط مخلوط عدالتوں سے متعلق ہیں حتی الامکان جلد از جلد شایع کر دیے جائیں گے اور سلطنت عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں ان سب میں ان کا ترجمہ کر دیا جائے گا۔

قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی اور معمولی جرائم کے مجرموں کے لیے نئے ضابطے مرتب کیے جائیں گے، علاوہ ان سزاؤں کے جو باب عالی کے ضابطہ پولیس کے رو سے مقرر ہوں گی اور تمام ایذائیں یک قلم منسوخ کی جاتی ہیں، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی۔

چونکہ محصولوں کے عاید کرنے میں مساوات برتی جائے گی، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقہ کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں لیکن انھیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم پیش کرنے کی اجازت بھی حاصل رہے گی۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کر کے جلد شایع کر دیے جائیں گے۔

صوبوں کی مجلسوں میں اصلاح کی جائے گی تا کہ انتخابات بہتر طریقہ پر ہو سکیں اور باشندوں کی آزاد اور صحیح رائے معلوم ہو سکے۔

چونکہ تجارتی معاملات اور غیر منقولہ جائدادوں کے قوانین تمام رعایا کے لیے یکساں ہیں اس لیے باب عالی جب غیر حکومتوں سے کوئی ایسا معاملہ کرے گا جس کے رو سے غیر ملکی باشندوں کو سلطنت کے ان قوانین کو تسلیم کر کے اسی حساب سے محصول ادا کرنا ضروری ہوگا جس حساب سے ملکی باشندے ادا کرتے ہیں تو ایسی صورت میں غیر منقولہ جائدادوں کی ملکیت حاصل کرنے کا حق بھی غیر ملکی باشندوں کو عطا کیا جائے گا۔

ٹھیکہ داروں کی وساطت سے عشر اور دوسرے محصولوں کے وصول کرنے کا جو طریقہ اب تک رائج تھا وہ موقوف کیا جاتا ہے، آیندہ جہاں تک ممکن ہوگا حکومت کے عہدہ دار براہِ راست وصول کیا کریں گے۔

مقامی محصولوں کی تشخیص حتی الامکان اس طرح کی جائے گی کہ پیداوار اور تجارت کی ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔

صوبوں میں محصول ان امور کے لیے عاید کیے جائیں گے جو سب کے لیے مفید ہوں مثلاً سڑکوں کی تعمیر جو اندرون ملک کے علاوہ سمندر کے ساحل تک چلی جائیں گی۔

ہر عہدہ دار کی تنخواہ متعین کر دی جائے گی۔

عیسائی اور دوسرے فرقوں کے معاملات کی نگرانی کے لیے

ایک ایک افسر مقرر ہوگا جو اپنے مشوروں سے اسٹیٹ کونسل کو مدد دے گا، یہ افسر صدر اعظم کی مجلس وزرا میں سے منتخب کیے جائیں گے اور ان کا تقرر ایک سال کے لیے ہوا کرے گا۔

اسٹیٹ کونسل کے ممبروں کو معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں اپنی رائے آزادانہ طور پر ظاہر کرنے کی اجازت ہوگی اور ان پر اس کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے گا۔

رشوت ستانی کے قوانین بلا امتیاز تمام رعایا کے لیے یکساں طور پر نافذ ہوں گے، خواہ اس کے مجرم کسی طبقہ یا رتبہ کے اشخاص ہوں۔

باب عالی مالی اعتبار کے قایم کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کرے گا اور جن چیزوں سے اس اعتبار کو تقویت ہوتی ہے مثلاً بنک وغیرہ ان کو فروغ دے گا اور ان کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا۔

باب عالی ملکی پیداوار کے نقل وحمل کے لیے سڑکیں اور نہریں تعمیر کرائے گا اور تمام رکاوٹوں کو دور کر کے زراعت کی ترقی میں آسانیاں بہم پہنچائے گا۔''(۱)

دیگر اصلاحات: مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ سلطان عبدالمجید نے بعض دوسری اہم اصلاحات بھی جاری کیں، ۱۸۴۶ء کے فرمان کے رو سے ایک مجلس تعلیم عامہ مقرر ہوئی ایک جدید یونی ورسٹی کا قیام طے پایا، تعلیم کی نگرانی علما کے ہاتھوں سے نکال کر مجلس تعلیم کے سپرد کر دی گئی اور جو مکاتب مسجدوں میں قایم تھے انھیں بھی اس مجلس کے زیر اہتمام ابتدائی مدارس بنا دیا گیا، دوسری اہم اصلاح بردہ فروشی کے متعلق ہوئی چونکہ بردہ فروشی کا رواج تمام سلطنت میں عام طور پر تھا، اس لیے دفعتاً اس کو ممنوع قرار دینے میں

(۱) کریسی جلد ۲ ص ۲۶۰-۲۵۷

عام برہمی کا اندیشہ تھا مگر باب عالی نے ایسے قوانین نافذ کر دیے جن سے بردہ فروشی میں بیش از بیش مشکلات پیدا ہوتی گئیں، علاوہ بریں ۱۸۵۷ء میں سلطان نے ایک فرمان جاری کر کے اپنے حدودِ سلطنت میں دوسرے ملکوں سے غلاموں کا لانا بھی ممنوع قرار دے دیا، اس فرمان پر اگر سختی سے عمل درآمد شروع کر دیا جاتا تو نہ صرف بردہ فروشی کا استیصال ہو جاتا بلکہ غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد بھی کم ہوتے ہوتے ایک روز سلطنت عثمانیہ سے بالکل مفقود ہو جاتی کیوں کہ ترکی میں یہ دستور عرصہ سے چلا آتا تھا کہ چند سال کی خدمت کے بعد غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کر دیتے تھے اور چوں کہ اب جنگ میں اسیروں کے حاصل ہونے کا امکان کم رہ گیا تھا اور دوسرے ملکوں سے خرید کر لانا خلافِ قانون تھا، اس لیے غلامی کا سلسلہ جلد منقطع ہو جاتا۔

فوجی اصلاحات: سب سے زیادہ اہم فوجی اصلاحات تھیں، ''خط شریف گلخانہ'' کے اعلان کے بعد ہی فوج کی بھرتی کا باقاعدہ نظام قایم کر دیا گیا تھا لیکن نظامِ جدید کے مطابق فوج کی ترتیب ۱۸۴۳ء میں مکمل ہوئی جب رضا پاشا سرعسکر تھا، فوج دو حصوں میں تقسیم کی گئی، ایک نظام دوسری ردیف، نظام وہ فوج تھی جو میدانِ جنگ میں رہا کرتی تھی ردیف وہ تھی جو میدانِ جنگ کی معینہ مدت ختم کرنے کے بعد آیندہ ضرورتوں کے لیے مستعد رکھی جاتی تھی، ہر ضلع سے ایک مقررہ تعداد فوج کی لی جاتی تھی، جس میں بیس سال سے زیادہ عمر کے لوگ بھرتی کیے جاتے تھے، اس تعداد میں ایک حصہ رضا کاروں کا ہوتا تھا بقیہ حکومت کی طرف سے بھرتی ہوتے تھے، نظام فوج میدانِ جنگ میں پانچ سال رکھی جاتی تھی، اس کے بعد سپاہیوں کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی جاتی تھی لیکن انھیں واپسی کے بعد بھی سات سال تک اپنے ضلع کی ردیف میں شامل رہنا پڑتا تھا، کسی جنگ یا ضرورتِ ناگہانی کے موقع پر ردیف کو پھر طلب کیا جا سکتا تھا۔

اصلاحات کا اثر: سلطنت عثمانیہ کو ان تمام اصلاحات کی جس حد تک ضرورت تھی اس کا اندازہ ان بے عنوانیوں سے ہو سکتا ہے جو حکومت کے ہر شعبہ میں روز بروز بڑھتی جاتی

تھیں اور اختلال و بدنظمی پیدا کر کے سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر رہی تھیں لیکن چونکہ ان اصلاحات سے غیر متدین اور ظالم عہدہ داروں کو نقصان پہنچتا تھا اور فوج کی سرکشی کا بھی سد باب ہو رہا تھا اس لیے ان کے خلاف مختلف صوبوں مثلاً البانیا، کردستان اور بوسنیا وغیرہ میں بغاوتیں برپا ہو گئیں، خوش قسمتی سے باب عالی کی خدمت کے لیے عمر پاشا کا سا بے نظیر جنرل موجود تھا جس کی غیر معمولی شجاعت اور دانش مندی نے نہ صرف ان بغاوتوں کا استیصال کیا بلکہ باغیوں کو اصلاحات کے قبول کرنے پر بھی راضی کر لیا، اس طرح محمد علی سے صلح کے بعد سے جنگ کریمیا کے شروع ہونے تک باب عالی کو بارہ سال کی مہلت اصلاحات کے جاری کرنے کے لیے مل گئی، اس مدت میں سلطنت کی تجارتی اور عام خوش حالی میں نمایاں طور پر روز افزوں ترقی ہوتی گئی، جس کے آثار سلطان محمود کی حکومت کے آخری سالوں میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے، چنانچہ ۱۸۵۳ء میں لارڈ پامرسٹن (Palmerston) نے نہایت پرزور الفاظ میں اپنی اس رائے کا اظہار پارلیمنٹ میں کیا کہ جتنی ترقی و اصلاح سلطنت عثمانیہ نے گذشتہ سالوں میں کی ہے کسی دوسری حکومت نے نہیں کی۔(۱)

دولت علیہ کی یہ ترقی روس کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی، لیکن سلطان عبدالمجید کی دانش مندانہ روش نے کسی آویزش کا موقع نہ دیا، البتہ ۱۸۴۹ء میں جب روس اور آسٹریا کی متحدہ فوجوں نے ہنگری کی جنگ آزادی کا خاتمہ کر دیا اور ہنگری کے بہت سے فوجی سردار بھاگ کر ترکی میں پناہ گزیں ہوئے تو روس اور آسٹریا دونوں نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ ان سرداروں کو فوراً سلطنت عثمانیہ سے نکال دیا جائے ورنہ جنگ ناگزیر ہو جائے گی، یہ موقع بہت نازک تھا، باب عالی جنگ کے لیے تیار نہ تھا، اس کی فوجوں کی تنظیم نظامِ جدید کے مطابق ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، تاہم سلطان نے گوارا نہ کیا کہ ان سرداروں کو جنھوں نے اس کی سلطنت میں آ کر پناہ لی تھی دشمنوں کے حوالہ کر دے، اس

(۱) کریسی جلد۲ ص ۲۶۵

نے روس اور آسٹریا کی دھمکیوں کے باوجود ان سرداروں کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ روس اور آسٹریا نے باب عالی سے سفارتی تعلقات منقطع کر دیئے اور کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ بہت جلد شروع ہو جائے گی، لیکن انگلستان اپنے سفیر سر اسٹراٹفرڈ کیننگ (Sir Stratford Canning) کے مشورہ کے مطابق جو قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور اپنے اخلاق و فراست کی وجہ سے سلطان کے مزاج میں بہت کچھ دخل رکھتا تھا، یہ اعلان کیا کہ اگر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا گیا تو انگلستان اس کی مدد کرے گا اور اس اعلان کے بعد نومبر ۱۸۴۹ء میں ایک برطانوی بیڑہ دولت علیہ کی حمایت کے لیے دردانیال میں پہنچ بھی گیا، روس اور آسٹریا نے انگلستان کا یہ طرز عمل دیکھ کر جنگ چھیڑنا مناسب نہیں خیال کیا اور دونوں نے باب عالی سے سفارتی تعلقات جو کچھ دنوں کے لیے منقطع ہو گئے تھے پھر قایم کر لیے۔

سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز: اس واقعہ سے روس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی قدم انگلستان کی حمایت کے بغیر کامیابی کے ساتھ اٹھایا نہیں جا سکتا، لہٰذا نکولس نے اب حکومت برطانیہ کو ملانے کی تدبیر شروع کی، اس سے قبل بھی ۱۸۴۴ء میں جب وہ انگلستان گیا تھا تو برطانوی وزیروں سے ترکی کے مستقبل کے متعلق گفتگو کی تھی، لیکن چونکہ اس گفتگو کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اس لیے اب اس نے زیادہ موثر طریقہ پر کوشش شروع کیا اور اوائل ۱۸۵۳ء میں سر ہملٹن سیمور (Sir Harnilton Seymour) برطانوی سفیر مقیم سینٹ پٹرس برگ سے خود گفتگو کر کے انگلستان اور روس کے درمیان سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک تجویز پیش کی، اس نے سیمور اور وزارتِ برطانیہ کو یقین دلانا چاہا کہ "یورپ کا مرد بیمار" عنقریب دم توڑنے والا ہے، اس لیے بجائے اس کے کہ اس کی موت کا ناگہانی واقعہ اور اس کے ترکہ کی تقسیم بین الاقوامی آویزش کا سبب بنے مناسب ہے کہ اس مسئلہ کا تصفیہ پہلے ہی کر لیا جائے، مصر اور کریٹ چونکہ انگلستان کے لیے زیادہ موزوں تھے، اس لیے نکولس نے یہ دونوں صوبے اسی کے حصہ میں رکھے،

روس کے لیے مولڈیویا، ولاچیا، سرویا اور بلغاریہ کا قبضہ زیادہ مناسب معلوم ہوا، چنانچہ نکولس نے سیمور سے کہا کہ "مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستیں حقیقتاً میرے زیر تحفظ ایک خود مختار مملکت ہیں، ان کی حیثیت بدستور قایم رہے گی، سرویا کو بھی ویسا ہی دستور حکومت دے دیا جائے، اسی طرح بلغاریا کو بھی''، سب سے زیادہ اہم قسطنطنیہ کا مسئلہ تھا، نکولس نے صاف الفاظ میں کہا کہ قسطنطنیہ پر نہ انگلستان کا قبضہ ہونے پائے گا نہ فرانس کا اور نہ کسی دوسری بڑی طاقت کا، خود روس کے متعلق بھی اس نے یہی فیصلہ کیا، البتہ اتنا کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ضرورت مجبور کرے گی تو چند دنوں قسطنطنیہ پر روسی فوجیں قابض رہیں گی، غرض اس تمام گفت وشنید کا خلاصہ یہ تھا کہ روس اور انگلستان مل کر سلطنت عثمانیہ پر جلد از جلد حملہ کردیں اور اسے آپس میں بانٹ لیں، لیکن حکومت برطانیہ نے زار کی یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کردیا، نکولس بہرحال حملہ کی پوری تیاریاں کرچکا تھا اور صرف موقع کا منتظر تھا۔

جنگ کریمیا کے اسباب: یہ موقع جلد ہاتھ آگیا، فلسطین کے مقامات مقدسہ کا مسئلہ ۱۸۵۱ء میں پھر سامنے آگیا تھا، فرانس اور روس لاطینی اور یونانی کلیسا کے عیسائیوں کی نمایندگی کررہے تھے اور ہر ایک اپنے کو بیت المقدس اور دوسرے مقامات کے تحفظ کا مستحق قرار دیتا تھا، یہاں تک تو معاملہ زیادہ اہم نہ تھا لیکن ان مقامات کے تحفظ کے علاوہ فریقین نے اب ان تمام عیسائیوں کے تحفظ کا دعویٰ بھی پیش کیا جن کا تعلق لاطینی اور یونانی کلیساؤں سے تھا، اس دعویٰ کے قبول کرنے کے یہ معنی تھے کہ سلطان کو یورپ میں اپنی نصف سے زیادہ رعایا کی فرماں روائی کے حق سے دست بردار ہوجانا پڑتا، چنانچہ باب عالی نے فرانس اور روس کے اس حق کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کردیا، فرانس نے بالآخر یہ تسلیم کیا کہ اسے صرف انہی رومن کیتھولک فرانسیسیوں کے تحفظ کا حق حاصل ہے جو سلطنت عثمانیہ میں مقیم ہیں، لیکن روس اپنے دعویٰ پر قایم رہا اور شہزادہ مین شی کوف (Menschi Kolf) نے قسطنطنیہ پہنچ کر ان سب عیسائی رعایا کی حفاظت کا مطالبہ پیش

کیا جو کلیسائے یونان کی پیرو اور سلطنت عثمانیہ میں آباد تھی، یہ مطالبہ اس سے قبل بھی روس کی طرف سے دوبار پیش کیا جاچکا تھا، لیکن باب عالی نے انتہائی مصیبتوں کے باوجود اسے کبھی منظور نہیں کیا، ایک بار روس نے اسے صلح نامہ کینارجی کی گفت وشنید کے درمیان پیش کیا تھا، جس سے زیادہ سخت شرائط پر دولت عثمانیہ نے اس سے قبل کوئی صلح نہیں کی تھی پھر دوسری بار یہی مطالبہ ۱۸۰۵ء میں سلطان سلیم کے سامنے پیش کیا گیا اور سلطان کے انکار پر چند ہی دنوں بعد روسی جنرل میکلسن (Michelson) نے مولڈیویا اور ولاچیا پر قبضہ کرلیا، یہ دونوں مواقع دولت علیہ کے لیے نہایت نازک تھے مگر اس نے روس کو صاف جواب دے دیا تھا، اس مسئلہ کے متعلق باب عالی اور روس کے درمیان جو معاہدات ہو چکے تھے ان کا خلاصہ صرف یہ تھا:

(۱) زائر، پادری اور مسافر محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کر سکتے ہیں۔

(۲) سفارت کے موجودہ گرجا کے علاوہ قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ میں چند جدید گرجے تعمیر کیے جاسکتے ہیں، اسی قسم کی اجازت اس صلح نامہ میں بھی دی گئی تھی جو ۱۷۴۰ء میں فرانس سے ہوا تھا۔

(۳) شہنشاہ روس نہیں بلکہ باب عالی بدستور سابق سلطنت عثمانیہ میں مذہب عیسوی کا محافظ رہے گا، شہنشاہ روس کو صرف اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ کلیسائے یونان اور اس کے عہدہ داروں کی نسبت باب عالی میں معروضات پیش کرے اور ان معروضات پر توجہ کرنا باب عالی کے لیے صرف دوستی کی بنا پر ضروری ہوگا۔

اعلانِ جنگ: لیکن روس نے جو مطالبات اب پیش کیے وہ مذکورہ بالا معاہدوں سے بہت زیادہ تھے، سلطان عبدالمجید نے انھیں منظور کرنے سے یکسر انکار کردیا، اس پر روسی سفیر شہزادہ مین شی کوف فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہوگیا اور باب عالی اور روس کے سفارتی تعلقات منقطع کردئے گئے، ۳ر جولائی ۱۸۵۳ء کو روسی فوجیں دریائے پرتھ کو عبور کر کے

مولڈیویا اور ولاچیا پر قابض ہوگئیں، یکم اکتوبر کو باب عالی نے بھی اعلانِ جنگ کر دیا، ترکی فوج نے عمر پاشا کی قیادت میں دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور ۴رنومبر کو اولٹے نٹزا (Oltenitza) اور ۵رکو سائٹیٹ (Citate) کے معرکہ میں روسیوں کو شکست دی، ان معرکوں سے تمام یورپ کو ان اصلاحات کی کامیابی کا اندازہ ہوگیا جو دولت علیہ کے فوجی نظام میں جاری کی گئی تھیں۔

انگلستان اور فرانس کی حمایت: اسی درمیان میں ۲۲راکتوبر کو انگلستان اور فرانس کے جنگی بیڑے باب عالی کی حمایت میں دردانیال میں داخل ہوئے، صلح کی گفتگو بھی جاری تھی لیکن جب ۳۰رنومبر کو روسی بیڑے نے سباسٹوپول سے نکل کر دفعۃً ترکی بیڑے پر حملہ کر کے اسے غرق کر دیا جو ایشیائے کوچک کے ساحل پر سینوپ کی بندرگاہ میں لنگر انداز تھا تو انگلستان اور فرانس کو یقین ہوگیا کہ جنگ کے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ اتحادی بیڑے فوراً بحر اسود میں پہنچ گئے اور ۲۸رمارچ ۱۸۵۴ء کو انگلستان اور فرانس نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا، ان حکومتوں نے اپنی فوجیں قسطنطنیہ بھیجیں، جہاں سے وہ وارنا کو روانہ کر دی گئیں، تاکہ مولڈیویا اور ولاچیا سے روسی فوجوں کو نکالنے میں ترکوں کی مدد کریں۔

۱۸۵۴ء کے اوائل میں ایک روسی فوج نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سلسٹریا کا محاصرہ کر لیا جو کوہِ بلقان اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک نہایت اہم قلعہ تھا لیکن ترکوں نے موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں بڑی شجاعت اور جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو بہت کچھ جان و مال کا نقصان اٹھانے کے بعد آخر کار ۲۵رجون کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اس شکست کے بعد روسی فوج ڈینوب کو دوبارہ عبور کر کے واپس چلی گئی، ترکوں نے تعاقب کیا، محاذ جنگ اب مولڈیویا اور ولاچیا میں قایم ہونے والا تھا کہ حکومت آسٹریا درمیان میں آگئی، یہ دیکھ کر کہ ان ریاستوں میں روسیوں کا قیام آسٹریا کے لیے خطرہ سے خالی نہیں، اس نے صاف الفاظ میں روس کو متنبہ کر دیا کہ اگر مولڈیویا اور ولاچیا سے فوجیں ہٹا نہ لی جائیں گی تو آسٹریا کو مجبوراً اتحادیوں کا ساتھ دینا

پڑے گا، زار دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس نے بادلِ ناخواستہ اپنی فوجیں ہٹالیں اور وہ دریاے پرتھ کو عبور کر کے پھر سرحد روس میں واپس چلی آئیں، محاربین کی مفاہمت سے آسٹروی فوجوں کو چند دنوں ان ریاستوں پر قابض رہنے کی اجازت دی گئی۔

سباسٹوپول کی فتح: روس کی بری طاقت کی طرف سے دولت عثمانیہ کو اب کوئی خطرہ نہ تھا لیکن اس کی بحریک قوت پر ابھی تک کوئی زد نہیں پڑی تھی، سباسٹوپول کا زبردست بحری سلح خانہ دولت علیہ کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے کریمیا پر حملہ کرنا ضروری تھا، سباسٹوپول کریمیا کا نہایت مستحکم بندرگاہ تھا، اسے برباد کردینے سے روس کی بحری طاقت پر ایک کاری ضرب پڑسکتی تھی، اس لیے اتحادیوں نے اب سباسٹوپول کو اپنا مقصود بنایا، ان کی فوجیں یوپٹوریا (Eupatoria) کے قریب ساحل پر اتر کر ۱۴ رستمبر ۱۸۵۴ء کو اس شہر پر قابض ہوگئیں، پھر ۲۰ رستمبر ۱۸۵۴ء کو جنگ الما (Alma) میں روسی فوج کو شکست دی، جس کے بعد سباسٹوپول کا راستہ کھل گیا، سباسٹوپول کا محاصرہ ایک سال تک قایم رہا اور ۸ رستمبر ۱۸۵۵ء کو اتحادیوں کی فتح پر ختم ہوا، اس طویل مدت میں فریقین نے شجاعت وجاں بازی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔

سقوط قارص: ایشیا میں روسی فوجوں کو پے در پے متعدد فتوحات حاصل ہوئیں لیکن قارص پہنچ کر انھیں رک جانا پڑا اور محاصرہ کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا، ترکوں نے بڑی بہادری کے ساتھ مدافعت کی اور ۲۹ رستمبر کو جنرل موراویف کی فوج کو زبردست شکست دی، لیکن محاصرہ قایم رہا، چوں کہ باہر سے مدد نہ پہنچ سکی اور سامانِ رسد بالکل ختم ہو چکا تھا اس لیے مجبور ہو کر محصورین کو ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

صلح کی گفتگو: سباسٹوپول کا محاصرہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۲ رمارچ ۱۸۵۵ء کو زار نکولس کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا الکزنڈر ثانی تخت نشین ہوا، الکزنڈر نے بھی اگرچہ یہ اعلان

کیا تھا کہ وہ پیٹر اعظم، کیتھرائن اور نکولس کے نقش قدم پر چلے گا، تاہم سباسٹوپول کی تسخیر اور اتحادیوں کے بڑھے ہوئے حوصلوں سے اس کو اندازہ ہو گیا کہ جنگ کو جاری رکھنا روس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں، چنانچہ جب آسٹریا کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر شروع ہوئی اور شرایط صلح پر غور کرنے کے لیے ویانا میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی تو روس کو بہت کچھ لیت و لعل کے بعد راضی ہونا ہی پڑا، صلح نامہ کی ترتیب کے لیے پیرس کا مقام منتخب ہوا، ۲۵ رفروری ۱۸۵۶ء کو دولت عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس آسٹریا اور سارڈینا کے نمایندے وہاں مجتمع ہوئے، سارڈینا جنگ کے آخری دور میں اتحادیوں کا شریک ہو گیا تھا، آسٹریا ثالث بالخیر کی حیثیت سے اس کانفرنس کی کارروائیوں میں شروع ہی سے پیش پیش تھا، آخر میں پرشا کو بھی شریک کر لیا گیا تھا، ایک ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ۲۳ ر رجب ۱۲۷۲ھ مطابق ۳۰ ر مارچ ۱۸۵۶ء کو صلح نامہ پیرس مرتب ہوا اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمایندوں نے اس پر دستخط کر دیے۔

صلح نامہ پیرس: اس صلح نامہ کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں:

(۱) ان حکومتوں نے دولت عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلس دولِ یورپ کا رکن بنا لیا اور اس کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کے لیے متحدہ طور پر ضمانت کی۔

(۲) سلطان نے بلا امتیاز نسل و مذہب تمام رعایا کی اصلاحِ حال کا وعدہ کیا اور یوروپین حکومتوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر انھیں کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(۳) بحر اسود تمام قوموں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا، لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا، روس اور دولت علیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قایم کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

(۴) وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں فریقین نے فتح کر لیے تھے واپس کر دیے گئے، چنانچہ قارص دولت علیہ کے حوالہ کر دیا گیا اور کریمیا روس کے۔

(۵) ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں دریاے ڈینوب بھی تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھول دیا گیا۔

(۶) جنوبی بسرابیا کا علاقہ جس پر روس نے قبضہ کرلیا تھا، مولڈیویا میں شامل کردیا گیا، مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں پر باب عالی کی فرماں روائی بدستور قایم رکھی گئی، روس ان ریاستوں کی حمایت کے حق سے جس کا وہ بلاشرکت غیرے دعویدار تھا، دست بردار ہوگیا اور ان کے حقوق کا تحفظ مذکورہ بالا حکومتوں نے مجموعی طور پر اپنے ذمہ لے لیا، ان ریاستوں کو حکومت خوداختیاری کے حقوق عطا کیے گئے، انھیں مذہب، قانون سازی اور تجارت کی پوری آزادی اور ایک 'قومی مسلح فوج' رکھنے کی اجازت دی گئی۔

(۷) سرویا کو بھی یہی حقوق دیے گئے، البتہ 'قومی فوج' رکھنے کی اجازت اسے نہ ملی، اس کے اندرونی معاملات میں باب عالی کی فوجی مداخلت دول یورپ کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دی گئی۔

ضمنی معاہدے: صلح نامہ پیرس کے تکملہ کے بعد اسی روز دو معاہدے اور مرتب ہوئے، ایک کے رو سے ۱۸۴۱ء کے معاہدہ کی تجدید کی گئی اور دردانیال اور آبناے باسفورس میں غیر حکومتوں کے جنگی جہازوں کا داخلہ بند کردیا گیا، دوسرا صرف زار اور سلطان کے درمیان ہوا جس کی بنا پر ہر فریق کو چھ چھوٹے اسٹیمر اور چار ہلکی کشتیاں بحر اسود کی ساحلی ضروریات کے لیے رکھنے کی اجازت دی گئی، ۱۵/اپریل کو ایک عہد نامہ اور ہوا جس میں برطانیہ، آسٹریا اور فرانس نے مجموعی اور انفرادی طور پر دولت عثمانیہ کی آزادی اور سالمیت کو قایم رکھنے کی ضمانت لی اور عہد کیا کہ صلح نامہ پیرس کے کسی جزو کی خلاف ورزی جنگ کا سبب قرار دی جائے گی۔

صلح نامہ پیرس پر ایک نظر: صلح نامہ پیرس نے بظاہر روس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ڈیڑھ سو برس سے اس کے پیش نظر تین خاص مقاصد تھے، جن کے حصول کے لیے وہ مسلسل کوشش کرتا آرہا تھا: (۱) بحر اسود میں اپنی جنگی اور تجارتی برتری قایم کرنا

(۲) بحر روم میں نکلنے کے لیے ایک آزاد اور محفوظ راستہ حاصل کرنا (۳) باب عالی سے اس امر کو تسلیم کرالینا کہ روس کو دولت علیہ کی عیسائی رعایا کے سیاسی اور مذہبی حقوق کی نگہداشت کا حق حاصل ہے، وقتاً فوقتاً فرماں روایانِ روس خصوصاً زارینہ کیتھرائن خود سلطنت عثمانیہ کی تقسیم اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب بھی دیکھتے آئے تھے، صلح نامہ پیرس نے نہ صرف اس خواب کو پریشان کر دیا بلکہ ان مذکورہ بالا منصوبوں کی راہ میں بھی سخت رکاوٹیں پیدا کر دیں جو پیٹر اعظم کے زمانہ سے الگزنڈر ثانی کے عہد تک حکومت روس کے اہم ترین مقاصد تھے۔

تاہم یہ رکاوٹیں زیادہ دنوں تک قایم نہ رہیں، ۱۸۷۰ء میں روس نے صلح نامہ پیرس کی خلاف ورزی کا اعلان کرتے ہوئے بحر اسود میں جنگی جہازوں کے ذریعہ اپنا تسلط پھر قایم کر لیا اور ۱۸۷۸ء میں بسرابیا کا وہ علاقہ جو ۱۸۵۶ء میں اس سے لے کر مولڈیویا میں شامل کر دیا گیا تھا واپس لے لیا، اس وقت دولِ عظمیٰ میں سے کسی نے بھی صلح نامہ پیرس کی پروانہ کی، جس کے رو سے متفقہ طور پر انھوں نے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کی ضمانت کی تھی۔

صلح نامہ پیرس میں دولِ عظمیٰ نے دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا تھا، ایک تو یہ کہ سلطنت عثمانیہ کی آزادی اور اس کے مقبوضات کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے گا، دوسری یہ کہ اس کے اندرونی معاملات میں مطلق مداخلت نہ کی جائے گی لیکن بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہی دو چیزیں تھیں جن کی خلاف ورزی صلح نامہ کے بعد سب سے پہلے کی گئی، بادی النظر میں یوروپین حکومتوں کا روس کے جارحانہ اقدام کے خلاف متحدہ ہو جانا دولت عثمانیہ کی حمایت اور ہمدردی پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت خود ان کے مفاد کے لیے خطرناک ثابت ہو رہی تھی اور اسے قابو میں رکھنا ضروری تھا، چنانچہ جنگ کا خاتمہ جب ان کے حسب دلخواہ ہو گیا تو وہ طلسم بھی ٹوٹنا شروع ہوا جس کا ڈھانچہ صلح نامہ پیرس کی نظر فریب دفعات پر کھڑا کیا گیا تھا، مولڈیویا اور ولاچیا

کی ریاستوں میں اتحاد واستقلال کی تحریک پیدا کی گئی اور ۱۸۵۸ء میں دول یورپ کے زیر حمایت الکزنڈر کوزا (Alexander Couza) ان متحدہ ریاستوں کا پہلا امیر منتخب ہوا، باب عالی نے نزاع کو ختم کر دینے کی غرض سے اس اتحاد وانتخاب کو تسلیم کر لیا، اس کے بعد کریٹ، سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا، ہرزیگووینا اور بلغاریا میں بغاوت کی شورشیں برپا ہوئیں، ان سب علاقوں کو ان حکومتوں میں سے جنھوں نے صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے تھے کسی نہ کسی کی حمایت حاصل تھی، چنانچہ دولت علیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا جو عہد کیا گیا تھا وہ ان شورشوں کے ذریعہ پورا کیا گیا، اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ یوں وفا ہوا کہ ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جب عثمانی فوجیں روانہ کی جانے لگیں تو یورپین حکومتوں نے انھیں روکنے کی کوشش کی، جیسا کہ فرانس اور روس نے ۱۸۵۸ء میں اپنے جہاز مونٹی نگرو کے ساحل پر بھیجے تاکہ عثمانی فوجوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکیں، دولِ عظمٰی نے متفقہ طور پر سلطنت عثمانیہ کے استقلال وتحفظ کی ضمانت کی تھی لیکن استقلال وتحفظ ہی کا عذر پیش کر کے انھوں نے اس کے تقریباً تمام یورپین مقبوضات اس سے علاحدہ کر دئے، انھوں نے دولت عثمانیہ کو مجلس دولِ یورپ کا رکن بنا لیا تھا، لیکن رکنیت کے اس اعزاز سے دولت علیہ کو صرف یہ حاصل ہوا کہ اس کے اندرونی معاملات میں یورپین حکومتوں کی مداخلت روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس کے لیے مصیبتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مختلف شورشیں کریٹ: صلح نامہ پیرس کے بعد سلطان عبدالمجید کی وفات تک کسی غیر حکومت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی لیکن سفرائے یورپ کی مداخلت کے باعث سلطنت کے مختلف حصوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں، چنانچہ ۱۸۵۸ء میں کریٹ کے یونانیوں نے علم بغاوت بلند کیا، یہ فتنہ وقتی طور پر رفع کر دیا گیا، لیکن ۱۸۶۶ء میں سلطان عبدالعزیز کے دور حکومت میں زیادہ قوت کے ساتھ پھر ابھرا اور اب کی بار حکومت خود اختیاری کے مزید حقوق دے کر باغیوں کو راضی کرنا پڑا۔

جدہ پر گولہ باری: جولائی ۱۸۵۸ء میں جدہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا چند مسلمانوں نے فرانسیسی قنصل اور اس کے اسٹاف پر حملہ کر دیا، جس میں قنصل اور اس کا سکریٹری مجروح ہوا اور قنصل کی بیوی ماری گئی، فوراً ہی انگریزی اور فرانسیسی بیڑے قسطنطنیہ پہنچے، باب عالی نے اطمینان دلایا کہ مجرموں کو کافی سزا دی جائے گی لیکن چونکہ سزا میں کچھ تاخیر ہوئی اس لیے انگریزی بیڑے نے جدہ پہنچ کر نامق پاشا والی مکہ سے جو جدہ آ گئے تھے اور انھوں نے مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا، مطالبہ کیا کہ مجرموں کو فوراً پھانسی دے دی جائے ورنہ چوبیس گھنٹوں کے بعد گولہ باری شروع کر دی جائے گی، نامق پاشا کو باب عالی کے حکم کا انتظار تھا، اس لیے انھوں نے فوراً پھانسی دینے میں تامل کیا، اسپر انگریزی بیڑے نے گولہ باری شروع کر دی، اس اثنا میں اسماعیل پاشا عثمانی بیڑے کے ساتھ جدہ پہنچ گئے، انھوں نے گولہ باری بند کرا کے مجرموں کی پھانسی کا حکم سنایا، اگر اسماعیل پاشا کا بیڑا وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو جدہ تباہ ہو جاتا اور برطانیہ سے باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔

فتنۂ لبنان: ۱۸۶۰ء میں شام میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے یوروپین حکومتوں کو مداخلت کا ایک اور موقع ہاتھ آیا، لبنان میں دروزی اور مارونی دو فرقے زیادہ اقتدار رکھتے تھے، دروزی مسلمان اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے، شورش کی ابتدا مارونی کسانوں کی طرف سے ہوئی جو اپنے ہم مذہب جاگیرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، چوں کہ یہ بغاوت حقیقتاً نظام جاگیری کے خلاف تھی اس لیے دروزی شیوخ نے بھی شروع میں مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا اور نہایت تیزی سے شام کے اکثر حصوں میں پھیل گئی، خصوصاً لبنان میں اس کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے، مارونیوں نے حتی الامکان قتل و غارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن چونکہ دروزی نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اس لیے بالآخر غلبہ انھی کو حاصل ہوا اور انتقام کے جوش میں انھوں نے ہزاروں عیسائیوں کو قتل

کر ڈالا، اس میں شبہ نہیں کہ مقامی ترک دستوں نے دروزیوں کے روکنے میں سخت غفلت برتی ورنہ قتل و غارت کے وہ واقعات پیش نہ آتے جو بقول ایک عیسائی مورخ کے سلطنت عثمانیہ اور اسلام دونوں کے لیے باعث ننگ تھے، دمشق میں عیسائیوں کا قتل سب سے زیادہ ہوا، برطانوی قنصل کا بیان ہے کہ ساڑھے پانچ ہزار سے کم ہلاک نہیں ہوئے، اس موقع پر امیر عبدالقادر الجزائری (۱) نے عیسائیوں کو جو مدد کی اس کا اندازہ فرانسیسی مورخ ولاڑوں کیئر کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

> ''دمشق میں اگر عبدالقادر نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی بھی صورت نہ دکھائی دیتی، یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت بے دردی سے جنگ کی تھی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا، آگ کے شعلے پہلی ہی دفعہ بھڑکے تھے اور درماندوں کی صدا پہلی ہی دفعہ بلند ہوئی تھی کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان آپ کو ڈال دیا، ایک چھوٹی

---

(۱) ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو امیر عبدالقادر مسلسل سترہ برس تک وطن کی آزادی کے لیے لڑتے رہے، انھوں نے متعدد معرکوں میں فرانسیسی فوج کو سخت شکست دی، ان کی جاں بازی اور حیرت انگیز شجاعت کا اعتراف خود اہل فرانس نے کیا ہے، آخرکار جب ان کے سپاہیوں کی بڑی تعداد شہید ہوگئی اور غنیم کی فوج میں اضافہ ہوتا گیا تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ زیادہ مدافعت بے سود ہوگی اور حکومت فرانس کے اس وعدہ پر اعتماد کرکے کہ ان سے مطلق تعرض نہ کیا جائے گا بلکہ انھیں اجازت ہوگی کہ جہاں چاہیں چلے جائیں، ۲۳ر دسمبر ۱۸۴۷ء کو ہتھیار ڈال دیے، لیکن نپولین ثالث نے یہ وعدہ پورا نہ کیا، برخلاف اس کے انھیں قید کر دیا اور بارہ برس تک قید میں رکھا، بالآخر اس شرط پر کہ وہ الجزائر کو واپس نہ ہو جائیں گے، اس نے انھیں رہا کر دیا اور ایک لاکھ فرانک سالانہ وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیا، چنانچہ وہ ہجرت کرکے پہلے بروصہ گئے اور پھر وہاں سے دمشق آکر مقیم ہوگئے اور وہیں ۱۸۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سی فوج کے ساتھ اس نے عیسائیوں کو عوام الناس سے چھڑایا اور اپنا محل انھیں رہنے کو دیا، جو ہزار سے آگے پناہ لینے لگے اور عیسائیوں کے سکونتی مقام پر عرب سواروں کی پہرہ بندی کر دی، اس شخص نے جو مسلمان اور اولادِ پیغمبر اسلام تھا اور فرانس کا قدیم دشمن تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان خوں خوار ٹولیوں کو پسپا کیا جو اسلام اور ترکی کے لیے باعث ننگ تھیں، اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان بدقسمتوں پر پوشاک کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا جنھیں اس نے موت کے پنجے سے رہائی دی تھی، اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائی محافظین کو بیروت پہنچایا جہاں انھیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، اس کا یہ ایثار، اس کی یہ شرافت اور اس کی یہ شریفانہ بہادری ایک لمحہ کے لیے بھی کم نہ ہوئی، اس کی زندگی کا یہ صفحہ ایسا شاندار ہے جس کے آگے ایک صدی کا کارنامہ بھی مدہم پڑ جاتا ہے۔"(۱)

یہ واقعہ سن کر مسیحی یورپ کے ہر گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی، فرانس کیتھولک مارونیوں کا خاص حامی تھا، اس نے ان کی مدد کے لیے ایک فوج شام میں بھیجنی چاہی، اس اندیشہ سے کہ مبادا فرانس شام میں اپنا تسلط قایم کر لے پہلے تو برطانیہ اور دوسری حکومتوں نے یہ تجویز منظور نہ کی مگر آخر کار ۳ر اگست ۱۸۲۰ء کو سارڈینا کے علاوہ ان تمام مغربی حکومتوں نے جنھوں نے صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے تھے پیرس ہی میں یہ طے کیا کہ بارہ ہزار یوروپین فوج شام میں امن قایم کرنے کی غرض سے روانہ کی جائے، چنانچہ فرانس نے فوراً چھ ہزار فوج روانہ کی، لیکن اس فوج کے شام پہنچنے سے قبل فواد پاشا وزیر خارجہ، سلطان کے حکم سے وہاں پہنچ کر اس شورش کو رفع کر چکے تھے، ان کے حکم سے عثمانی فوج کے ایک سو گیارہ سپاہی گولی سے مارے گئے، ستاون بڑے بڑے دروزی

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از ولاڈون کیئر ترجمہ اردو جلد اول ص ۵۰۶

پھانسی پر لٹکائے گئے اور خود احمد پاشا والی دمشق کو قتل کی سزا دی گئی، اس کے بعد بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن بیٹھا جس کے فیصلہ کے مطابق سیکڑوں دروزی جلاوطن کر کے طرابلس (افریقہ) بلغراد اور ودین بھیج دیے گئے، خورشید پاشا حاکم بیروت کو موت کی سزا تجویز ہوئی لیکن بعد میں ان کو معزول کر کے قسطنطنیہ بلا لیا گیا، عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش (۱) کی رقم باب عالی کی طرف سے منظور ہوئی جو بہ اقساط ادا کر دی گئی، لبنان کی آیندہ حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے دولت عثمانیہ کے زیر سیادت خود مختار کر دیا جائے اور اس کے والی کا تقرر سلطان کی عیسائی رعایا میں سے باب عالی کی طرف سے ہوا کرے، ۵/ جون ۱۸۶۱ء کو فرانسیسی فوج شام سے روانہ ہوئی جس غرض سے یہ فوج بھیجی گئی تھی، وہ فواد پاشا کے دمشق پہنچنے کے بعد ہی پوری ہو چکی تھی، اسے نو ماہ تک شام میں قیام کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن دولِ عظمیٰ نے دولت عثمانیہ کی حمایت کا جو پیمان صلح نامہ پیرس میں باندھا تھا اس کا تقاضا یہی تھا اس کے ملکی انتظامات میں مداخلت کرنے کے لیے محض نیک مشوروں پر قناعت نہ کی جائے بلکہ حسب ضرورت فوجی مدد بھی پہنچائی جائے۔

سلطان کی وفات: ۱۷/ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۵/ جون ۱۸۶۱ء کو سلطان عبد المجید نے وفات پائی اور اس کا بھائی عبد العزیز تخت نشین ہوا۔

اس عہد کی خصوصیت: عبد المجید کا عہد حکومت دولت عثمانیہ کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس عہد میں ان اصلاحات پر عمل درآمد شروع ہوا جن کا خاکہ محمود ثانی نے تیار کیا تھا اور جو اس کی وفات کے بعد مرتب ہو کر تنظیمات کے نام سے مشہور ہوئیں، تنظیمات جدید ترکی کا سنگ بنیاد ہیں، یہ صحیح ہے کہ عبد المجید کے زمانہ میں وہ پوری طرح نافذ نہ ہو سکیں تاہم جیسا کہ خالدہ ادیب خانم نے لکھا ہے: "ان کا جتنا حصہ ہزارہا مشکلات کے باوجود عمل میں لایا گیا وہ بھی کچھ کم نہ تھا، ان پر چاہے جتنے اعتراضات کیے

---

(۱) قرش یا غرش ایک ترکی سکہ جو دو پنس سے لے کر چھ پنس تک کا ہوتا ہے۔

جائیں مگر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے ایک نہایت اہم نتیجہ برآمد ہوا یعنی جدید ترکی کی بنیاد قایم ہوگئی، انھوں نے ترکوں کی قوم کو اس قابل کر دیا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود مسمار شدہ سلطنت کی بنیادوں پر ایک نئی عمارت بنا کر رہے۔"(۱)

عبدالمجید کے عہد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ترکوں میں پہلی مرتبہ اصلاحات کی جانب میلان ظاہر ہوا، محمود کے زمانہ میں جو کچھ اصلاحات ہوئی تھیں وہ حکومت نے کی تھیں، نہ صرف یہ کہ جمہور نے ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا بلکہ ان کی مخالفت کی اور سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں برپا ہوگئیں، برخلاف اس کے عبدالمجید نے جب تنظیمات کا اعلان کیا تو ترکوں کے ہر طبقہ نے مسرت ظاہر کی، ان کے اندر یہ تبدیلی عام درسگاہوں سے زیادہ قومی ادب کے اثر سے پیدا ہوئی تھی، جس کا ذکر آیندہ صفحات میں آئے گا۔

---

(۱) ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش ص ۶۰-۵۹

سلطان عبدالعزیز

۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء

سلطان عبدالمجید کی وفات پر اس کا بھائی عبدالعزیز تخت نشین ہوا، عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان کے ذریعہ ان اصلاحات کی تکمیل کا وعدہ کیا جو محمود ثانی اور عبدالمجید نے شروع کی تھیں، چنانچہ اس نے حکومت کے نظم ونسق میں مفید اصلاحات جاری کیں، نہریں اور سڑکیں تعمیر کرائیں، زراعت اور معدنیات کو ترقی دی، ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک جدید نظام قایم کیا جو مذہبی نظامِ تعلیم سے آزاد تھا، یہ جدید مدارس ہر فرقہ کے طلبہ کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے، اس نے ایک عدالت عالیہ بھی قایم کی جس میں عیسائی اور مسلمان ججوں کی تعداد برابر تھی اور ۱۸۶۸ء میں حکومت کے انتظام کے لیے ایک کونسل آف اسٹیٹ (مجلس نظمیہ) قایم کی، اس مجلس کو قانون سازی اور انتظام دونوں کے اختیارات حاصل تھے اور اس کے ارکان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل تھے، مدحت پاشا جو اپنے تدبر، اپنی روشن خیالی اور اپنے مضبوط اخلاق کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس کے صدر مقرر ہوئے، ۱۸۴۰ء میں ایک 'ضابطۂ فوجداری' (Penal Code) اور ۱۸۵۰ء میں 'ضابطۂ تجارت' (Commercial Code) مرتب ہو چکا تھا، یہ دونوں فرانسیسی ضابطہ قوانین سے ماخوذ تھے، ۱۸۷۲ء میں ایک جدید 'ضابطہ دیوانی' مسمّٰی بہ 'مجلّہ' نافذ کیا گیا جس میں قانون

شریعت کو زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق مدون کرنے کی کوشش کی گئی، سلطان عبدالعزیز کے عہد تک غیر ملکی باشندوں کو سلطنت عثمانیہ میں اراضیات پر مالکانہ قبضہ حاصل کرنے کا حق نہ تھا، ۱۸؍جون ۱۸۶۷ء کو ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے پہلی بار انھیں سلطنت کے ہر حصہ میں علاوہ حجاز کے یہ حق دیا گیا لیکن اس حق کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ان جائدادوں کے متعلق ہر معاملہ میں انھیں سلطنت عثمانیہ کے ملکی قوانین کا پابند ہونا پڑے گا اور اپنے ملک کے قوانین سے دست بردار ہونا پڑے گا، سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو ابتدا ہی میں عبدالعزیز کے ساتھ آیا مالیات کا تھا، سلطنت کے اخراجات آمدنی سے بہت زیادہ تھے اور قرضوں کا بار بڑھتا جارہا تھا، عبدالعزیز نے سلطنت کے مصارف میں جو زیادہ تر بدانتظامی کا نتیجہ تھے حتی الامکان کمی کرنے کی کوشش کی اور اپنے ذاتی اخراجات میں بھی بہت کچھ تخفیف کردی لیکن بیرونی حکومتوں کا قرض اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ سود میں چلا جاتا تھا اور میزانیہ کا توازن کسی طرح درست نہیں ہوتا تھا۔

مالی اصلاحات کی کوشش: یوروپین حکومتوں سے قرض لینے کا سلسلہ سلطان عبدالمجید ہی کے وقت سے شروع ہو گیا تھا، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب یونان نے آزادی حاصل کرنے کے لیے علم بغاوت بلند کیا اور عیسائی حکومتیں اس کی مدد کے لیے کھڑی ہوئی تو سلطنت عثمانیہ کو نئے سرے سے جنگی سامان اور جہازوں کی تعمیر کی ضرورت پیش آئی اور چونکہ خزانہ میں کافی روپیہ موجود نہ تھا، اسلیے سلطان محمود ثانی نے ہنڈیاں جاری کی اور ۱۸۳۰ء میں پہلی بار بتیس ہزار کیسہ کی ہنڈیاں آٹھ فی صدی سالانہ سود پر آٹھ سال کے لیے جاری کی گئیں لیکن شام اور مصر کی جنگوں کی وجہ سے یہ قرض معینہ مدت میں ادا نہ ہوسکا اور اس کے بدلہ میں قرض خواہوں کو دوسری ہنڈیاں دے دی گئیں، جنگ کے مصارف اور سلطنت کے اخراجات اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ یہ دوسری ہنڈیاں بھی ادا نہ ہوسکیں، جب سلطان عبدالمجید تخت پر آیا تو اس نے مالیات کو درست کرنے کی کوشش کی

لیکن جنگ کریمیا کے کثیر مصارف کے باعث وہ مالی اصلاحات میں کامیاب نہ ہوسکا اور نہ صرف یہ کہ ملکی ہنڈیاں کے ادا کرنے کی صورت پیدا نہ ہوئی بلکہ جنگی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اسے مجبوراً بعض یوروپین حکومتوں سے قرض لینا پڑا، علاوہ بریں اندرونِ ملک میں بھی ہنڈیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، ملکی اور بیرونی قرضوں کا بار سلطنت پر زیادہ ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ۱۸۶۱ء میں سلطان عبدالعزیز تخت نشین ہوا اور اس نے فواد پاشا کو صدر اعظم مقرر کر کے جنوری ۱۸۶۲ء میں مالیہ اور میزانیہ (بجٹ) کا انتظام اس کے سپرد کیا، پھر اسی سال جون میں سلطان نے فواد پاشا کے نام ایک دوسرا فرمان جاری کیا کہ ہنڈیوں کے تمام قرضے ادا کر دئے جائیں، اس طرح کہ چالیس فی صدی رقم سونے چاندی کے سکوں میں ادا کر دی جائے اور بقیہ ساٹھ فی صدی کے لیے نئی ہنڈیاں دے دی جائیں، اس کے لیے باب عالی نے اسی لاکھ انگریزی پونڈ قرض لیے اور جب یہ رقم بھی کافی نہ ہوئی تو عثمانی بینک کے ذریعہ اسی لاکھ اور قرض لیے، چوں کہ ملکی اصلاحات کا کام جاری تھا اور اس کی وجہ سے خزانہ پر زیادہ بار پڑ رہا تھا، اس لیے اب ان بڑھتے ہوئے قرضوں کا سالانہ سود ادا کرنا بھی ناممکن ہوگیا، سلطان نے حکومت کے ہر شعبہ میں تخفیف کا حکم جاری کیا، یہاں تک کہ اپنے ذاتی مصارف بھی بہت کم کر دئے، ان تدبیروں سے اتنی گنجایش ہوئی کہ مصطفےٰ فاضل پاشا ناظرِ مال سالانہ سود ادا کر سکا لیکن اس کے بعد ہی مالیات کے متعلق صدر اعظم فواد پاشا سے اختلافِ رائے کی وجہ سے مصطفیٰ فاضل پاشا کو مستعفی ہو جانا پڑا اور اس کی جگہ کافی پاشا ناظرِ مال مقرر ہوا، کافی پاشا اور فواد پاشا نے تمام قرضوں کے لیے نئے تمسکات جاری کرنے کا فیصلہ کیا، سلطان نے اس قرارداد کے مطابق ایک فرمان جاری کیا اور چار کروڑ عثمانی گنی کے تمسکات جاری کیے گئے لیکن جب سود ادا کرنے کا وقت آیا تو خزانہ بالکل خالی تھا، اس لیے حکومت پھر مجبور ہوئی کہ نئے حصے عثمانی بنک کے ذریعہ سے پیرس اور لندن میں فروخت کرے، چنانچہ ۱۸۶۵ء میں عثمانی بنک نے بارہ فیصدی نفع پر لندن اور پیرس میں

حصے فروخت کرنا شروع کیے لیکن چونکہ حکومت کی ساکھ قایم نہیں رہ گئی تھی، اس لیے بہت کم لوگوں نے حصے خریدے اور صرف اسی قدر رقم فراہم ہوسکی کہ اس سے ضروری سود ادا کردیا گیا، اس ناکامی کو بعض اہل غرض نے فواد پاشا کی مالی بدانتظامی کے ثبوت میں سلطان کے سامنے پیش کیا، چنانچہ سلطان نے فواد پاشا کو معزول کرکے ۴؍جون ۱۸۶۶ء کو محمد رشدی پاشا کو صدراعظم مقرر کیا، رشدی پاشا نے دوبارہ کوشش کی کہ ایک بڑی رقم قرض لے کر تمام موجودہ قرضوں کو ادا کردیں مگر کامیابی نہیں ہوئی، اس کے بعد رشدی پاشا نے عثمانی بنک سے یہ معاملہ کیا کہ بنک سلطنت کے بعض خاص قرضوں کا سود ہر تیسرے مہینہ ادا کرتا رہے اور اس کے معاوضہ میں سلطنت کی بعض متعین آمدنیاں بنک کو ملتی رہیں، اس طرح سود رفتہ رفتہ ادا ہونے لگا اور سلطنت دیوالیہ ہونے سے بچ گئی، اس کے بعد بغیر نئے حصے کھولے ہوئے حکومت اپنی ضروریات کے لیے بنکوں سے قرض لینے لگی۔(۱)

سیاسی فتنے، رومانیا: جب سلطنت کی مالی حالت روبہ اصلاح ہونے لگی تو سیاسی فتنے اٹھ کھڑے ہوئے، ۱۸۶۷ء میں ولاچیا اور مولڈیویا کی ولایتوں نے باضابطہ طور پر متحد ہوکر رومانیا کی ریاست قایم کرلی اور ۱۸۶۸ء میں جرمن شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا فرماں روا منتخب کیا، یہ کارروائی 'صلح نامہ پیرس' کے مخالف تھی، لارڈ ایورسلے لکھتا ہے کہ دولِ عظمیٰ کو اس بات کی فکر تھی کہ حتی الامکان باب عالی کو آویزش سے بچایا جائے، اس لیے ان کے سفیروں نے سلطان پر دباؤ ڈال کر شہزادہ چارلس کو اس نئی ریاست کا موروثی فرماں روا تسلیم کرالیا(۲) دولِ عظمیٰ کی یہ خیراندیشی کوئی نئی چیز نہ تھی، باب عالی کو اس کا تجربہ اس وقت سے ہوتا آیا تھا جب سے دولت علیہ کا زوال شروع ہوا، جوں جوں سلطنت کمزور ہوتی گئی یوروپین سلطنتوں کی دردمندی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، رومانیا پر اگرچہ سلطان کی فرماں روائی نام کے لیے باقی رہی تاہم عملاً وہ گویا آزاد ہوگیا، شہزادہ

(۱) تاریخ دولت عثمانیہ از محمد فرید بک ص ۹۵-۲۹۴ (۲) لارڈ ایورسلے ص ۳۱۳

چارلس چونکہ پرشا کے شاہی حکمراں خاندان کا ایک فرد تھا اس لیے اس کا انتخاب رومانیا کی آزادی کا بڑی حد تک ضامن تھا۔

سرویا کا استقلال: سلطنت عثمانیہ سے متعلق دولِ عظمیٰ کی یہی خیراندیشی سرویا کے معاملہ میں بھی ظاہر ہوئی، صلح نامہ پیرس کے رو سے دولت علیہ کو بلغراد اور سرویا کے تین دوسرے قلعوں میں فوجی دستے رکھنے کا حق حاصل تھا، سرویا میں ترکوں کی گذشتہ حکومت کا اتنا ہی نشان اور باقی رہ گیا تھا لیکن دول عظمیٰ کی سرپرستی میں اہل سرویا نے اس نشان کو بھی مٹادینے کا فیصلہ کرلیا اور باب عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں ان قلعوں سے نکال لے، باب عالی نے معاہدۂ پیرس کی بناپر انکار کیا اور سرویا کو جنگ کی دھمکی دی، لیکن چونکہ اسی زمانہ میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت برپا تھی اور باب عالی کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول تھی اس لیے دولِ عظمیٰ کے سفیروں کا دوستانہ مشورہ قبول ہی کرنا پڑا اور مارچ ۱۸۶۷ء میں ترکی فوجیں بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں سے واپس بلالی گئیں، اب سرویا کا استقلال مکمل ہوگیا اور اس کے امیر نے بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا۔

کریٹ کی بغاوت: کریٹ کی بغاوت یونان کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی، یونان اس جزیرہ کو اپنے میں شامل کرلینا چاہتا تھا اور اس غرض سے وہاں کے عیسائیوں کو جو زیادہ تر یونانی نسل کے تھے دولت عثمانیہ کے خلاف برابر ابھارتا رہتا تھا، جب بغاوت کی شورش زیادہ ہوئی تو اسماعیل پاشا، خدیو مصر نے بھی اپنی فوجیں دولت علیہ کی مدد کے لیے کریٹ میں بھیجیں اور مصری فوجوں نے ارکاویون کے معرکہ میں بڑی شجاعت دکھائی، اس درمیان میں باب عالی نے کریدلی محمد پاشا کو اپنا نمایندہ [illegible] کر باغیوں سے گفتگو کرنے کے لیے کریٹ روانہ کیا، لیکن چونکہ محمد پاشا اس سے پہلے کریٹ کا [illegible] رہ چکا تھا اور لوگ اس سے بیزار تھے اس لیے گفتگو کامیاب نہیں رہی، ۱۸۶۷ء میں رشدی پاشا صدارت سے الگ کیے گئے اور ان کی جگہ محمد امین عالی پاشا دوسری بار صدر اعظم مقرر ہوئے اور فواد پاشا سابق صدر اعظم وزیر خارجہ بنائے گئے، انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کریدلی

محمد پاشا کو کریٹ سے واپس بلالیا اور ان کی جگہ عمر پاشا بطل کریمیا کو وہاں کا حاکم اور سرعسکر بنا کر بھیجا، عمر پاشا کو بغاوت کے فرو کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی، قریب تھا کہ وہ اس فتنہ کو پوری طرح دبا دیتے، لیکن عین اسی وقت دولِ عظمیٰ نے مداخلت کی اور عمر پاشا کو اپنا ہاتھ روک لینا پڑا، اکتوبر ۱۸۶۷ء میں باب عالی نے صدر اعظم عالی پاشا کو بھیجا کہ بچشم خود کریٹ کے حالات کا معائنہ کریں، عالی پاشا نے اہل جزیرہ کو حکومت کے عہدے اور منصب دے کر ان کی تسکین خاطر کی پوری کوشش کی لیکن باغیوں کا اصل مقصد یونان سے کریٹ کا الحاق تھا، اس لیے عالی پاشا کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں، آخرکار ۱۸۶۹ء میں دولِ عظمیٰ کی تجویز سے ایک کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کی طرف سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کے رو سے کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق دے دیے گئے اور دو سال کا خراج جو واجب الادا تھا معاف کردیا گیا، نیز اہل جزیرہ فوجی خدمت سے بری کردیے گئے (۱) اس طرح یہ بغاوت کچھ دنوں کے لیے فرو ہوگئی۔

معاہدۂ پیرس کی خلاف ورزی: ۱۸۷۰ء میں باب عالی کو دولِ عظمیٰ کی دوستی کا ایک اور تجربہ ہوا، صلح نامہ پیرس (۱۸۵۶ء) کی ایک دفعہ کے رو سے بحر اسود میں روس اور ترکی کے جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ان دونوں حکومتوں کو اس کے ساحلوں پر بحری اسلحہ خانے قایم کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی، لیکن جب ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کی جنگ شروع ہوئی تو روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ پابندی توڑ دینی چاہی اور ۳۱/ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو مذکورہ بالا دفعہ کی شکست کا اعلان کردیا، جرمنی کے وزیر اعظم پرنس بسمارک نے اس جنگ میں روس کی غیر جانبداری اسی قیمت پر حاصل کی تھی کہ "معاہدۂ پیرس" کی اس خلاف ورزی میں جرمنی روس کی تائید کرے گا۔ (۲)

فرانس خود اپنی مصیبت میں مبتلا تھا، وہ روس کو برانگیختہ کرنے کے لیے کسی

---

(۱) تاریخ دولت علیہ عثمانیہ از محمد فرید بک ص ۲۹۷ (۲) لارڈ ایورسلے ص ۳۱۴

طرح تیار نہ تھا، برطانیہ کی عنانِ حکومت مسٹر گلیڈسٹن کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے رکھا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں، چنانچہ برطانیہ نے بھی روس کے اس فعل کے خلاف مطلق احتجاج نہیں کیا اور روس نے بحر اسود پر اپنا تسلط پھر قایم کرلیا۔

بلغاریا کا قومی کلیسا: ۱۸۷۰ء میں ایک اور نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جس نے مسئلہ مشرقی کو آیندہ کے لیے زیادہ پیچدار بنادیا، اس وقت تک مملکت یونان اور رومانیا، سرویا اور مونٹی نگرو (جبل اسود) کی سرحدوں کے باہر بلقان کی عیسائی آبادی بجائے نسل کے مذہب کے لحاظ سے منقسم تھی، جنوبی مشرقی یورپ کی تمام عیسائی رعایا جو سلطنت عثمانیہ کے زیر فرمان تھی خواہ کسی نسل وقوم سے تعلق رکھتی ہو یونانی کلیسا کے ماتحت تھی اور اسی وجہ سے یونانی سمجھی جاتی تھی (۱) چنانچہ ریاستہاے بلقان کی سلافی قوموں مثلاً بلغاری اور بوسنی کا شمار بھی یونانیوں ہی میں ہوتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے اہل بلغاریا میں نسلی اور وطنی احساس ترقی کررہا تھا اور اب وہ اپنا مستقل قومی کلیسا قایم کرنے کا عزم کررہے تھے، یونانی کلیسا کے بطریق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہل بلغاریا کو کچھ مخصوص مراعات دے کر راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کی برگشتگی یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ وہ یونانی کلیسا کی وجہ سے آرتھوڈکس مذہب ہی کو ترک کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اور بجاے اس کے رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر تیار تھے، چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق پوپ سے گفتگو بھی شروع کردی (۲) لیکن اس موقع پر روس نے ان کی مدد کی اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر اثر ڈال کر بلغاریا کے لیے ایک مستقل کلیسا قایم کرنے کی اجازت حاصل کرلے گا، جنرل اگناتیف (Ignatief) اس وقت باب عالی میں روسی سفیر تھا اور اس کا اثر نہ صرف وزرا بلکہ خود سلطان پر بھی بہت زیادہ تھا، اگناتیف نے اہل بلغاریا کی استدعا اپنی سفارش کے ساتھ پیش کی، اگناتیف کا مقصد یہ تھا کہ ایسا کرنے

(۱) کیمبرج ماڈرن ہسٹری جلد ۱۲ ص ۳۸۱ (۲) جزیرہ نماے بلقان اور مشرق ادنیٰ از شیول ص ۳۸۶

سے بلغاری قوم کا ایک مستقل ,جو قایم ہو جائے گا جو آیندہ روس کے زیر سایہ رہے گی اور یونانیوں کے مقابلہ میں استعمال کی جا سکے گی، صدر اعظم فواد پاشا نے بھی اہل بلغاریا کی وطنی اور نسلی تحریک کو ترقی دینی چاہی تھی تاکہ بلقان میں ایک مضبوط قوم یونانیوں کی حریف پیدا ہو جائے، چنانچہ ۱۰ر مارچ ۱۸۷۰ء کو سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان صادر کر کے بلغاریا کی جداگانہ ہستی کو تسلیم کیا اور اس کے لیے کلیسائے یونان سے آزاد ایک مستقل قومی کلیسا قایم کرنے کی اجازت دی، نہ صرف یہ کہ ولایت ڈینوب کا پورا علاقہ بلغاری کلیسا کے ماتحت کر دیا گیا بلکہ اس فرمان میں یہ تصریح بھی کر دی گئی کہ اگر مقدونیا کے عیسائی حلقے بلغاری کلیسا میں داخل ہونا چاہیں تو ان حلقوں کی دو ثلث آبادی کی خواہش معلوم ہونے پر یہ حق انھیں دے دیا جائے گا(۱) اس تاریخ سے بلقان میں ایک جدید قومیت کی بنیاد پڑ گئی، بلغاری قوم جو صدیوں سے سو رہی تھی بیدار ہو کر اب ایک قوی حریف کی حیثیت سے یونانیوں کے مقابل آ گئی۔

باب عالی میں روس کا اثر: تخت نشینی کے بعد سے دس سال تک عبدالعزیز کو فواد پاشا، عالی پاشا، رشدی پاشا اور مدحت پاشا جیسے محبِّ وطن اور قابل مدبرین کی خدمات حاصل رہیں جن کے زیر اثر اس نے بہت سی اصلاحات جاری کیں، ان میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اس نے عثمانی بیڑے کو یورپ کے زبردست بیڑوں کا ہم پلہ بنا دیا اور فوج کی تنظیم اس طریقہ پر کی کہ آیندہ جنگ روس خصوصاً پلونا کے معرکہ میں ترکوں کی جاں بازی نے تمام دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، پریس کو حکومت پر تنقید کرنے کی آزادی ملی اور بحیثیت مجموعی سلطنت عثمانیہ محمود ثانی اور عبدالمجید کی تیار کی ہوئی شاہراہ ترقی پر گامزن نظر آنے لگی، لیکن بدقسمتی سے ۱۸۷۱ء میں چند مہینوں کے اندر فواد پاشا اور عالی پاشا دونوں کا انتقال ہو گیا، یہ وزرا اپنی غیر معمولی قابلیت اور مقبولیت کی وجہ سے شروع ہی سے سلطان پر بہت زیادہ اثر رکھتے تھے اور حقیقتاً

(۱) شیول ص ۳۸۶

سلطنت کا نظم ونسق انہی کے ہاتھوں میں تھا، ان کی وفات کے بعد عبدالعزیز دوسرے وزیروں کے اثر سے آزاد ہوگیا اور اب مطلق العنانی کا دور شروع ہوا، اس نے محمود ندیم پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا جس کے زمانہ میں رشوت کا بازار پھر گرم ہوا، عہدے اور منصب فروخت ہونے لگے، حکومت کے ہر شعبہ میں بدنظمی پھیلنے لگی اور سلطنت کے مختلف صوبوں میں شورشیں برپا ہونا شروع ہوئیں۔

اس صورتِ حال سے روس نے پورا فائدہ اٹھایا، اس کا سفیر جنرل اگناتیف عالی پاشا کی وفات سے چند سال قبل قسطنطنیہ آگیا تھا، ترک مورخ احمد صائب بک نے لکھا ہے کہ اگناتیف وہ شخص ہے جس نے مشرق ادنیٰ میں سیاستِ روس کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں ذلیل سے ذلیل طریقہ اختیار کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا، جب تک زمامِ حکومت عالی پاشا کے ہاتھ میں تھی اسے کامیابی نہ ہوسکی، لیکن جب ۱۸۷۲ء میں عالی پاشا کا انتقال ہوگیا اور محمود ندیم پاشا صدر اعظم مقرر ہوا تو اگناتیف نے دیکھا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت آگیا ہے، محمود نے اپنے کو بالکل اگناتیف کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور حکومت روس اور سفیر روس کا تابع فرمان ہوگیا تھا، اس کی حکومت زار کی حکومت تھی نہ کہ سلطان کی، کسی وزیر نے ایسی خیانت کی مثال نہیں پیش کی، نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ حکومت کے عہدہ داروں کا عزل وتقرر بھی اگناتیف ہی کی رائے سے ہوا کرتا تھا(۱) حد یہ ہے کہ شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی بھی اگناتیف کے جادو سے محفوظ نہ تھا، چنانچہ اس نے ایک روز اگناتیف سے کہا کہ 'میری دو آنکھیں ہیں، ایک تو اور ایک میر الڑ کا حیدر'(۲) مسٹر نائٹ اپنی مشہور کتاب 'بیداری ترکی' (Awakening of Turkey) میں لکھتے ہیں کہ ''روسی ڈپلومیسی نے قسطنطنیہ میں غلبہ حاصل کرلیا تھا اور حسب دستور قدیم جماعتِ اصلاح کے خلاف سازش میں مصروف تھی اور سلطنت عثمانیہ کی بربادی کی تدبیریں کر رہی تھی۔''

---

(۱) واقعہ السلطان عبدالعزیز از احمد صائب بک مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ ص ۱۰۵-۱۰۷ (۲) ایضاً ص ۱۸۴

جمعیۃ سلافیہ: سلطنت عثمانیہ کو برباد کرنے کے لیے روس نے جو ذرائع اختیار کیے، ان میں جمعیۃ سلافیہ کی تشکیل ایک نہایت موثر ذریعہ تھی، 'پان سلاوزم' (Pan Slavism) یا اتحاد سلافی کا مقصد یہ تھا کہ تمام سلافی قوموں کو روس کے زیر سیادت منظم کر کے دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارا جائے، چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر روس کے چند اربابِ فکر نے ۱۸۴۰ء میں 'جمعیۃ سلافیہ' قایم کی، اس جمعیۃ نے سلافی قوموں کے اندر روسی ادبیات کی نشر و اشاعت شروع کی تاکہ ان قلوب روس کی جانب آسانی سے مائل ہو سکیں، اس نے بلغاریا، سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا اور مونٹی نگرو و جبل اسود کے باشندوں کو جو روس سے نسلی اور دینی تعلق رکھتے تھے، دولت علیہ کی حکومت سے آزاد کرانے کی کوشش کی، روسی ایجنٹ خفیہ اور علانیہ طور پر سلطنت عثمانیہ کے ان صوبوں میں جاتے تھے جو روس کے قریب تھے اور 'جمعیۃ سلافیہ' کے خرچ سے سلافی قوموں کے بچوں کو بلاد روس میں بھیجتے تھے، جہاں جمعیۃ کی طرف سے ان کی تعلیم کے لیے مدرسے قایم کیے گئے تھے، یہ لڑکے وہاں سے تعلیم حاصل کر کے جب واپس ہوتے تو جمعیۃ کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے اپنے شہروں میں مدرسے قایم کرتے، جمعیۃ کے ارکان بلقان کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، یہ لوگ عیسائیوں کو خوشخبری سناتے کہ عنقریب وہ روس اور 'جمعیۃ سلافیہ' کی مدد سے ترکی کی حکومت سے نجات پا جائیں گے، وہ ان کی مالی مدد بھی کرتے اور خفیہ طور پر ان کے لیے فوجی سامان بہم پہنچاتے رہتے، رفتہ رفتہ ریاستہائے بلقان کے تمام عیسائی 'جمعیۃ سلافیہ' کے مطیع ہو گئے اور علمِ بغاوت بلند کرنے کے لیے اس کے اشارہ کا انتظار کرنے لگے، حکومتِ روس کے بڑے بڑے ارکان اس جمعیۃ میں شامل تھے اور اگناتیف اس کا سب سے زیادہ قوی رکن تھا۔ (۱)

میریٹ لکھتا ہے: ''جنگ کریمیا کے بعد سے 'اتحاد سلافی' کے جدید عقیدہ کے مبلغین جن میں زیادہ تر روسی تھے اپنی ہم مذہب اور ہم نسل قوموں میں مسلسل پروپگنڈا

(۱) احمد صائب بک ص ۷۶-۷۷

کرنے میں مشغول تھے، ۱۸۶۷ء میں اتحاد سلافی کی ایک عظیم الشان کانگریس ایک سائنٹفک انجمن کے پردہ میں ماسکو میں منعقد ہوئی، اس کانگریس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد سلافی کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا صدر مقام ماسکو تھا اور ایک چھوٹی کمیٹی بخارسٹ میں قایم کی گئی، کتابیں اور مختصر رسالے بلقان میں تقسیم کیے جاتے تھے، نوجوان سلافی کثرت سے روسی یونیورسٹیوں میں جانے لگے، جس طرح رومانیا کے نوجوان پیرس جاتے تھے، سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا اور بلغاریا میں ہر طرف خفیہ سوسائٹیوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس تحریک کو سرکاری مدد بھی حاصل تھی، عوام کے پروپگنڈے کی پشت پر اعلیٰ سیاسی قوتیں بھی کام کررہی تھیں، جزیرہ نمائے بلقان میں ہر روسی قنصل اتحاد سلافی کا رکن تھا اور جنرل اگناتیف جو اس تحریک کا ایک پرجوش حامی تھا، قسطنطنیہ میں سفیر مقرر کیا گیا تھا۔"(۱)

مدحت پاشا کی اسکیم: روس کی یہ سرگرمیاں باب عالی سے پوشیدہ نہ تھیں، مدحت پاشا نے ولایت ڈینوب (بلغاریا) کی گورنری کے زمانہ (۱۸۶۵ء لغایۃ ۱۸۶۸ء) میں دیکھا تھا کہ روسی پروپگنڈے کی کامیابی کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ بلغاریا کے نوجوان طلبہ وڈیسا، خارکوف اور کیف کی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے روس بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سے اتحاد سلافی کے پرجوش مبلغ ہوکر وطن کو لوٹتے ہیں اور دولت عثمانیہ کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ مدحت پاشا نے یہ فیصلہ کیا کہ بلغاریا کے خاص خاص شہروں میں ایسے مدرسے قایم کردیے جائیں جہاں مسلمان اور عیسائی لڑکے یکجا تعلیم پاسکیں اور یہ تعلیم اعلیٰ درجہ کی اور عہد حاضر کے مطابق ہوتا کہ انھیں کہیں باہر جانے کی ضرورت باقی نہ رہے، اگر اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو مسلمان اور عیسائی طلبہ کے درمیان دوستانہ روابط قایم ہوجاتے اور روسی پروپگنڈے کا اثر بہت کم ہوجاتا، مدحت پاشا نے بلغاریا کے لیے اصلاحات کی جو اسکیم باب عالی میں پیش کی اس میں مخلوط تعلیم کی یہ تجویز بھی شامل تھی، جس وقت یہ اسکیم قسطنطنیہ پہنچی اگناتیف پہلا شخص تھا جس نے اس

(۱) میریٹ ص ۳۲۰-۳۱۹

کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا، اس نے دیکھا کہ یہ اسکیم جمعیۃ سلافیہ کے اغراض و مقاصد کے بالکل مخالف ہے، چنانچہ اس نے اسے درہم برہم کرنے کی پوری کوشش کی اور آخر کار کامیاب ہوا، دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں یوروپین سفیروں کی مداخلت کوئی نئی چیز نہ تھی، اگنا تیف نے سلطان کو ذہن نشین کرانا شروع کیا کہ مدحت پاشا اپنے صوبہ میں جو اصلاحات جاری کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً مقامی مجلسوں کا قیام، ان کی روح شخصی حکومت کے سراسر منافی ہے اور ان اصلاحات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ وہ صوبہ سلطنت سے علاحدہ ہو جائے گا اور مصر کی طرح مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے لگے گا، اتفاق یہ کہ ولایت ڈینوب کے سرکاری اخبار میں مرکزی مجلس کے ممبروں کے لیے طباعت کی غلطی سے ''مندوبین'' (Deputies) کا لفظ چھپ گیا تھا، اگنا تیف نے اس لفظ کو خاص اہمیت دے کر عبدالعزیز کے سامنے پیش کیا، عبدالعزیز پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے منجملہ دیگر اصلاحات کے مدحت پاشا کی تعلیمی اسکیم کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا، وجہ یہ ظاہر کی کہ ان اسکولوں کے اخراجات پورے نہ ہو سکیں گے، حالانکہ مدحت پاشا نے اپنی رپورٹ میں تصریح کر دی تھی کہ نصف اخراجات کا انتظام صوبہ کی سالانہ آمدنی سے ہو جائے گا اور نصف مقامی چندوں سے پورے کر لیے جائیں گے (۱) اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ مدرسے قایم کر دئے جاتے تو بلغاریا میں ''جمعیۃ سلافیہ'' کی سرگرمیوں کا بہت کچھ سد باب ہو جاتا لیکن سلطان پر اگنا تیف کا جادو چل گیا اور ساری اسکیم درہم برہم ہو گئی۔

سلطان کی فضول خرچی: فواد پاشا اور عالی پاشا کے انتقال کے بعد جیسا کہ اوپر بیان ہوا اگنا تیف کا اثر اور بھی بڑھ گیا، دوسری طرف عبدالعزیز بھی اپنے کو اب حقیقی معنوں میں ایک مطلق العنان فرماں روا محسوس کرنے لگا، سلطنت کی مالی حالت سے قطعاً بے پروا ہو کر اس نے فضول خرچی شروع کر دی جس سے ملکی قرضہ کا بار روز بروز بڑھتا چلا گیا، اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا، چنانچہ سنگ مرمر کے بڑے بڑے عالی شان محل تیار ہونے

(۱) سوانح مدحت پاشا از علی حیدر مدحت مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء، ص ۴۲-۴۰

لگے، صدر اعظم محمود ندیم پاشا کو اپنا منصب برقرار رکھنے کی فکر تھی، وہ سلطان کی ہر خواہش کو آنکھ بند کر کے پورا کرتا رہا، ان فضول خرچیوں کا اثر دور دراز صوبوں پر بھی پڑنے لگا، قصر یلدیز کے مطالبات اتنے کثیر تھے کہ صوبوں کی معمولی آمدنی ان کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، مجبوراً چندے لگائے جانے لگے، رفاہِ عام کے کام ملتوی کیے جانے لگے اور ان کے لیے جو رقمیں جمع کی جاتی تھیں، وہ قسطنطنیہ بھیجی جانے لگیں، قصر سلطانی کے نااہل مقربان قسطنطنیہ سے صوبوں میں بھیجے جاتے اور والیوں کو حکم دیا جاتا کہ انھیں آمدنی کی جگہوں پر مقرر کیا جائے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے ہر شعبہ میں ابتری پھیلنے لگی اور مختلف علاقوں میں ہنگامے برپا ہونا شروع ہوئے۔

مدحت پاشا کی صدارت: یہ حالت دیکھ کر سلطان نے محمود ندیم پاشا کو برخاست کر دیا اور اس کی جگہ ۱۸۷۳ء میں مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، مدحت پاشا نے سب سے پہلے مالیات کی درستی کی طرف توجہ کی، کاغذات کے معاینہ سے معلوم ہوا کہ ایک لاکھ ترکی پونڈ کا حساب درج نہیں ہے اور تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ رقم محمود ندیم پاشا نے وصول کی ہے، مدحت پاشا نے حکم دیا کہ اسے جلد سے جلد محمود ندیم سے واپس لیا جائے، محمود ندیم نے بیان کیا کہ گو یہ رقم اس کے نام سے برآمد کی گئی ہے لیکن دراصل قصر سلطانی میں بھیجی گئی ہے، والدہ سلطانہ اس کی پشت پناہ تھی، بہر حال مدحت پاشا کے اصرار سے وہ پہلے اورنہ اور پھر طرابزون جلاوطن کر کے بھیج دیا گیا لیکن کچھ دنوں کے بعد سلطان نے اسے قسطنطنیہ آنے کی اجازت دے دی، دارالسلطنت میں اب دو جماعتیں صاف طور پر ایک دوسرے کی مخالف نظر آ رہی تھیں، ایک طرف مدحت پاشا تھے جنھیں قسطنطنیہ اور صوبوں کی رائے عامہ کی تائید نیز روشن خیال علما اور صوفیہ (مدارس دینیہ کے طلبہ) کی حمایت حاصل تھی، دوسری طرف وہ پورا گروہ تھا جو سلطنت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور جسے محمود ندیم کی قیادت اور والدہ سلطانہ اور قصر یلدیز کی پشت پناہی حاصل تھی، محمود ندیم کا ایک اور زبردست حامی جنرل اگناتیف تھا جو اسے دوبارہ صدارت پر لانے

کے لیے ہر ممکن طریقہ سے سلطان پر اثر ڈال رہا تھا۔

اسی درمیان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے مدحت پاشا کی صدارت عبدالعزیز کو گراں محسوس ہونے لگی، خدیو مصر اسماعیل پاشا وقتاً فوقتاً قسطنطنیہ آیا کرتا تھا اور قصر سلطانی میں بڑی بڑی رقمیں اور بیش قیمت ہدایا پیش کر کے ہر مرتبہ سلطان سے حکومت خود اختیاری کے کچھ حقوق حاصل کر لیتا تھا، خدیو کی آمد قصر سلطانی اور اس کے تمام عہدہ داروں کے لیے آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بن گئی تھی، چنانچہ وہ مدحت پاشا کی صدارت کے زمانہ میں بھی آیا لیکن اب کی بار اسے مطلق کامیابی نہیں ہوئی اور اپنے ہدایا کے ساتھ بے نیلِ مرام اسے مصر واپس جانا پڑا، اس واقعہ سے جتنی مایوسی خدیو مصر کو ہوئی اتنی ہی قصرِ سلطانی کے ارکان کو بھی ہوئی اور خود سلطان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا، مدحت پاشا کے صدارت پر آنے سے پہلے آسٹریا کے ایک شخص بیرن ہرش (Baran Hirsch) نے باب عالی سے ریل کی پٹریوں کے لگانے کا ٹھیکہ لیا تھا اور سلیپر کاٹنے کے سلسلہ میں ترکی کے ان جنگلوں پر جو دنیا کے بہترین جنگل سمجھے جاتے ہیں غیر محدود اختیارات حاصل کر لیے تھے، علاوہ بریں ہرش نے پٹریاں صرف میدانی علاقوں میں بچھائیں اور اجرت اس شرح سے طلب کی جو میدانوں اور پہاڑوں دونوں کے اوسط پر لگائی گئی تھی، اس ٹھیکہ میں ہرش کی کامیابی کا راز صرف رشوت تھی، اس نے بڑی بڑی رقمیں قصر سلطانی اور وزرا کی خدمت میں پیش کر کے ٹھیکہ کا تکملہ کرالیا تھا، مدحت پاشا نے جب زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اُنھیں اس معاملہ کا علم ہوا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، تحقیقات سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ خود سلطان کی ذات بھی رشوت سے بری نہیں ہے، چنانچہ وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسے سمجھایا کہ اس ٹھیکہ میں دولت علیہ کا کس قدر نقصان ہے اور اس بات پر زور دیا کہ جو رقمیں ہرش سے لی گئی ہیں ان کو واپس کر کے یہ معاملہ ختم کر دیا جائے، عبدالعزیز نے بادل ناخواستہ مدحت پاشا کا مشورہ قبول کر لیا، رقمیں واپس

کرادیں لیکن اس کے بعد مدحت پاشا کو برخاست کردیا۔(۱)

مالی ابتری: اس کے بعد مدحت پاشا سالونیکا کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ رخصت لے کر قسطنطنیہ چلے آئے اور یہاں کچھ دنوں وزیر عدل اور پھر صدر کونسل آف اسٹیٹ رہنے کے بعد مستعفی ہوکر خانہ نشیں ہوگئے، اس درمیان میں سلطنت کی بدنظمی روز بروز بڑھتی جارہی تھی، یکے بعد دیگرے کئی صدر اعظم مقرر اور برخاست کیے گئے، ان میں سے کوئی چند مہینوں سے زیادہ نہ رہا، چنانچہ محمد رشدی پاشا، اسعد پاشا اور شروانی رشدی پاشا نے اپنی قلیل مدتِ صدارت میں حالات کی درستی کی انتہائی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے، بالآخر سلطان نے محمد ندیم پاشا کو دوبارہ صدر اعظم مقرر کیا، اس وقت مالیات کا نظام اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ سلطنت عنقریب دیوالیہ ہوا چاہتی تھی، چنانچہ ۷/اکتوبر ۱۸۷۵ء کو باب عالی نے اپنے قرض خواہوں کو اطلاع دے دی کہ حکومت پورا سود ادا کرنے سے قاصر ہے، اس پر سارے یورپ میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، یورپ کے ہر پایہ تخت اور ہر بڑے شہر میں جن ساہوکاروں نے بڑی بڑی شرح سود پر باب عالی کو قرضے دیئے تھے جلسے کیے اور ترکی حکومت اور ترکی قوم دونوں کے خلاف شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا، ان جلسوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف سیاسی جوش کے بھڑک اٹھنے کے لیے زمین خوب تیار کردی تھی۔

بغاوت ہرزیگووینا: اس درمیان میں روس کی معاندانہ کوششیں برابر جاری تھیں، جمعیۃ سلافیہ کے ارکان بلقان کی عیسائی رعایا کو بھڑکانے میں سرگرم تھے، آسٹریا کی نگاہیں بوسنیا اور ہرزیگووینا پر لگی ہوئی تھیں، وہ ان صوبوں میں بغاوت برپا کرا کے خود ان پر قبضہ کرلینا چاہتا تھا، چنانچہ اس مقصد سے خفیہ طور پر وہ بوسنیا اور ہرزیگووینا میں اسلحہ اور گولا بارود بھیج رہا تھا، سرویا اور مونٹی نگرو کے شورش پسند بھی ہرزیگووینا میں جمع ہورہے تھے، ان تیاریوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جولائی ۱۸۷۵ء میں موشار (ہرزیگووینا) کے کسانوں

---

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۶۶-۶۵

نے دفعتہً ٹیکس ادا کرنے اور زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت کے لیے آمادہ ہو گئے، مقامی حکام بجائے اس کے کہ شورش کو فوراً ختم کر دیتے باب عالی کے احکام کا انتظار کرنے لگے، اس سے باغیوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور چونکہ انھیں خارجی مدد کا یقین دلایا گیا تھا، اس لیے ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا، آخر کار مختار پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج باب عالی کی طرف سے بھیجی گئی، جس نے بآسانی بغاوت کو فرو کر دیا لیکن یہ چیز روس اور آسٹریا کی پالیسی کے بالکل خلاف ہوئی، ان کا مقصد صرف بغاوت کے قایم رہنے سے پورا ہو سکتا تھا، چنانچہ انھوں نے باغیوں کو در پردہ پھر ابھارا اور ان کی طرف سے چند مطالبات اپنے سفیروں کے توسط سے باب عالی میں پیش کیے، صدر اعظم اسعد پاشا حسن نیت کے باوجود کمزور آدمی تھے، انھوں نے روسی اور آسٹروی سفیروں کی یہ خدمت قبول کر لی، وہ باغیوں اور باب عالی کے درمیان مصالحت کرادیں گے، جیسا کہ علی حیدر مدحت نے لکھا ہے، کوئی پالیسی اس سے زیادہ مہلک نہیں ہو سکتی تھی، اس سے باغیوں کی انتہائی حوصلہ افزائی ہوئی، انھوں نے سمجھ لیا کہ حکومت خود اس شورش کے فرو کرنے سے قاصر ہے، اس کارروائی سے باغیوں کی حیثیت حریفِ مقابل کی ہو گئی اور جو چیز پہلے تھوڑے سے کسانوں کی ایک معمولی سی شورش تھی وہ اب باقاعدہ بغاوت کے درجہ تک پہنچ گئی، جس کے لیڈر غیر ملکی قنصلوں اور سفیروں کے ذریعہ سے باب عالی سے مساویانہ طور پر معاملات کرنے لگے۔

بہر حال ۲/اکتوبر ۱۸۷۵ء کو سلطان کی طرف سے ایک ارادہ شایع ہوا جس میں فوری اور عام اصلاحات کا وعدہ کیا گیا لیکن باغیوں نے اس کی پروا نہ کی، اس کے بعد ۱۲/دسمبر کو ایک شاہی فرمان صادر ہوا جس میں باغیوں کے سابق مطالبات منظور کر لیے گئے یعنی یہ کہ ٹیکسوں کی مقدار کم کر دی جائے گی اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو خود اپنی پولیس قایم کرنے کی اجازت ہو گی، اس فرمان میں سلطان نے یہ بھی وعدہ کیا کہ مقامی انتخابی مجلسیں فوراً قایم کر دی جائیں گی جن میں عیسائی ممبروں کی جگہیں محفوظ

ہوں گی، لیکن روس اور آسٹریا کی پشت پناہی سے باغیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، انھوں نے اس کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے، دولِ عظمیٰ کی مداخلت کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا، چنانچہ روس، آسٹریا اور جرمنی کے فرماں رواؤں نے باہم مشورہ کیا اور آسٹریا کے چانسلر کاونٹ اندراسی (Andrassy) نے بوداپسٹ سے وہ نوٹ جاری کیا جو اس کے نام سے مشہور ہے۔

اندراسی نوٹ: 'اندراسی نوٹ' میں یہ بتانے کے بعد کہ دولِ عظمیٰ بغاوت کے فرو کرنے اور یورپ میں امن قایم رکھنے کے لیے کس قدر بے چین ہیں اور باب عالی ان اصلاحات کے نافذ کرنے سے جو مدت سے واجب ہو چکی تھیں کہاں تک قاصر رہا ہے، اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرائے جائیں:

بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے اور مسلم اور غیر مسلم رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، اجارہ داروں کے ذریعہ سے ٹیکس کی وصولی کا طریقہ بند کر دیا جائے اور آیندہ ٹیکس براہ راست عمال حکومت کے ذریعہ وصول کیے جائیں، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں سے جو ٹیکس لیے جائیں وہ انھی صوبوں کی مقامی ضروریات پر صرف ہوں، ایسے کسانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے جو زمین کے مالک ہوں اور اس طرح دیہی آبادی کی حالت بہتر بنائی جائے، ایک کمیشن مقرر کیا جائے جس کے ارکان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو اور وہ اپنی نگرانی میں نہ صرف ان اصلاحات کو جاری کرائے جو دولِ عظمیٰ کی طرف سے پیش کی گئی ہیں بلکہ ان کو بھی جن کا وعدہ سلطان نے ۲/ اکتوبر اور ۱۲/ دسمبر کے فرمان میں کیا ہے، آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر مذکورہ بالا مطالبات جلد اور موثر طریقہ پر پورے نہ کیے گئے تو دولِ عظمیٰ بغاوت کے روکنے کی کوشش سے بری الذمہ ہو جائیں گی۔

۳۰/ جنوری ۱۸۷۶ء کو تمام دولِ عظمیٰ کی طرف سے 'اندراسی نوٹ' باب عالی

میں پیش کیا گیا، ۱۱ر فروری کو سلطان نے اس کی تمام دفعات باستثنا ایک دفعہ کے جس میں ٹیکسوں کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا منظور کرلیں لیکن اس کے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کو مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کردی جائیں، باب عالی کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کی کسی اسکیم کا نافذ کرنا ممکن نہیں، اس درمیان میں شورش برابر بڑھتی چلی گئی، بوسنیا بھی ہرزیگووینا کے ساتھ شریک ہوگیا، دوسری طرف سرویا، مونٹی نیگرو اور بلغاریا بھی علم بغاوت بلند کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے تھے۔

جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کا قتل: باب عالی کی صلح جوئی اور انتہائی مراعات کے باوجود بلقان کے عیسائیوں میں سرکشی کا جذبہ یوروپین حکومتوں کی حوصلہ افزائی سے روز بروز زیادہ مشتعل ہوتا جارہا تھا کہ ۵رمئی ۱۸۷۶ء کو سالونیکا میں جرمن اور فرانسی قنصلوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا، جس نے سارے یورپ کو ترکوں کے خلاف دفعۃً برانگیختہ کردیا، سبب یہ ہوا کہ ایک بلغاری لڑکی اسلام قبول کرکے اپنے گاؤں سے سالونیکا آئی تاکہ وہاں کی مجلس عالیہ کے سامنے اس کا اعلان کرکے اپنے ایک ہم وطن نوجوان مسلمان سے شادی کی اجازت حاصل کرے، جب وہ سالونیکا کے اسٹیشن پر پہنچی تو یونانیوں اور بلغاریوں کا ایک کثیر مجمع پہلے سے موجود تھا، ان لوگوں نے لڑکی کی نقاب اور فرغل کو نوچ کر پھینک دیا اور اسے زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا کر فوراً امریکن قنصل خانہ میں پہنچادیا، جہاں نائب قنصل نے جو ایک بلغاری عیسائی تھا اور اسی نے یہ تمام انتظامات کیے تھے لڑکی کو رات بھر چھپائے رکھا اور دوسرے دن اسے اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا کہ سراغ نہ مل سکے، علی الصباح مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے قنصل خانہ کے پاس جمع ہوا اور لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا، ادھر سے جواب ملا کہ لڑکی یہاں نہیں ہے، اس کے بعد یہ لوگ برہم ہوکر قریب کی مسجد میں اکٹھا ہوئے اور آیندہ تدبیروں پر غور کرنے لگے، بدقسمتی سے مسلمانوں کے اس جوش کی حالت میں

جرمن اور فرانسیسی قنصل مسجد میں داخل ہوئے، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ مجمع کو سمجھانے کے لیے عمداً مسجد میں گئے تھے یا مسجد کے دروازہ کے قریب تھے اور بھیڑ کے دھکے میں بلا ارادہ اندر پہنچ گئے تھے، بہر حال جس صورت سے بھی وہ گئے ہوں مجمع انھیں مسجد کے اندر دیکھتے ہی بے قابو ہوگیا اور چند آدمی کھڑکیوں کی آہنی سلاخیں کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور دونوں کو وہیں ختم کر دیا، انگریزی قنصل مسٹر بلنٹ نے شروع ہی میں مجمع کا رنگ دیکھ کر امریکن نائب قنصل لزارو (Lazaro) کے یہاں جو اس ہنگامہ کا اصلی باعث تھا بہت اصرار کے ساتھ کہلا بھیجا کہ لڑکی فوراً واپس کر دی جائے ورنہ جرمن اور فرانسیسی قنصلوں کی جان خطرہ میں ہے لیکن لزارو نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں لڑکی کہاں ہے اور جب بلنٹ کے مزید اصرار پر اس نے لڑکی واپس کی تو وقت گذر چکا تھا اور دونوں قنصل مارے جا چکے تھے۔

اگرچہ باب عالی نے مجرموں کو سزا کے لیے فوراً احکام صادر کیے اور چھ آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی اور بہتوں کو قید کی سزائیں دی گئیں تاہم یورپ کا جوشِ انتقام اس کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا، یوروپین پریس نے اس آگ کو خوب بھڑکایا اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام عیسائیوں کی جانیں خطرہ میں ہیں اور وہاں کی پوری مسلمان آبادی عیسائیوں کے قتل عام پر آمادہ ہوگئی ہے، عیسائیوں کے تحفظ کے لیے جو تجویزیں پیش کی گئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں صلیبی اتحاد قایم کیا جائے۔

بغاوت بلغاریا: اتفاق سے اسی زمانہ میں بلغاریا میں بھی بغاوت شروع ہوگئی تھی، اس لیے صلیبی اتحاد کی ضرورت اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی، حقیقت یہ تھی کہ بلقان کی تمام شورشیں ایک منظم تحریک کا نتیجہ تھیں، روس کی سرپرستی میں 'جمعیۃ سلافیہ' کے ارکان نے پورے جزیرہ نما میں خفیہ کمیٹیوں کا جال بچھا رکھا تھا، آسٹریا، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے لالچ سے روس کا معاون تھا، چنانچہ ابھی ان صوبوں کی بغاوت جاری ہی

تھی کہ بلغاریا کے بعض ضلعوں میں بھی یہ فتنہ رونما ہوا، مقامی حکام نے یہ دیکھ کر کہ ہرزیگووینا میں ابتدائی غفلت کا نتیجہ کیا ہوا، اس شورش کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرلیا، اس پر جنرل اگناتیف نے باب عالی میں اتنا سخت احتجاج کیا کہ قسطنطنیہ سے نہ صرف ان لیڈروں کی رہائی کا حکم پہنچا بلکہ حکومت کے جو عہدہ داران کی گرفتاری میں شریک تھے وہ برخاست کردیے گئے (۱) اس کارروائی سے بلغاریا کے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا، انھوں نے یہ دیکھ کر کہ باغیوں کی ٹولیاں یوروپین قنصلوں کی حمایت میں منظّم ہوتی جارہی ہیں اور مقامی حکام جو انسدادی تدبیریں اختیار کرتے ہیں ان پر سزا دی جاتی ہے، اس معاملہ کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا اور تمام صوبہ میں مدافعتی کمیٹیاں بنا کر پنشن یافتہ فوجیوں کی کمان میں مقامی جتھے قایم کرلیے۔

علم بغاوت باضابطہ طور پر تو یکم مئی ۱۸۷۶ء کو بلند کیا گیا لیکن فساد کے بادل مہینوں پہلے سے مختلف اطراف سے اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے، چنانچہ اکتوبر ۱۸۷۵ء سے قبل باب عالی کو اطلاع دی گئی تھی کہ بلغاریا کے تین ضلعوں فلیپو پولیس، اسکی زغرا اور ٹرنوو میں سخت شورش برپا ہونے کا خطرہ ہے اور ان اضلاع کے حکام نے باب عالی سے پرزور استدعا کی تھی کہ فوجی دستے فوراً روانہ کردیے جائیں تاکہ پرامن باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کی جاسکے، لیکن اگناتیف نے پھر مداخلت کی اور اس بات پر زور دیا کہ باضابطہ فوجوں کی موجودگی سے مقامی باشندوں میں اور بھی اشتعال پیدا ہوگا اور شورش جلد شروع ہوجائے گی، محمود ندیم اس کی باتوں میں آگیا اور ان اضلاع کے حکام کی پیہم درخواستوں کے باوجود اس نے کوئی باضابطہ فوج بلغاریا میں نہیں بھیجی، چنانچہ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں اسکی زغرا کے عیسائیوں نے دفعۃً مسلمانوں پر حملہ کردیا، اس کے متعلق نائب قنصل بروفی (Brophy) سرہنری الیٹ (Sir H. Elliat) سفیر برطانیہ مقیم قسطنطنیہ کو لکھتا ہے:

---

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۱۷

"اکتوبر ۱۸۷۵ء میں یہ بالکل طے تھا کہ بلغاریا کے آٹھ دس مقامات پر بیک وقت شورش شروع کر دی جائے گی لیکن کسی خاص وجہ کے پیش آجانے سے بغاوت کو ملتوی کر دینا مناسب سمجھا گیا، چنانچہ تمام مرکزوں میں ہرکارے بھیج دیے گئے لیکن اس کی زغرا میں التوا کی اطلاع چوبیس گھنٹے بعد پہنچی اور وہاں کے لوگوں نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ باغیوں کی پوری فوج ان کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوگی، علم بغاوت بلند کر دیا، واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ مئی (۱۸۷۶ء) کی شورش، بغاوت یا انقلاب جو کچھ بھی وہ رہا ہوا کتوبر ۱۸۷۵ء میں واقع ہونے والا تھا مگر نہیں ہوا۔"(۱)

حقیقت حال: بہتر ہوگا کہ بغاوتِ بلغاریا کی اصل حقیقت خود برطانوی قنصلوں اور سرہنری الیٹ کے مراسلوں سے پیش کی جائے، فلپو پولیس کا نائب قنصل ڈیو پوئی (Dupujs) ۷/اگست ۱۸۷۶ء کو لارڈ ڈربی وزیر خارجہ انگلستان کو مندرجہ ذیل رپورٹ بھیجتا ہے:

"صورتِ حال یہ تھی جب ۲/مئی کو انقلابی کمیٹیوں کی مرتب اور منظم کی ہوئی بغاوت جو گذشتہ تیرہ سالوں سے بخارسٹ اور ماسکو میں قایم تھی، دفعۃً اورات آلان (Auratalan) میں شروع ہوگئی، انقلابیوں کی تجویز یہ تھی اور ان کی مدد دیہاتوں کے پادری اور اسکول ماسٹر کر رہے تھے کہ ساری ولایت میں ریلوے اسٹیشن اور پل برباد کر دیے جائیں، اور نہ اور فلپو پولیس کے شہروں میں آگ لگا دی جائے، پانچ سو آدمیوں کو لے کر تاتار بازار جیق پر چھاپا مارا جائے اور وہاں حکومت کے ذخیرہ پر قبضہ کر لیا جائے، فوجوں کے لیے گورنر جنرل

---

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ (Blue Book) متعلق بہ ترکی بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا، ص ۲۸۶

کے پاس اور نہ تار بھیجا گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ جواب دیا کہ چونکہ کوئی باضابطہ فوج بھیجنے کے لیے موجود نہیں ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ بے ضابطہ دستے فراہم کر لیے جائیں، ۱۴رمئی کو فلپو پولیس کے چند ممتاز اشخاص نے وہاں کے ملا کے زیر صدارت ایک جلسہ کیا جس میں گورنر جنرل کی یہ تجویز کہ نفر عامی (بے ضابطہ سپاہی) بھرتی کر لیے جائیں منظور کی گئی اور فیصلہ کی اطلاع ارکانِ جلسہ کے دستخطوں کے ساتھ اورنہ بھیج دی گئی، اس کے بعد فوراً باشی بوزقوں یعنی بے ضابطہ سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لیے ولایت کے مختلف حصوں میں احکام بھیجے گئے۔"

باغیوں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جو مسلمان بھی ملتا اسے بے دریغ قتل کر دیتے، بوڑھے بچے یا مرد عورت کی کوئی تفریق نہ تھی، مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر یورو پین حکومتوں کو مداخلت کا موقع ہاتھ آئے، اس میں شبہ نہیں کہ عیسائیوں نے ایسی درندگی کا ثبوت دیا کہ مسلمانوں کا جوش انتقام بالآخر بھڑک اٹھا اور باشبوزق بھی اعتدال سے متجاوز ہو گئے، لیکن عیسائی بیانات میں تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا گیا ہے، چنانچہ ڈیو پوئی مذکورہ بالا رپورٹ کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

"یہ علانیہ کہا جاتا ہے کہ فلپو پولیس کا روسی نائب قنصل ان غمناک مصیبتوں کا تنہا ذمہ دار ہے جو بانک پر نازل ہوئی ہیں، علاوہ بریں بہت سے دیہاتوں میں خود بلغاریوں نے آگ لگا دی تا کہ وہاں کے باشندوں کو بغاوت پر مجبور کریں، سنگرلی کا گاؤں جو اس وقت صرف کھنڈر ہے شروع میں ایک پادری ہی نے اس میں آگ لگائی، یہ شخص لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر مجبور کرنے کی غرض سے ہاتھ میں چاقو لے کر ادھر ادھر دوڑتا پھرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ تمہاری مخلصی کا وقت اب آ گیا ہے اور روسی سپاہی ترکوں کے مقابلہ میں تمہاری

مدد کرنے کے لیے قریب پہنچ گئے ہیں، قابل اعتماد اور آزاد شہادت کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ بلغاریا کی بغاوت کا خاکہ احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ان لوگوں نے تیار کیا تھا، جو غیر علاقوں سے آئے تھے اور فوجی مصافیات (Tactics) کے ماہر اور تجربہ کار تھے، اگر ان کی تدبیریں کامیاب ہو جاتیں اور اہلِ بلغاریا ترکوں پر غلبہ حاصل کر لیتے تو کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں ترکی کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا اور بلغاریا والوں نے اس سے کہیں زیادہ مظالم کیے ہوتے جتنے مسلمانوں کے سر عاید کیے جاتے ہیں، کیوں کہ ابتدائے بغاوت ہی سے اول الذکر نے ہر ترک کو جو انھیں ملا عمر یا جنس کا لحاظ کیے بغیر قتل کر ڈالا اور متعدد مواضع پر ان کے ساتھ ناقابل بیان مظالم کیے، اس میں شبہ نہیں کہ سفاکیوں کا ارتکاب دونوں طرف سے ہوا ہے مثلاً مجھ سے قابل وثوق طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کارلوو کے مقام پر بلغاریوں نے ایک ترک لڑکے کی دونوں باہوں کی کھال کہنی تک کھینچ لی اور اوتلوکوئی میں بلغاریوں نے اسّی (۸۰) مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا اور ایک بچہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت علانیہ فروخت کیا، اس کے علاوہ عورتوں کے ساتھ ایسے وحشیانہ مظالم کیے کہ ان کا ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا۔‘‘(۱)

ترکوں کے انتقام کی خبر سب سے پہلے لندن کے اخبار ڈیلی نیوز (Daily News) میں شایع ہوئی جس کا نامہ نگار قسطنطنیہ میں مقیم تھا، اس خبر سے انگلستان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، مسٹر گلیڈسٹن (Gladstone) نے بلغاری سفاکیوں کو اپنی مسلسل تقریروں کا موضوع بنا کر سارے ملک میں ترکوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور پھر اسی عنوان سے ایک رسالہ لکھ کر شایع کیا جو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوا اور اس نے

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ، بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا ص ۲۸۷

اس آگ کو اور بھی بھڑکایا، حکومت برطانیہ کی طرف سے والٹر بیرنگ(walter Baring)واقعات کی تحقیق کے لیے روانہ کیا گیا، اس نے لکھا کہ ابتدا میں باغیوں نے (۱۳۶) مسلمانوں کو قتل کیا تھا مگر بعد کے قتل عام میں جب مسلمانوں نے انتقام لیا تو بارہ ہزار عیسائیوں سے کم ہلاک نہیں ہوئے۔(۱)

ڈیلی نیوز کے جس مقالہ نے ترکوں کے خلاف انگلستان میں ایجی ٹیشن کا آغاز کیا اس کی نسبت سرہنری ایسٹ ۲۵ر جولائی ۱۸۷۶ء کو لکھتے ہیں:

''میں یہ یقین کرنے کی وجہ رکھتا ہوں کہ ڈیلی نیوز کا نامہ نگار جس کے خطوط نے انگلستان کے لوگوں کو بلغاری سفاکیوں کی طرف اس قدر متوجہ کیا، ایک باغی سردار کے دو بلغاری عزیزوں کی باتوں سے فریب کھا گیا، ان میں سے ایک قسطنطنیہ میں ایک بلغاری اخبار کا اڈیٹر تھا، ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ جو اطلاع حاصل کی گئی ہوگی وہ محض ناقابل اعتماد خیال کی جاسکتی ہے۔''(۲)

چوں کہ اس بغاوت کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ یوروپ میں ترکوں کے خلاف اشتعال اور نفرت پھیلائی جائے اس لیے انتہائی مبالغہ آمیز خبریں بھی ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کرلی جاتی تھیں، سرہنری ایلیٹ ۶ر جولائی کو لکھتے ہیں:

''بغاوت کے فرو کرنے میں جو زیادتیاں کی گئیں وہ یقیناً بہت بڑی تھیں جیسا کہ اس فوج کی نوعیت کا لازمی تقاضا تھا جس سے فوری ضرورت کے موقع پر باب عالی کو مجبوراً کام لینا پڑا، لیکن یہ بھی اسی حد تک یقینی ہے کہ جو تفصیلات دی گئیں ہیں وہ تقریباً تمام تر روسی اور بلغاری ذرایع سے ماخوذ ہیں اور ان میں اس قدر شرم ناک حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ وہ زیادہ توجہ کی مستحق نہیں ہوسکتیں، نفرت انگیز مظالم

(۱) میریٹ ص ۲۳۰ (۲) رپورٹ پارلیمنٹ بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا، ص ۲۹۰

کے واقعات ایسے تفصیلی طریقہ سے مجھ سے بیان کیے گئے تھے کہ ان کی سچائی میں شبہ کرنا تقریباً ناممکن تھا، لیکن تفتیش کرنے سے وہ سراسر بناوٹی ثابت ہوئے۔"(۱)

بغاوت کی اسکیم یوں مرتب کی گئی تھی کہ انقلابی کمیٹیوں کے ایجنٹ باہر سے آکر عیسائیوں کو ابھارتے تھے جنھیں روسی مدرسوں کے تعلیم یافتہ پادری اور اسکول ماسٹر پہلے سے تیار کررہے تھے، یہ ایجنٹ لوگوں کو اس بات پر برانگیختہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ انواع واقسام کے مظالم کریں تاکہ عاجز آکر وہ انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر ان کے خلاف یورپ میں صدائے احتجاج بلند کی جاسکے، چنانچہ نائب قنصل کالورٹ (Calvert) ۲۹/اگست کو فلپو پولیس سے لکھتا ہے:

"عیسائی کمشنر جن میں سے ایک یوانچو آفندی (Youantcho) خود بلغاری ہے، بیان کرتے ہیں کہ انھیں اس امر میں مطلق شبہ نہیں کہ گذشتہ مئی کی ابتدائے شورش میں باغیوں کی طرف سے بڑے وحشیانہ مظالم کیے گئے اور ان مظالم کا ارتکاب عمداً کیا گیا تاکہ وہ بلغاریا میں عام بغاوت برپا کرنے کا بہترین ذریعہ ہوں، کیوں کہ اس کے بعد حاکم قوم کی طرف سے جس بے امتیاز انتقام کا ہونا لازمی تھا وہ عیسائیوں کی حالت کو اس قدر ناقابل برداشت بنادیتا کہ خواہ وہ کتنا ہی پرامن طریقہ سے رہنا چاہتے حفاظت خود اختیاری کے لیے انھیں مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا، منجملہ دیگر واقعات کے بلیک بے (Blacque) نے ٹرنوو کے قریب ایک گاؤں کے عیسائی باشندوں کی زبانی یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ شورش کے شروع میں باغیوں نے وہاں کے ایک دولت مند ترک کو پکڑا جس سے اس کی عدل پروری اور فیض رسانی کی وجہ سے

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا، ص ۲۹۱

مسلمان اور عیسائی دونوں یکساں محبت کرتے تھے اور اس کو زمین میں
کمر تک دفن کر کے پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دیا۔"(۱)

۴ر مئی کو اوتلوکوئی کی شورش کی اطلاع دیتے ہوئے سر ہنری الیٹ لارڈ ڈربی کو لکھتے ہیں:

"یہ معلوم تھا کہ انقلابی ایجنٹ اہل بلغاریا میں سرگرمی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں اور حال میں اسلحہ اور گولا بارود کثیر مقدار میں باہر سے لایا گیا ہے۔"(۲)

والٹر بیرنگ کی تحقیقات کے متعلق جو حکومت برطانیہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا سر ہنری الیٹ ۱۱ر اگست کو لارڈ ڈربی کو لکھتے ہیں:

"مسٹر بیرنگ کا ایک خط کل ملا جس میں یہ الفاظ درج ہیں:
اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گذشتہ بغاوت کے برپا کرنے میں فلپو پولیس کا روسی قنصل پیش پیش تھا۔"(۳)

یادداشت برلن: روس ایک طرف تو انقلابی کمیٹیوں کے ذریعہ سے بلقان کے ہر صوبہ میں بغاوت پھیلا رہا تھا اور دوسری طرف دول عظمٰی کا دباؤ ڈال کر باب عالی سے باغیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، چنانچہ اس کی تحریک سے آسٹریا اور پرشا بھی اس کے معاون ہو گئے اور ۱۱ر مئی ۱۸۷۶ء کو پرنس گورچاکوف، کاونٹ اندراسی اور پرنس بسمارک نے برلن میں باہم مشورہ کر کے باب عالی میں بھیجنے کے لیے ایک یادداشت مرتب کی جو 'یادداشت برلن' (Berlin Memorandum) کے نام سے مشہور ہے، اس میں مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے گئے۔

(۱) بوسنیا اور ہرزیگووینا میں بغاوت کی وجہ سے جتنے مکان منہدم ہو گئے ہیں وہ سب باب عالی کی طرف سے پھر بنا دیے جائیں، کاشت کاروں کو جتنے بیکوں اور

(۱) رپورٹ پارلیمنٹ، بحوالہ ضمیمہ سوانح مدحت پاشا ص ۴۸۹ (۲) ایضاً ص ۴۵۹ (۳) ایضاً ص ۲۸۸

سامانِ زراعت کی ضرورت ہو وہ فراہم کیے جائیں اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے باشندوں کو تین سال کا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔

(۲) بوسنیا اور ہرزیگووینا کے لیے ایک مخلوط کمیشن بٹھایا جائے، جس کے ارکان مسلمان اور عیسائی دونوں ہوں اور اس کمیشن کا صدر ایک مقامی عیسائی ہو۔

(۳) دونوں صوبوں سے بجز دس متعین قلعوں کے ترکی فوجیں ہٹالی جائیں۔

(۴) جب تک بوسنیا اور ہرزیگووینا میں اصلاحات مکمل طور پر نافذ نہ ہو جائیں اور امن وامان از سرِ نو قایم نہ ہو جائے عیسائیوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جائے۔

(۵) دولِ عظمٰی کے قنصلوں اور مندوبوں کو حق حاصل ہوگا کہ اپنی نگرانی میں یہ مطالبات پورے کرائیں۔

آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر فوجی کارروائیاں موقوف کر کے دو مہینے کی مدت میں یہ مطالبات پورے نہ کیے گئے تو دولت علیہ کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا۔

فرانس اور اٹلی نے بھی اس یادداشت سے اتفاق کیا، لیکن حکومت برطانیہ کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ روس، آسٹریا اور پرشا نے اس سے مشورہ کیے بغیر یادداشت کو مرتب کر لیا، چنانچہ اس نے اس کارروائی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے انگریزی بیڑے کو خلیج بسیکا میں جو دردانیال کے دہانہ پر واقع ہے لنگر انداز ہونے کا حکم دیا، برطانیہ کے اس طرز عمل سے 'یادداشت برلن' کی دھمکی بہت کچھ بے اثر ہوگئی اور مجوزہ مداخلت کا خیال ترک کر دیا گیا۔

دولت علیہ کی مشکلات: غرض دولت عثمانیہ کے لیے ہر طرف دشمنوں کا سامنا تھا، سارے بلقان میں بغاوت کی آگ پھیلتی جا رہی تھی، روس اور آسٹریا کی سرپرستی میں بوسنیا، ہرزیگووینا اور بلغاریا کی شورشیں جاری تھیں، مونٹی نگرو عنقریب اعلانِ جنگ کرنے والا تھا، سرویا روسی افسروں کی نگرانی میں پوری طرح مسلح ہو رہا تھا، رومانیا بھی لڑائی کی تیاریوں میں مصروف تھا، یوروپین پریس ترکوں کے خلاف منظم پروپگنڈا کر رہا تھا،

اندرونی حالت یہ تھی کہ خزانہ بالکل خالی تھا، حکومت کی باگ محمود ندیم پاشا کے ہاتھ میں تھی اور وہ دولت علیہ کے سب سے بڑے دشمن جنرل اگناتیف کے زیر اثر تھا، خود سلطان ان حالات سے بے خبر یا بے پروا اپنے تعیّشات میں منہمک تھا، سلطنت کے اندرونی معاملات میں یوروپین حکومتوں کی مداخلت روز بروز بڑھتی جارہی تھی، ''اندراسی نوٹ'' اور ''یادداشت برلن'' سے اس مداخلت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

سلطان کا عزل: ان حالات میں سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے کچھ محبّ وطن مدحت پاشا کے مکان پر جمع ہوکر غور وفکر کررہے تھے، بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سلطان کو معزول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں لیکن اس سے پہلے صدر اعظم محمود ندیم پاشا اور شیخ الاسلام حسن فہمی آفندی کو برطرف کرنا ضروری سمجھا گیا، ۱۰ رمئی کو شہزادہ عزالدین (سلطان کا سب سے بڑا لڑکا) وزارتِ جنگ کے دفتر کو جارہا تھا کہ راستہ میں کئی ہزار صوفتہ نے اسے روک کر سلطان کے پاس واپس بھیجا اور اس کے توسط سے یہ درخواست پیش کی کہ محمود ندیم اور حسن فہمی آفندی برخاست کردئے جائیں، سلطان اس مطالبہ کو مسترد نہ کرسکا اور اس نے دونوں کو موقوف کرکے محمد رشدی پاشا کو صدر اعظم اور حسن خیر اللہ آفندی کو شیخ الاسلام مقرر کیا، رشدی پاشا کے اصرار سے مدحت پاشا کو بھی وزارت میں جگہ دی گئی، لیکن کوئی خاص شعبہ ان کے سپرد نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد وزرا نے صورتِ حالات پر غور کرکے خود سلطان کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا لیکن سلطان کا عزل شیخ الاسلام کے فتوے کے بغیر ممکن نہ تھا، چنانچہ حسب ذیل استفتا کیا گیا:

> ''اگر امیر المومنین اختلالِ دماغ کا ثبوت دے، سلطنت کے معاملات سے عدمِ واقفیت ظاہر کرے، محاصلِ ملکی کو قوم وملک کی طاقت برداشت سے زیادہ ذاتی اخراجات میں صرف کرے، سیاسی اور مذہبی معاملات میں ابتری پیدا کرنے کا باعث ہو اور اس کا برسر حکومت

رہنا قوم و ملک کے لیے مضر ہو جائے تو ایسی صورت میں کیا اسے معزول کیا جا سکتا ہے؟''

شیخ الاسلام نے جواب دیا کہ معزول کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اس فتوے کے مطابق وزرا نے ۷ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ مطابق ۲۹ر مئی ۱۸۷۶ء کو سلطان عبدالعزیز کو معزول کر کے سلطان عبدالمجید خاں کے لڑکے شہزادہ مراد کو تخت پر بٹھایا، عبدالعزیز نے یہ دیکھ کر قسطنطنیہ کی فوج بھی وزرا کے زیر اثر آ گئی ہے، مزاحمت بے سود خیال کی اور خاموشی سے کنارہ کش ہو گیا۔

سلطان مراد خاں خامس

۷؍جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ (۲۹؍مئی ۱۸۷۶ء) لغایۃ ۱۲؍شعبان ۱۲۹۳ھ (یکم ستمبر ۱۸۷۶ء)

تخت نشینی کے بعد مراد نے تمام وزرا کو ان کی جگہ برقرار رکھا اور صدر اعظم رشدی پاشا کے نام ایک فرمان صادر کیا کہ وزرا غور وخوض کرنے کے بعد حکومت کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لیے اپنی رائے حضور سلطانی میں پیش کریں، اس نے خود اپنے ذاتی خیالات بھی اس فرمان میں ظاہر کیے مثلاً یہ کہ تمام رعایا کو بلا امتیاز نسل و مذہب پوری قانونی آزادی حاصل ہونی چاہیے تاکہ ان کے اندر قومی اور وطنی جذبات مستحکم ہوسکیں اور مختلف شعبوں خصوصاً شعبۂ مالیات کی ازسر نو تنظیم واصلاح کی جائے، اس نے لکھا کہ شعبۂ مالیات کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ کوئی خرچ اس وقت تک جائز نہ سمجھا جائے، جب تک سلطنت کے بجٹ میں پہلے سے منظور نہ کرلیا گیا ہو، چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے شاہی اخراجات میں سے تین لاکھ ترکی پونڈ سالانہ کی تخفیف کردی اور چند کوئلہ کی کانیں اور کارخانے جو شاہی ملک تھے صیغۂ مالیات کو دے دیے، مدحت پاشا اور ان کے ساتھیوں نے سلطان عبدالعزیز کے آخر عہد حکومت میں دستوری حکومت کا ایک خاکہ تیار کرلیا تھا، لیکن عبدالعزیز کی مطلق العنانی اور محمود ندیم اور اگناتیف کے اثر واقتدار کی وجہ سے وہ صرف مسودہ کی حد تک محدود تھا، مراد نے وعدہ کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہوگا یہ دستور نافذ کردیا جائے گا، کمال بے اور ضیا بے جو نہایت ممتاز شاعر اور اہل قلم

تھے، اس کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر کیے گئے اور سعد اللہ بے چیف سکریٹری کے عہدہ پر مامور ہوئے، یہ تقررات اس بات کے ضامن تھے کہ باب عالی کے خلاف قصر سلطانی کی سازشیں کامیاب نہ ہونے پائیں گی اور سلطنت کا کام ہمواری سے چلتا رہے گا۔

حامیانِ اصلاح اب تک کامیاب ہوتے چلے آئے تھے، سلطان عبدالعزیز کی معزولی سے بظاہر استبداد اور مطلقیت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور یہ انقلاب بغیر کسی کشت وخون کے عمل میں آیا تھا، مراد کی تخت نشینی سے بڑی بڑی توقعات قایم ہوگئی تھیں، لیکن سلطنت کی بدقسمتی سے وہ صرف تین مہینے حکومت کرسکا اور یہ ساری توقعات امید موہوم ثابت ہوئیں۔

جس روز مراد تخت پر بیٹھا اسی روز سے وزرانے محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اعصابی انتشار میں مبتلا ہے، چنانچہ بہترین ڈاکٹروں کے مشورہ سے علاج شروع کیا گیا اور امید کی جاتی تھی کہ تھوڑے دنوں کے بعد یہ شکایت جاتی رہے گی، لیکن دو واقعات یکے بعد دیگرے ایسے پیش آئے کہ ان سے اس کے اعصاب پر بے حد اثر پڑا اور صحت کی تمام امیدیں درہم برہم ہوگئیں۔

وفات عبدالعزیز: پہلا واقعہ سلطان عبدالعزیز کی خودکشی کا تھا، معزولی سے پانچ دن بعد اس نے ایک قینچی لے کر اپنی دونوں باہوں کی رگیں کاٹ ڈالیں، جن سے خون اس کثرت سے نکلا کہ وہ جانبر نہ ہوسکا، قسطنطنیہ کے سترہ ممتاز ڈاکٹروں نے جن میں ہر قوم کے لوگ تھے لاش کا معاینہ کر کے خودکشی کا خیال ظاہر کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ موت ان زخموں سے واقع ہوئی ہے جو قینچی سے دونوں باہوں میں کیے گئے تھے۔

کپتان حسن کا واقعہ: اس واقعہ سے مراد کے دماغ پر نہایت سخت اثر پڑا، دس روز بعد ایک دوسرا واقعہ پیش آیا، جس نے اس کو اور بھی زیادہ متاثر کیا، حسن نامی ایک چرکس کپتان کسی وقت سلطان عبدالعزیز کا ایڈی کانگ رہ چکا تھا، اس کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ اپنے آقا کا انتقام لینا چاہتا ہے، چنانچہ وزیر جنگ حسین عونی پاشا نے اسے بغداد جانے

کا حکم دیا لیکن وہ نہ گیا، اس پر عونی پاشا نے اسے قید کر دیا، دو دن قید میں رہنے کے بعد اس نے اطاعت کا اظہار کیا اور رہا کر دیا گیا، ۱۵؍ جون کو رات کے وقت جبکہ تمام وزرا مدحت پاشا کے مکان پر کابینہ کے ایک جلسہ میں شریک تھے چرکس حسن چھ بھرے ہوئے پستولوں سے مسلح ہو کر کسی طرح اس کمرہ میں داخل ہو گیا جہاں اجلاس ہو رہا تھا اور اندر پہنچتے ہی سب سے پہلے حسین عونی پاشا کو گولیوں کا نشانہ بنایا، اس کے بعد فوراً رشید پاشا، وزیر خارجہ کی طرف مڑا اور اسے بھی زخمی کیا، وزیر بحریہ قیصرلی احمد نے چاہا کہ جھپٹ کر حسن کے ہاتھ سے پستول چھین لے مگر حسن نے فوراً خنجر سے وار کر کے اسے گرا دیا، حسین عونی نہایت زخمی ہونے کے باوجود سیڑھیوں تک پہنچ گیا تھا، لیکن حسن نے اس کا پیچھا کیا اور گردن پر خنجر کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ عونی وہیں ٹھنڈا ہو گیا، اس کے بعد کمرہ میں واپس آ کر اس نے بے تحاشا ہر طرف گولی چلانی شروع کی اور اپنے تمام پستول خالی کر دیے، انہی گولیوں سے بتیوں کا جھاڑ بھی چور چور ہو گیا اور کمرہ میں اندھیرا ہو گیا، یہ تاریکی اس وقت بہت مفید ثابت ہوئی کیوں کہ محمد رشدی پاشا، خالد پاشا اور قیصرلی احمد پاشا، حسن کی زد سے بچ کر قریب کے ایک کمرہ میں پہنچ گئے اور دروازہ بند کر لیا اندھیرے میں مدحت پاشا کے کوٹ کی آستین حسن کے ہاتھ آ گئی مگر وہ خود بچ گئے، ان کا ایک ملازم احمد آغا گولیوں کی آواز سن کر دوڑا اور قاتل کو گرفتار کرنا چاہا مگر حسن نے وہیں اسے گولی سے مار کر ختم کر دیا، یہی حشر شکری بے کا ہوا جو وزیر بحر کا اڈی کانگ تھا اور اسے بچانے کے لیے دوڑا تھا، بالآخر فوجی پولیس کا ایک دستہ آیا اور فریقین کے درمیان کچھ دیر تک باقاعدہ جنگ ہوتی رہی، تب کہیں قاتل گرفتار ہوا، اسے عدالت سے پھانسی کی سزا دی گئی لیکن آخری وقت تک وہ اس سے انکار کرتا رہا کہ کوئی اور بھی اس کا شریکِ جرم ہے۔(۱)

معزولی کا سوال: ان حادثات کا اثر مراد کے دماغ کے لیے تباہ کن ثابت ہوا، اس کی

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۹۲-۹۳

صحت کی طرف سے اب مایوسی ہونے لگی، سلطنت کے لیے یہ صورتِ حال نہایت نازک تھی، مجلس وزرا میں دو جماعتیں قایم ہوگئیں، صدرِ اعظم محمد رشدی پاشا اور اکثر وزرا یہ جانتے تھے کہ مراد اصلاحات کا حامی ہے، اس لیے وہ اسے معزول کر کے اصلاحات کو خطرہ میں ڈالنے پر تیار نہ تھے، خصوصاً اس وجہ سے کہ آیندہ سلطان کے طرزِ عمل کے متعلق انھیں کوئی آگاہی نہ تھی، اس بنا پر ان کی رائے تھی کہ صبر سے کام لینا چاہیے اور مراد کی صحت یابی کا انتظار کرنا چاہیے۔

دوسری طرف سلطان کے بہنوئی داماد محمود جلال الدین پاشا کی پارٹی تھی، جس میں قصر سلطانی کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ فوج کے دو ایک باا‌ثر مارشل مثلاً ردیف پاشا کمانڈر قسطنطنیہ شامل تھے، یہ لوگ مدحت پاشا اور حامیانِ دستور کے خیالات سے متفق نہ تھے، وہ دیکھتے تھے کہ اگر مراد معزول نہ کیا جائے گا تو ان کی امیدیں پوری نہ ہوسکیں گی، کیوں کہ وزارت میں ان کی اقلیت تھی، قصر سلطانی میں ضیا بے اور کمال بے جیسے لوگوں کا اقتدار تھا اور باب عالی میں حامیانِ اصلاح کی حکومت تھی، لیکن اگر مراد معزول کردیا گیا اور شہزادہ عبدالحمید تخت پر آیا تو اصلاحات کی پوری اسکیم درہم برہم ہوجائے گی اور وہ خود برسرِ حکومت آجائیں گے، ان کے پیش نظر زیادہ تر اپنا ذاتی اقتدار تھا، اس پارٹی کی پشت پر رجعت پسندوں کی پوری جماعت تھی۔

بدقسمتی سے صورت حالات بھی اسی جماعت کے موافق تھی، عثمانی قانون کے رو سے کوئی ایسا شخص جس کا دماغ پوری طرح صحیح نہ ہو، سلطان نہیں ہوسکتا تھا، عثمان اول کی تلوار باندھنے کی رسم بھی جو تخت نشینی کی ایک ضروری اور نہایت اہم رسم تھی ابھی ادا نہیں ہوئی تھی، ابھی تک کوئی سلطان نماز جمعہ اور اس کے بعد کی رسم سلاملق سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا، ان موقعوں پر مراد کے موجود نہ ہونے سے عوام میں بجا طور پر تشویش پھیل رہی تھی، یورپین حکومتیں الگ دخل انداز ہو رہی تھیں، ان کے سفرا یہ سوال کرتے تھے کہ انھیں کب اور کس سلطان کے سامنے اپنے سفارت نامے پیش کرنے چاہئیں۔

ان حالات میں مجلس وزرا نے یہ فیصلہ کیا کہ مدحت پاشا، ولی عہد سلطنت شہزادہ عبدالحمید سے زبانی گفتگو کر کے یہ معلوم کر لیں کہ اصلاحات کے جاری کرنے میں اس کے تعاون پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور اگر اس طرف سے اطمینان ہو جائے تو اسے تخت پر بٹھانے سے پہلے مندرجہ ذیل شرایط منظور کرا لیے جائیں۔

(۱) بلا تاخیر جدید دستور حکومت کا اعلان کر دیا جائے گا۔

(۲) امور حکومت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کیا جائے گا۔

(۳) ضیا بے اور کمال بے کو کاتب خاص (پرائیویٹ سکریٹری) اور سعد اللہ بے کو باشکاتب (چیف سکریٹری) مقرر کیا جائے گا۔

مراد کا عزل: عبدالحمید نے مدحت پاشا کی یہ تینوں شرطیں منظور کر لیں، اس کے وعدہ پر اعتماد کر کے وزرا نے مراد کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا، معزولی سے پہلے صدر اعظم رشدی پاشا نے مراد کے دماغی اختلال کی نسبت قسطنطنیہ کے چھ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے تصدیق کرالی، ان سب نے متفقہ طور پر لکھا کہ اگر مدت دراز کے بعد خلافِ توقع مراد کا دماغ درست بھی ہو جائے تو بھی وہ اپنی اصلی حالت پر کبھی نہ آ سکے گا، چنانچہ اختلالِ دماغ کی بنا پر شیخ الاسلام نے اس کے عزل کا فتویٰ دیا اور ۱۲ر شعبان ۱۲۹۳ھ مطابق یکم ستمبر ۱۸۷۶ء کو وزرا نے اسے تخت سے اتار کر شہزادہ عبدالحمید کو اس کی جگہ بٹھایا۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی

۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء

عبدالحمید کو تخت پر لانے سے پہلے مدحت پاشا اوران کی پارٹی نے تین شرطیں اس سے منظور کرالی تھیں: (۱) قانون اساسی کا اعلان (۲) امور سلطنت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کرنا (۳) ضیا بے اور کمال بے کو کاتب خاص (پرائیویٹ سکریٹری) اور سعد اللہ بے کو باشکاتب (چیف سکریٹری) مقرر کرنا، لیکن عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد عبدالحمید نے آخری دو شرطوں کی مطلق پابندی نہیں کی اور پہلی شرط صرف نام کے لیے پوری کی، پہلے ہی تقررات سے اس کی آیندہ پالیسی کا اندازہ ہو گیا، اس نے داماد محمود جلال الدین پاشا کو مشیر سرائے سلطانی (Grand M: rshal the Palace) اور انگلیز سعید پاشا(۱) کو رئیس یاوریہ (فرسٹ ایڈی کانگ) کے عہدہ پر مقرر کیا، یہ دونوں مدحت پاشا کی جماعت کے خلاف تھے، لیکن چوں کہ ان عہدوں کا تعلق قصر سلطانی سے تھا، اس لیے ان کا تقرر تمام تر سلطان کی ذاتی رائے پر منحصر تھا مگر باشکاتب (چیف سکریٹری) کا معاملہ بالکل دوسرا تھا، یہ عہدہ دار ہمیشہ سے سلطان کا دستِ راست ہوتا آیا تھا اور اسی کے ذریعہ سے سلطان اور وزرا کے درمیان تمام

---

(۱) سعید پاشا نے چوں کہ انگلستان جا کر تعلیم حاصل کی تھی اس لیے ''انگلیز'' کا اضافہ اس کے نام میں کر دیا گیا تھا اور وہ اسی امتیاز کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

مراسلت ہوا کرتی تھی، چوں کہ وہ برابر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اس لیے اس کی اہمیت غیر معمولی تھی، اس کا عہدہ صدر اعظم کے عہدہ کے برابر اہم سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ مدحت پاشا نے عبدالحمید سے شروع ہی میں یہ طے کرلیا تھا کہ وہ اس جگہ پر سعد اللہ بے کو مقرر کرے گا، لیکن اس نے بجائے سعد اللہ بے کے سعید بے کو (جو محمود پاشا کا آدمی تھا) چیف سکریٹری مقرر کردیا، مدحت پاشا نے تمام وزیروں کی طرف سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی بہ اصرار درخواست کی لیکن عبدالحمید نے اپنا حکم نہ بدلا۔

صدارت مدحت پاشا: دسمبر ۱۸۷۶ء میں سلطان نے مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، پہلی ہی مجلس وزارت میں جو ان کے زیر صدارت محمود پاشا کے مکان پر منعقد ہوئی مخالف پارٹی کے ممبروں کی نیت ظاہر ہوگئی، جب قانون اساسی اور اس کے اعلان کا مسئلہ زیر بحث آیا تو جودت پاشا وزیر عدل نے جو محمود پاشا کی پارٹی میں خفیہ طور پر شامل تھا یہ تجویز پیش کی کہ دستور کا مسئلہ فی الحال ملتوی کردیا جائے کیوں کہ نئے سلطان کی تخت نشینی کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، مدحت پاشا کو اس پر سخت غصہ آیا اور انھوں نے جواب دیا کہ مراد کو معزول کرنے اور عبدالحمید کو تخت پر لانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دستور اساسی کا اعلان جلد سے جلد کردیا جائے، انھوں نے محمود، جودت اور ان کی پارٹی کے ممبروں کو صاف الفاظ میں متنبہ کردیا کہ اگر اس بنیادی مسئلہ کے طے کرنے میں کچھ بھی پس و پیش کیا گیا تو وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے، مصلحت دیکھ کر مخالفین اس وقت خاموش ہوگئے۔

ملک میں دستور کے اعلان کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا، اسی اثنا میں اخبار استقبال میں چند مضامین شایع ہوئے، جن سے دستور کی اشاعت کے متعلق سلطان کے خلوصِ نیت میں شبہ کا اظہار ہوتا تھا، یہ مضامین قصر سلطانی میں سخت ناگواری کی نظر سے دیکھے گئے اور یہ خیال کیا گیا کہ ان کا لکھنے والا ضیا بے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، چنانچہ سلطان نے ضیا بے کو قسطنطنیہ سے ہٹا دینے کا عزم کرلیا اور اسے بحیثیت سفیر کے

برلن بھیجنے کا حکم صادر کیا، اس سے یہ غرض بھی تھی کہ اہل قسطنطنیہ ضیا بے کو آیندہ پارلیمنٹ میں ممبر منتخب نہ کرسکیں جیسا کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا، اس کے بعد سلطان نے استقبال کی اشاعت بھی بند کر دی۔

دستور اساسی کا اعلان: بالآخر ۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو دستور اساسی کا اعلان کیا گیا، باب عالی کے سامنے کھلے میدان میں ایک وسیع شہ نشین بنا کر اسے پھولوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا، وہاں تمام اعیانِ حکومت، علما اور وزرا جدید دستور کا اعلان سننے کے لیے جمع ہوے، جس کی نسبت یہ توقع قایم کی گئی تھی کہ سلطنت عثمانیہ کے ایک نئے دور کا افتتاح کرے گا، سڑک پر دورویہ فوجوں کی قطار تھی، فوجی بینڈ کی آواز پر مجمع کی نگاہیں ادھر اٹھیں اور سعید پاشا پورے یونیفارم میں آتا ہوا دکھائی دیا، اس نے سلطان کا خط ہمایوں، جو صدر اعظم کے نام تھا اور جس کے ساتھ دستور اساسی کا مسودہ بھی تھا، لا کر مدحت پاشا کو دیا، خط ہمایوں اور دستور کا مسودہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا گیا اور اسی وقت دستور کی ہزاروں چھپی ہوئی نقلیں مجمع میں تقسیم کی گئیں، اس کے بعد مدحت پاشا نے تقریر کی جس میں سلطان کا شکریہ ادا کیا اور اس دستور کی اہمیت حاضرین کو سمجھائی، جب انھوں نے تقریر ختم کی تو مفتی اورنہ نے دعا مانگی اور سب نے آمین کہی اور ایک سو ایک توپوں کی سلامی کے ذریعہ قسطنطنیہ کے تمام باشندوں کو اطلاع دی گئی کہ دستور اساسی کا اعلان ہو گیا۔

اس دستور کے رو سے ایک پارلیمنٹ قایم کی گئی جو دو ایوانوں پر مشتمل تھی: دارالاعیان اور دارالمبعوثین، دارالاعیان کے ممبروں کا انتخاب نامزدگی کے ذریعہ اور دارالمبعوثین کے ممبروں کا کثرت رائے سے ہونا قرار پایا، پارلیمنٹ کے ماتحت ایک کابینہ وزارت بھی قایم کی گئی، سلطان کی تمام رعایا کو بلا امتیازِ مذہب وملت برابر حقوق دیے گئے اور حکومت کے عہدے سب کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے، دستور میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک قانون نافذ کیا جائے اور ان سب کا سرکاری نام خواہ وہ کسی قوم یا فرقہ سے تعلق

رکھتے ہوں 'عثمانی' قرار دیا گیا، اس کے علاوہ فرمان میں جلسوں اور پریس کی آزادی، عدل وانصاف کے قیام اور جبری تعلیم کا بھی وعدہ کیا گیا۔

دستور اساسی کے اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا، علما شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی کی قیادت میں، عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ، شاکر آفندی جو قسطنطنیہ کے کبار علما میں تھے طلبہ کی جماعت لے کر اور دار السلطنت کے عام باشندے جھنڈے لیے ہوئے جن پر 'آزادی' کا لفظ منقوش تھا، مدحت پاشا کے مکان پر مبارک باد دینے کے لیے آئے، شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا، لوگ مشعلیں لیے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور ''سلطان زندہ باد'' اور ''مدحت پاشا زندہ باد'' کے نعرے لگاتے تھے، سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارک باد کے تار آئے، جن میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا، دوسرے روز صبح کو مدحت پاشا یونانی اور آرمینی بطریقوں اور یہود کے بڑے ربی کے پاس گئے، ان کی مبارک باد کا شکریہ ادا کیا اور انھیں ترغیب دی کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ایک علم کے نیچے متحد ہو کر کام کریں، بطریقوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ مسلمان اور عیسائیوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کیوں کہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔

ایک بدگمانی: عیسائی رعایا کے لیے دستور اساسی کا اعلان خواہ کتنی ہی مسرت کا باعث ہوا ہو، یوروپین حکومتوں خصوصاً برطانیہ کو یہ چیز پسند نہ آئی کیوں کہ اس سے دولت علیہ کے اندرونی معاملات میں ان کی مداخلت کا بہت کچھ سد باب ہو رہا تھا، چنانچہ سب سے پہلا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس دستور کا مقصد محض دولِ یورپ کی اس کانفرنس کو شکست دینا تھا جو عیسائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قسطنطنیہ میں منعقد ہونے والی تھی، یہ صحیح ہے کہ دستور کا اعلان اسی روز ہوا جس روز کانفرنس منعقد ہوئی لیکن اس کے لیے مدحت پاشا اور ان کے ساتھی ایک سال سے کوشش کر رہے تھے جیسا کہ سر ہنری الیٹ سفیر برطانیہ کے ایک خط سے صاف معلوم ہوتا ہے، جو رسالہ نائنٹینتھ سنچری (Ninteenth Century)

بابت فروری ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا تھا، سرہنری لکھتے ہیں:

''دسمبر ۱۸۷۵ء کے شروع میں مجھ سے مدحت پاشا کے ایک ساتھی نے بیان کیا جو سلطنت کے بعض اعلیٰ ترین عہدوں پر مامور رہ چکا تھا کہ مدحت پاشا کی پارٹی کا مقصد ایک دستور اساسی حاصل کرنا تھا، یہ واقعہ دستور کے اعلان سے ایک سال سے زیادہ پہلے کا ہے، جبکہ یہ کہا گیا کہ دستور کا اعلان محض اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کانفرنس کو شکست دی جائے جو اس وقت قسطنطنیہ میں منعقد کی گئی تھی، چند دنوں کے بعد مدحت پاشا خود مجھ سے ملنے آئے اور اپنے خیالات کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح بیان نہیں کیا تھا، گو میں ان خیالات کے عام منشا سے واقف تھا، انھوں نے بیان کیا کہ سلطنت تیزی کے ساتھ بربادی کی طرف لائی جارہی ہے، رشوت ستانی اور دوسری بے عنوانیاں جس حد تک پہونچ چکی ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں پہونچی تھیں، سرکاری محکمے روپے سے بالکل خالی ہیں، لیکن کروڑوں روپیے قصر سلطانی میں پہونچ رہے ہیں، صوبے گورنروں کی بے روک ٹوک سے جنھوں نے اپنے عہدے قصر سلطانی سے خریدے ہیں برباد ہورہے ہیں، جب تک پورا انظام نہ بدل دیا جائے کوئی چیز سلطنت کو بچا نہیں سکتی، مدحت پاشا کے نزدیک اس کا واحد علاج یہ تھا کہ پہلے سلطان پر قابو حاصل کیا جائے، اس طرح کہ وزرا کو ذمہ دار بنا کر بالخصوص مالیات میں ایک قومی مجلس عمومی کا جواب دہ بنا دیا جائے، دوسرے یہ کہ اس مجلس کو حقیقی طور پر قومی بنایا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ مختلف طبقوں اور مذہبوں کے تمام امتیازات مٹا دئے جائیں اور عیسائیوں کو بالکل مسلمانوں کے مساوی حقوق دے دئے جائیں،

تیسرے یہ کہ مرکزیت توڑ کر مقامی حکومت قایم کردی جائے اور گورنروں کو صوبہ جاتی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے، یقیناً اسے تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ خیالات روشن خیالی پر مبنی اور مدبرانہ تھے اور حوصلہ افزائی کے مستحق تھے، مدحت پاشا نے بار بار اس کا ذکر کیا کہ انگریز قوم کی ہمدردی مصلحین کے لیے کس قدر قیمتی ہوگی اور کس طرح ان کے ہم وطن انگلستان کی مثال کو سامنے رکھ کر اس کی تقلید کرنی چاہتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان کے قایم کیے ہوئے اصولوں پر جو تجویزیں مرتب کی جائیں گی، انہیں ہر انگریز جو میری طرح مطلقیت کے لیے دستوری حکومت کی پابندیوں کے فوائد کا قائل ہے ضرور پسند کرے گا اور ان کی کامیابی چاہے گا، میں نے دیانت داری کے ساتھ انہیں اس کا یقین دلایا تھا کہ کیوں کہ بلاشبہ سب سے آخری چیز جس کی میں توقع کرسکتا تھا یہ تھی کہ جو لوگ اس ملک میں دستوری اصولوں کے لیے اپنی سرگرمی کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں وہی سب سے پہلے ان لوگوں کی تحقیر و تذلیل اور ان کی تجویزوں کا استہزا کریں گے جو ان اصولوں کو اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"(۱)

اس موقع پر برٹش پارلیمنٹ کے ایک ممبر جوزف کاوین (Joseph Cowen) کی ایک تقریر کا اقتباس بھی بے محل نہ ہوگا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ کے ارباب حکومت ترکی میں دستوری حکومت کے قیام کو کس نظر سے دیکھتے تھے، مسٹر کاوین ۳۱ر جنوری ۱۸۸۰ء کو انگلستان کی خارجی پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ترکی میں سالوں سے ایک سرگرم اور محب وطن پارٹی

---

(۱) سوانح مدحت پاشا۔

موجود ہے، جو اپنے ادارت کو مغربی طرز زندگی اور یوروپین ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش کر رہی ہے، اس پارٹی کا سیدھا سادا پروگرام یہ ہے کہ اس جزیرہ نما کی مختلف قوموں کو باہم ملا کر ایک متحدہ حکومت قایم کی جائے، جس کی بنیاد سب کی مذہبی اور سیاسی مساوات پر ہو، فواد پاشا اور عالی پاشا نے ان اصولوں کے لیے مدت تک جدوجہد کی اور اب انہی اصولوں کو اسی خلوص کے ساتھ مدحت پاشا اور ان کے حامی پیش کر رہے ہیں، ہر مذہب اور قوم کے لوگ ایک ہی سطح پر رکھے جائیں گے، اس پروگرام کی تائید عیسائی اور مسلمان دونوں یکساں طور پر کر رہے ہیں مگر ان ترک مصلحین کی مخلصانہ کوششوں کا ذکر جس حقارت کے ساتھ انگلستان کے لبرل سیاست داں کرتے تھے وہ اس بحث کے منجملہ دیگر قابل افسوس واقعات کے ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوس ناک واقعہ تھا، جو بھی ترکی دستور پر آوازے کستا یقیناً یہ لبرل گورنمنٹ کے حامیوں کا کام نہ تھا کہ وہ اس کے لیے تحقیر و استہزا کا طریقہ اختیار کرتے، بلاشبہ ایسی حکومت کے قیام کا تصور ناممکن نہیں ہے جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں متحد ہوں اور جو مہلک اثر اس وقت قسطنطنیہ پر غالب ہے، وہ ترکی کی سیاسی زندگی سے دور کر دیا جائے۔"(۱)

قسطنطنیہ کی کانفرنس: ۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو جس روز قانون اساسی کا اعلان ہوا قسطنطنیہ میں دولِ عظمیٰ کے نمایندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ابتدائی کارروائی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارہ سے توپوں کی آواز آنے لگی، صفوت پاشا وزیر خارجہ دولت عثمانیہ نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کیا اور کہا کہ 'ان توپوں کی

(۱) تقریرات جازف کاؤین مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء

آواز جو آپ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے اعلان قانونِ اساسی کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثنا سلطنت کی تمام رعایا کے حقوق وحریت کا کفیل ہے، کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہوگیا، اب اس کا انعقاد اور اس کی کارروائیاں فضول ہیں' صفوت پاشا کی تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا، چند لمحوں کے بعد اگناتیف نے مہر خاموشی توڑی اور یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیے، دول عظمیٰ کے وکلا ایک مہینہ سے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور باہم جلسے کر رہے تھے، ان جلسوں میں ترک مندوبین عمداً شریک نہیں کیے گئے تھے، ۲۳ر دسمبر کے باضابطہ اجلاس سے پہلے وہ لائحۂ عمل جو دولت علیہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا طے کرلیا گیا تھا، اس غیر معمولی کارروائی کا مقصد باب عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرنس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہوگا اور باب عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ دول عظمیٰ کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا چوں کہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کرلیے گئے تھے اس لیے کانفرنس کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اپنے فیصلوں کو باضابطہ طور پر مرتب کردے، چنانچہ کانفرنس کی کارروائی روسی سفیر کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبہ بلغاریا کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے، وہاں ایک عیسائی والی مقرر کیا جائے، ایک قومی ردیف قایم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں، ترک مندوبین کے اس جواب پر کہ یہ امور دائرۂ بحث سے بالکل خارج اور قطعاً ناقابل قبول ہیں، یہ تجویز یوں ترمیم کردی گئی کہ بلغاریا کو ایک خاص رعایتی گورنمنٹ دے دی جائے، ایک بین الاقوامی کمیشن اس کے انتظامات کی نگرانی کے لیے مقرر کردیا جائے اور اس کے گورنر کا تقرر دولِ عظمیٰ کی منظوری سے ہوا کرے، اگناتیف نے یہ تجویز کم سے کم مطالبہ کے طور پر پیش کی تھی، ترک مندوبین نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ سرویا اور رومانیا کی مثالیں سامنے ہیں، جن کو مخصوص رعایتی حکومتیں دی گئی تھیں اور وہی خاص انتظامات ان کے لیے بھی کیے گئے تھے جو بلغاریا کے لیے تجویز ہو رہے ہیں لیکن نتیجہ کو دیکھتے ہوئے اسی تجویز کو بلغاریا میں

دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا، انھوں نے بتایا کہ سرویا اور رومانیا کی مسلمان آبادی کے ساتھ رواداری اور مساوات کا وہ سلوک نہیں کیا گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا اور جو بطور شرط کے منظور کیا گیا تھا، برخلاف اس کے وہاں کے مسلمان باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے، علاوہ بریں یہ ریاستیں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے بعد بھی جب کہ انھیں کسی قسم کی شکایت کا موقع باقی نہ رہ گیا، سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں سے اتحاد کرنے یا اس کے خلاف سازش کرنے سے کبھی باز نہ آئیں، بالآخر طویل بحث ومباحثہ کے بعد دول عظمیٰ کے نمایندوں کی طرف سے کم سے کم مطالبہ یہ پیش کیا گیا جس میں اب کسی تخفیف کی گنجایش نہ تھی کہ مقامی حکام کی مدد کے لیے ایک قنصلی کمیشن مقرر کر دیا جائے اور بلغاریا، ہرزیگووینا اور بوسنیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دولِ عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کیے جائیں، ترک مندوبین اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کر سکے، انھوں نے کہا کہ قنصلی کمیشن کا تقرر قوم کے حقوقِ خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہوگا، جسے منظور کرنا ہمارے اختیارات سے باہر ہے، اس کے علاوہ ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لیے کوئی مخصوص انتظام کر دینے سے سلطنت کے دوسرے صوبوں میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور غالب ہے کہ بعض میں شورش بھی رونما ہو جائے، انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ یہ موقع سلطنت کے کسی ایک حصہ کے لیے مخصوص مراعات حاصل کرنے کا نہیں ہے جب کہ سلطان کی طرف سے ایک ایسے دستور کا اعلان کر دیا گیا ہے، جس میں بلا امتیاز تمام رعایا کو سلطنت کے ہر حصہ میں زیادہ سے زیادہ امکانی آزادی اور مساوی حقوق دیے گئے ہیں، اس پر جنرل اگناتیف نے ایک نہایت سخت تقریر کی جس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا اور ارکان مجلس نے ترک مندوبوں کی اس احتجاجی تقریر کے سننے کا بھی انتظار نہیں کیا جو اگناتیف کی تقریر کے جواب میں وہ کرنا چاہتے تھے۔(۱)

---

(۱) سوانح مدحت پاشا ص ۳۵-۱۳۳

مجلس عالیہ کا فیصلہ: بہرحال یہ آخری ترمیم شدہ تجویز دولِ عظمیٰ کے نمایندوں نے ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابل اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہوجائیں گے، مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمایندے شریک کیے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ آخری تجویز پیش کی گئی، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف صاف بتادیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کردی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس کے بعد حاضرین نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا، رؤف بے بن رفعت پاشا نے کہا کہ 'لڑائی مثل بخار کی بیماری کے ہے جس سے بچنا ممکن ہے لیکن کانفرنس کی تجویز مثل پھیپھڑوں کی دق کے ہے جس کا لازمی نتیجہ قبر ہے'، صاوا پاشا نے ایک طویل خطبہ میں کہا کہ ہم اپنی عزت کی اہانت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں، وکیل بطریق ارمنی نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس میں کانفرنس کے مطالبات کے مسترد کرنے پر زور دیا(۱) غرض مجلس نے متفقہ طور پر دولِ عظمیٰ کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کردیا، دولِ عظمیٰ کے الٹی میٹم کے خلاف مجلس عالیہ کا یہ فیصلہ یقیناً تعجب خیز تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ اتفاق واتحاد تھا جو اس نازک موقع پر وطن کی محبت اور عزت کے لیے مجلس کے مسلمان، عیسائی اور یہودی ممبروں میں ظاہر ہو رہا تھا، یونانی اور کیتھولک آرمینی ممبروں کا جوش خصوصیت کے ساتھ بہت نمایاں تھا، باب عالی نے مجلس کے اس فیصلہ کی اطلاع دولِ عظمیٰ کے نمایندوں کو دے دی، چنانچہ ۲۰ رجنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوگئے اور کانفرنس برخاست ہوگئی۔

روس سے جنگ: روس نے جنگ کی تیاری شروع کردی، ۱۶راپریل ۱۸۷۷ء کو اس نے رومانیا کے ساتھ اس شرط پر کہ اس کی آزادی اور خودمختاری تسلیم کرلی جائے گی ایک معاہدہ کرلیا جس کے مطابق روسی فوجوں کو رومانیا کے علاقوں سے گذرنے کی اجازت مل

(۱) اسباب الانقلاب العثمانی از محمد روحی بک الخالدی مطبوعہ مصر ۱۳۲۶ھ

گئی، اس کے بعد ۲۴ راپریل کو روس نے دولت عثمانیہ کے خلاف باضابطہ اعلان جنگ کر کے اپنی فوجوں کو عثمانی سرحدوں کے عبور کرنے کا حکم دیا اور پانچ روز کے بعد مونٹی نیگرو نے بھی صلح توڑ کر از سر نو جنگ شروع کر دی۔

روس نے پہلے ہی کافی تیاری کر لی تھی، رومانیا کے علاوہ اس نے آسٹریا کی طرف سے بھی اطمینان کر لیا تھا، زار نے رایشٹاٹ (Reichstadt) میں شہنشاہِ آسٹریا سے خود ملاقات کر کے اسے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا مطلق ارادہ نہیں رکھتا، نیز یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ اگر اس جنگ میں آسٹریا غیر جانبدار رہا تو بصورتِ فتح بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے اس کے حوالہ کر دئے جائیں گے، جنگ شروع کرنے کے چند دنوں بعد (۸رجون ۱۸۷۷ء) روس نے انگلستان کی غیر جانبداری بھی اسی قسم کے ایک معاہدہ سے حاصل کر لی اور وعدہ کیا کہ مصر اور نہر سویز سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور نہ قسطنطنیہ یا آبنائے باسفورس پر حملہ ہوگا۔

بحر اسود پر ترکی بیڑا قابض تھا، اس لیے روسیوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رومانیا کی راہ سے حملہ آور ہوں، اہل رومانیا نے نہ صرف روسی فوجوں کو اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت دی بلکہ ان کے امیر شہزادہ چارلس اور وزیر اعظم نے ملکی پارلیمنٹ پر دباؤ ڈال کر یہ تجویز بھی منظور کرالی کہ روس کی حمایت میں رومانی فوجیں بھی میدان جنگ میں روانہ کر دی جائیں لیکن روسی جنرل گورچاکوف (Gortchakoff) نے رومانی فوجوں کی خدمات قبول کرنے سے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا، باب عالی نے رومانیا کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر جو دولت علیہ کی ایک باج گذار ریاست تھی، رومانی شہر کلفات (Kalafat) پر گولہ باری کا حکم دیا، رومانیا نے اس کے بعد باضابطہ طور پر اعلانِ جنگ کر کے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

۲۲رجون ۱۸۷۷ء کو روسی فوجوں نے دریائے ڈینوب کو عبور کر لیا اور اب بلغاریا میدانِ جنگ بن گیا، ۲۷رجون کو انھوں نے سستو ا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر

ےرجولائی کوٹرنوو پر جو بلغاریا کا قدیم پایہ تخت تھا قبضہ کرلیا، اس کے بعد جنرل گورکو کوہِ بلقان کو طے کرتا ہوا درۂ شبکہ پرحملہ آور ہوا اور اسے ترکوں سے لے لیا، روس کے لیے اب اور نہ اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا، اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی نومسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا، تمام عثمانی افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کرکے روسیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا، محمد علی کے پہونچتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا، جنرل گورکو اپنے بلغاری حلیفوں کی مدد کے باوجود ستارازگورا میں شکست کھا کرکوہِ بلقان کی طرف بھاگا، اسی اثنا میں عثمان پاشا ودین سے نکل کر پلونا میں آگئے تھے، جو دریائے ڈینوب کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، جنرل شلدر نے حملہ کرنے میں عجلت کی مگر اس کی فوج کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہو کر نانکوپولیس میں پناہ لینی پڑی، اس کے بعد ایک دوسری روسی فوج جنرل کرودٹنر کی قیادت میں آگے بڑھی لیکن اسے بھی اپنے آٹھ ہزار مقتول میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا، پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فتوحات کے لیے سب سے بڑا سنگِ راہ ثابت ہوا۔

پلونا: مسٹر ایلین فلپس اس موقع پر لکھتے ہیں: ''اب جنگ کا سارا نقشہ یک بیک بدل گیا تھا، زار یگریڈ قسطنطنیہ پر فاتحانہ شوکت وجلال کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا وہ خواب جو باوجود گذشتہ تلخ تجربات کے روسی اب تک دیکھ رہے تھے نسیاً منسیاً ہوگیا، فی الحال تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ نہیں بلکہ روسی سلطنت موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تمام یورپ کی نظریں انتہائی بیم ورجا کے ساتھ اس محاربہ پر جمی ہوئی تھیں، جو بلغاریا کے ایک معمولی شہر کے گرد رونما تھا اور جس کے انجام سے سارے مشرق کی قسمت وابستہ تھی، روسی مستقر جنگی میں اس خطرہ کا پورا احساس تھا، گرینڈ ڈیوک نکولس نے محمد علی کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لیے فوج کا ایک حصہ چھوڑا اور فوج کے اصلی حصہ کو جس کی تعداد ستر ہزار تھی ہمراہ لے کر بسرعت تمام پلونا پہنچا، یہاں پہونچ کر ۱۱رستمبر کو اس نے ایک زبردست حملہ کیا جس کے متعلق امید واثق تھی کہ وہ پچھلی ناکامیوں کی کافی سے زیادہ

تلافی کردے گا، اس کا انجام سنگین تر ہوا، اس میں شک نہیں کہ داہنے بازو پر رومانیوں اور بائیں بازو پر سکوبلیف نے ترکی مقامات پر قبضہ کرلیا لیکن مرکزی حملہ خوفناک خوں ریزی کے ساتھ جس میں سولہ ہزار مقتول و مجروح ہوئے پسپا کردیا گیا، ان سب سے زیادہ تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے موصول ہوئی جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو میلیکاف کے زیر کمان تھے سرحد پار بھگا کر غازی کا لقب اختیار کرلیا تھا۔"(۱)

پے در پے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہو گیا کہ پلونا کو فتح کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کا محاصرہ سختی سے کرلیا جائے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی، تقریباً پانچ ماہ تک حیرت انگیز استقلال اور جاں بازی کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روسیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب سامانِ رسد بالکل ختم ہو گیا تو عثمان پاشا اپنے بتیس ہزار فاقہ کش سپاہیوں کو لے کر قلعہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور اس مہم کے آخر معرکہ میں شجاعت کے انتہائی جوہر دکھا کر ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۷ء کو انھیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ایشیا میں بھی ترکوں کو متعدد شکستیں ہوئیں، روسیوں نے دوبارہ سرحد عبور کر کے قارص، ارض روم اور طرابزون پر قبضہ کرلیا، سرویا کو یہ موقع بہت غنیمت معلوم ہوا، اس نے دولت علیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے نیش کے اہم شہر کو فتح کرلیا، دوسری طرف مونٹی نگرو، اسپزا اور ڈسینو پر قابض ہو گیا۔

پلونا کی تسخیر کے بعد جنرل گورکو روسی فوج کے بڑے حصہ کو لے کر صوفیا کی طرف بڑھا اور ۵ر جنوری کو اس پر قبضہ کرلیا، ۲۸ر جنوری کو گرانڈ ڈیوک نکولس جو تمام افواجِ روس کا سپہ سالار اعظم تھا، فاتحانہ شان سے اورنہ میں داخل ہوا۔

سقوطِ اورنہ کی خبر سے انگلستان اور آسٹریا میں سخت بے چینی پیدا ہوئی، روس نے شروع ہی میں ان دونوں حکومتوں سے وعدہ کرلیا تھا کہ بوسنیا اور قسطنطنیہ سے کوئی تعرض

(۱) تاریخ یورپ جدید از ایلیسن فلپس مترجمہ رشید احمد صدیقی

نہ کیا جائے گا لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان فتوحات کے بعد بھی وہ اپنے وعدہ پر قایم رہے گا اسی گھبراہٹ میں آسٹریا نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک فوج کوہِ کارپیتھین میں تعینات کردی اور انگلستان نے ایک بحری بیڑہ خلیج بسیکا میں روانہ کیا، جو دردانیال کے دہانہ پر واقع ہے، انگلستان کو یہ خطرہ تھا کہ اورنہ کی فتح کے بعد جب کہ ترکوں کی فوجی قوت ٹوٹ چکی ہے، خود قسطنطنیہ کا مسخر ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں نے ابتداے جنگ میں وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ کی مخالفت کی تھی اور روس کے مقابلہ میں سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے تھے، انھوں نے بھی اب اپنی رائے بدل دی اور قسطنطنیہ پر روسی قبضہ کے خلاف خواہ وہ عارضی کیوں نہ ہو شدت کے ساتھ صداے احتجاج بلند کی، اسی شورش کا نتیجہ تھا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے بحری بیڑے کو خلیجِ بسیکا سے نکل کر دردانیال میں داخل ہونے کا حکم دیا اور اس اندیشہ سے کہ اب روس سے جنگ چھڑ جانا یقینی ہے، پارلیمنٹ سے مصارف جنگ کے لیے ساٹھ لاکھ پونڈ کی منظوری کی درخواست کی، علاوہ بریں حکومت برطانیہ نے روس کو متنبہ کر دیا کہ اگر اس نے قسطنطنیہ کی طرف کوئی قدم اٹھایا تو یہ اقدام برطانیہ کے ساتھ جنگ کا اعلان سمجھا جائے گا۔

مضبطہ اورنہ: اس اثنا میں روس اور دولت علیہ کے درمیان صلح کی گفتگو ہوتی رہی اور ۳۱ جنوری ۱۸۷۸ء کو فریقین کے نمایندوں نے عارضی صلح کے لیے اورنہ میں ایک نوشتہ پر دستخط کر دیے، جو "مضبط اورنہ" کے نام سے مشہور ہے، اس تحریر کے رو سے باسفورس اور دردانیال میں روسی حقوق کی توثیق کی گئی اور طے پایا کہ تاوانِ جنگ میں جس کی نوعیت بعد کو متعین ہوگی، روس کو ادا کیا جائے گا، یہ بھی طے پایا کہ بلغاریا ایک خودمختار اور باج گذار ریاست بنا دی جائے گی اور اس کی حکومت قومی اور عیسائی ہوگی، نیز اس میں ایک قومی ردیف تعینات رہے گی، مونٹی نیگرو، رومانیا اور سرویا کو خودمختاری دی جائے گی، مونٹی نگرو کے مقبوضات وسیع کیے جائیں گے، رومانیا کو تاوانِ جنگ مقبوضات کی شکل میں

دیا جائے گا، سرویا کی سرحدیں از سر نو درست کی جائیں گی، بوسنیا اور ہرزیگوویناکو اپنے معاملات میں آزادی دے دی جائے گی اور ایسی ہی اصلاحات دوسرے عیسائی صوبوں میں بھی نافذ کر دی جائیں گی، اس صلح نامہ کے رو سے رستچق، سلسٹریا اور ودین کے قلعے روس کے حوالہ کر دیئے گئے اور بلغاریا میں ترکوں کا قبضہ صرف وارنا کے ضلع پر باقی رکھا گیا۔

اس عارضی صلح کے بعد گرانڈ ڈیوک نکولس نے اپنا فوجی مستقر بحر مارمورا کے ساحل پر سان اسٹیفانو میں قایم کیا، جہاں سے قسطنطنیہ کے منارے نظر آتے تھے، برطانیہ نے اپنے جنگی جہازوں کو جزائر الملوک سے کچھ فاصلہ پر جہاں سے قسطنطنیہ نظر آتا تھا، مستعد رہنے کا حکم دیا، اندیشہ تھا کہ روس اور برطانیہ میں عنقریب جنگ چھڑ جائے گی، آسٹریا بھی آمادۂ پیکار نظر آتا تھا، کاونٹ اندراسی نے علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ جو شرائط اورنہ میں طے ہوئے ہیں وہ آسٹریا ہنگری کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہیں۔

معاہدۂ سان اسٹیفانو: اس درمیان میں ۳؍ مارچ ۱۸۷۷ء کو روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان "معاہدۂ سان اسٹیفانو" پر دستخط ہو گئے، جس کے شرائط مضبط اورنہ میں پہلے ہی طے ہو گئے تھے، اس معاہدہ کے رو سے قسطنطنیہ، صوبہ تھریس اور اورنہ ترکوں کے قبضہ میں رہنے دیئے گئے، سرویا، رومانیا اور مونٹی نگرو خود مختار مملکتیں قرار دی گئیں اور ان کے رقبوں میں اضافہ کر دیا گیا، سرویا کو نیش اور مٹروو ٹیزا کے ضلع دیئے گئے اور مونٹی نگرو میں بوسنیا کے کچھ ٹکڑے اور اسپیز انتی داری اور ڈیسنو کی بندرگاہیں جو ساحل ایڈریاٹک پر واقع ہیں شامل کر دی گئیں، روس اور آسٹریا کی نگرانی میں بوسنیا اور ہرزیگوینا میں ان اصلاحات کے فوراً نافذ کیے جانے کا وعدہ کیا گیا، جو قسطنطنیہ کی کانفرنس میں پیش کی گئی تھیں، رومانیا کو جو کچھ ملا وہ اس کی توقع سے بہت کم تھا، اسکو صرف دوبروجا کا علاقہ دیا گیا جو ایک غیر زرخیز علاقہ تھا اور اس میں جو تھوڑی بہت آبادی تھی وہ بھی بلغاریوں اور ترکوں پر مشتمل تھی لیکن دوبروجا کے معاوضہ میں بسرآبیا کا وہ حصہ جس میں رومانیوں کی آبادی کثرت سے تھی اور جو "صلح نامۂ پیرس" کے رو سے علاحدہ کر کے مولڈیویا میں شامل کر دیا گیا تھا، پھر

زار کو واپس کر دیا گیا اور اس میں ایک چھوٹے سے علاقہ کا اور بھی اضافہ کر دیا گیا، جس سے روس کی سلطنت دریائے ڈینوب تک پہنچ گئی، اس صلح نامہ کی سب سے اہم دفعہ بلغاریا سے متعلق تھی، بلغاریا کو ایک باج گذار خود مختار ولایت بنا کر اس کا رقبہ دریائے ڈینوب سے بحر انجین اور بحر اسود تک وسیع کر دیا گیا اور اس میں مشرقی رومیلیا اور مقدونیا کے علاقے بھی شامل کر دیئے گئے، طے پایا کہ اس کے لیے ایک عیسائی حکمراں خود وہیں کے باشندے منتخب کریں، جس کا تقرر روسی کمشنر کی نگرانی میں دو سال کے لیے ہو، نیز پچاس ہزار سپاہیوں کی ایک قومی ردیف (ملیشیا) مقرر کی جائے، بلغاریا کی اس جدید ولایت کے قایم کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ باب عالی سے اس کے دوسرے صوبوں مثلاً مقدونیا، اپائرس اور البانیا کا براہِ راست تعلق منقطع ہو جائے، مندرجہ بالا تبدیلیوں کے علاوہ باب عالی کی طرف سے بلقان کے دوسرے صوبوں میں اصلاحات کے جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا، یونان کے رقبہ میں کوئی اضافہ نہیں منظور ہوا، البتہ تھسلی، اپائرس اور کریٹ میں بھی اصلاحات کا وعدہ کیا گیا، ایشیا میں قارص، اردہان، بایزید اور باطوم کے ضلعے روس کو ملے، ارض روم دولت علیہ کو واپس کر دیا گیا، یہ بھی طے پایا کہ سواحل ڈینوب کے سارے قلعے منہدم کر دیئے جائیں، اس کے علاوہ سلطنت عثمانیہ پر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ بھی عاید کیا گیا۔

اس معاہدہ کی مخالفت: معاہدۂ سان اسٹیفانو کے شایع ہوتے ہی ہر طرف سے احتجاج کی آواز بلند ہوئی، یونان نے حکومت برطانیہ سے اپیل کی کہ اس کے حقوق کی مطلق پروا نہیں کی گئی، سرویا نے شکایت کی کہ اس کے بعض علاقے بلغاریا میں شامل کر دیئے گئے، اہل البانیا نے ایک انجمن قایم کر کے عہد کیا کہ اپنے ملک کا کوئی ٹکڑا علاحدہ نہ ہونے دیں گے اور اس کے لیے "آخر دم تک مقابلہ کریں گے"، رومانیا نے اس معاوضہ پر جو اس کی خدمات کے صلہ میں اسے دیا گیا تھا، روس کو سخت لعنت ملامت کی اور احتجاج کیا کہ جب تک ان تمام حکومتوں کی منظوری حاصل نہ ہو جائے، جنھوں نے "عہد نامۂ پیرس"

میں اس کے حقوق متعین کر دیے تھے، محض روس اور باب عالی کی باہمی مفاہمت سے اس کے مقبوضات میں کوئی ترمیم جائز نہیں ہوسکتی، حکومت برطانیہ نے یونان اور رومانیا دونوں کو اطمینان دلایا کہ آیندہ کانگرس میں ان کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے گا لیکن برطانیہ کے نزدیک معاہدۂ اسٹیفانو کی مخالفت سب سے زیادہ اس لیے ضروری تھی کہ جدید بلغاریا محض ایک روسی صوبہ بن کر رہ جائے گا اور روس کے لیے قسطنطنیہ کی راہ پھر کھلی رہے گی، روس کی گذشتہ تاریخ سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا تھا کہ مشرقی عیسائیوں کے ساتھ اس کی ہمدردی بے لوث نہ تھی، جدید بلغاریا کو اگرچہ معاہدۂ مذکور کے رو سے ایک خود مختار مملکت قرار دیا گیا تھا، تاہم آیندہ دستورِ حکومت کے لیے یہ پابندی کہ وہ ایک شاہی روسی کمشنر کے زیرِ نگرانی مرتب کیا جائے گی اور اس پر عمل درآمد بھی دو سال تک روس ہی کی نگرانی میں ہوگا، صاف طور پر بتا رہی تھی کہ اس خود مختار مملکت کی حیثیت روس کے ایک صوبہ سے زیادہ نہ ہوگی، برطانیہ اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا، لیکن صرف برطانیہ ہی معاہدۂ سان اسٹیفانو کا مخالف نہ تھا، آسٹریا کو بھی اس سے شدید اختلاف تھا، راشٹاٹ (Reichstadt) میں جو گفتگو شہنشاہ اور زار کے درمیان ہو چکی تھی، اس کے رو سے آسٹریا، بوسنیا اور ہرزیگووینا پر فوجی قبضہ رکھنے کا دعویدار تھا، فرانس بھی اپنے مصالح کی بنا پر اس معاہدہ کا مخالف تھا۔

روس اور برطانیہ کا خفیہ معاہدہ: غرض ہر طرف سے معاہدۂ سان اسٹیفانو کی مخالفت شروع ہوئی اور ایک جدید بین الاقوامی کانگریس کا مطالبہ کیا جانے لگا، پرشا کے وزیر اعظم بسمارک نے کانگرس کے انعقاد کے لیے برلن کا مقام تجویز کیا اور ایک ''ایماندار دلال'' کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں، روس نے کانگرس کی شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ معاہدۂ اسٹیفانو کے صرف وہی دفعات کانگرس کے سامنے رکھے جائیں جن کو پیش کرنا روس مناسب خیال کرے، حکومت برطانیہ کو اصرار تھا کہ تمام دفعات پیش کیے جائیں، اس مسئلہ پر برطانوی وزارت میں اختلاف پیدا ہوگیا اور

لارڈ ڈربی نے استعفا دے کر وزارتِ خارجہ لارڈ سالسبری کے سپرد کر دی، جو ترکی سیاست سے پوری طرح واقف تھا اور ہی روز پیشتر قسطنطنیہ کی کانفرنس میں شرکت کر کے انگلستان واپس آیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ اور روس میں جنگ عنقریب چھڑ جائے گی، چنانچہ لارڈ بیکنس فیلڈ وزیر اعظم نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہندوستانی فوجیں مالٹا روانہ کر دی گئیں، دوسری طرف وزیر خارجہ نے ایک گشتی مراسلہ دوسری دول عظمیٰ کے پاس بھیج کر ان اعتراضات کو واضح کر دیا جو حکومت برطانیہ کو معاہدۂ سان اسٹیفانو پر تھے، زار نے یہ دیکھا کہ آسٹریا بھی جنگ کے لیے آمادہ ہے اور رومانیا میں بھی روس کی بے وفائی کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، علاوہ بریں خود اس کی سلطنت میں بھی بے اطمینانی کے آثار نمایاں تھے، ان حالات سے مجبور ہو کر اسے برطانیہ کی خواہش کے مطابق کانگرس کا انعقاد منظور کرنا پڑا، دونوں حکومتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں وزارتِ برطانیہ نے وعدہ کیا کہ وہ کانگرس میں صلح نامۂ سان اسٹیفانو کے تمام اہم دفعات سے متعلق روس کی حمایت کرے گی، اس شرط کے ساتھ کہ جدید بلغاریا کی قطع و برید میں روس برطانیہ کا ساتھ دے گا، یہ معاہدہ بالکل خفیہ تھا لیکن وزارتِ خارجہ کے ایک ملازم کی غلطی سے اس کی اطلاع پریس کو ہو گئی، اس معاہدہ کے رو سے جدید بلغاریا کے تین حصے کیے جانے والے تھے، جو حصہ دریائے ڈینوب اور سلسلۂ کوہِ بلقان کے درمیان پڑتا تھا اس کا انتظام سان اسٹیفانو کی تجویز کے مطابق قایم رکھا گیا یعنی سلطان کے زیر سیادت یہ ایک خود مختار مملکت قرار پایا اور اس کے فرماں روا کے انتخاب کا حق وہیں کے باشندوں کو دیا گیا، دوسرے حصہ کو بھی جو کوہِ بلقان کے جنوب میں واقع تھا حکومت خود اختیاری کے حقوق دیے گئے، لیکن اس پر بابِ عالی کی نگرانی بہ نسبت پہلے حصہ کے زیادہ رکھی گئی، یہ حصہ مشرقی رومیلیا کے نام سے موسوم ہوا، تیسرے حصہ کے متعلق جو بحر ایجین کے ساحل پر واقع تھا اور جس کی آبادی میں بلغاری، سروی، یونانی اور مسلمان سب شامل تھے، یہ طے پایا کہ دولت عثمانیہ کو واپس کر دیا جائے، اس

شرط کے ساتھ کہ دوسرے یوروپین صوبوں کی طرح باب عالی کی طرف سے اس میں بھی اصلاحات جاری کردی جائیں گی، یہ حصہ اس وقت سے مقدونیا کہا جاتا ہے۔

برلن کانگریس: اس معاہدہ کے طے ہو جانے کے بعد ۱۳ر جون ۱۸۷۸ء کو دولِ عظمیٰ کے نمایندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس بسمارک کے زیر صدارت برلن میں منعقد ہوئی، ویانا کی کانگریس کے بعد جو ۱۸۱۵ء میں منعقد ہوئی تھی یہ اپنی قسم کی سب سے زیادہ اہم یوروپین کانگریس تھی، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کو ان تمام مسائل پر از سر نو بحث وتصفیہ کا حق حاصل ہے، جو "معاہدۂ سان اسٹیفانو" میں مذکور تھے، لیکن بہت جلد یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدہ کی وجہ سے کانگریس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے کیوں کہ صدارت کی کرسی پر اگرچہ بسمارک متمکن تھے لیکن کانگریس میں لارڈ بیکنس فیلڈ ہی کی شخصیت چھائی ہوئی تھی، ایک ماہ کے بحث ومباحثہ کے بعد جس میں اکثر یہ اندیشہ ہونے لگتا تھا کہ ساری گفت وشنید درہم برہم ہو جائے گی، ۱۲ر جولائی کو ایک معاہدہ مرتب ہو گیا اور ارکان کانگریس نے اس پر دستخط کر دئے۔

عہد نامۂ برلن: عہد نامۂ برلن کے رو سے معاہدۂ سان اسٹیفانو کے وہ شرائط جو اپنے اثرات کے اعتبار سے نہایت دوررس تھے بہت کچھ معتدل کر دئے گئے، سب سے زیادہ اہم مسئلہ بلغاری مملکت کی تکوین کا تھا، اب بجائے اس کے کہ ایک ایسا بلغاریا معرضِ وجود میں آتا جو اپنی وسعت کے لحاظ سے دریائے ڈینوب سے مجمع الجزائر تک پھیلا ہوتا، جدید خود مختار ولایت کی جنوبی سرحد بلقان سے محدود کر دی گئی، جنوبی بلغاریا کو جواب مشرقی رومیلیا کے نام سے موسوم ہوا حکومتِ خود اختیاری کے حقوق دئے گئے لیکن یہ طے پایا کہ اس کے والی کی نامزدگی باب عالی کی طرف سے ہوگی، روس کو بسرابیا کا وہ حصہ دیا گیا جو ۱۸۵۶ء میں رومانیا کو ملا تھا، ایشیا میں باطوم، اردہان اور قارص پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے ایک غیر متعین مدت کے لیے آسٹریا کے حوالہ کر دئے گئے، جسے نووی بازار کے سنجق پر بھی فوجی قبضہ رکھنے کی اجازت دی گئی،

رومانیا کو دوبروجا کے ساتھ بحر اسود پر بندرگاہ قسطنطنیہ دی گئی، بلغاریا کا ایک حصہ نکال کر سرویا میں شامل کر دیا گیا، تھسلی اور مقدونیا کے متعلق یونان کے جو مطالبات تھے وہ مسموع ہوئے لیکن منظور نہ ہوئے، ایک خفیہ معاہدہ کے رو سے جو ۴/ جون کو حکومت برطانیہ اور باب عالی کے درمیان طے ہوا تھا لیکن ۹/ جولائی کو کانگریس کے سامنے پیش ہوا، جزیرۂ قبرص انگلستان کے حوالہ کر دیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ سالانہ خراج پابندی سے باب عالی میں پیش ہوتا رہے گا، مونٹی نگرو کو وہ تمام مقامات دے دیے گئے جن کا وعدہ معاہدۂ سان اسٹیفانو میں کیا گیا تھا، یہ علاقہ پہلے سے آزاد تھا، عہد نامۂ برلن میں اس کی آزادی کا اعلان ازسرِنو کر دیا گیا تاکہ اسے بین الاقوامی ضمانت حاصل ہو جائے۔

غرض عہد نامۂ برلن نے معاہدۂ سان اسٹیفانو کو تقریباً تمام تر باطل کر دیا، بلغاریا عظمیٰ کے بجائے جو ڈینوب سے بحر ایجین تک اور بحر اسود سے مقدونیا کی جھیلوں تک پھیلی ہوتی، سلطان کی فرماں روائی میں ایک چھوٹی سی خود مختار باج گذار حکومت قایم کر دی گئی، جس کی سرحدیں ڈینوب، کوہِ بلقان، بحر اسود، سرویا اور مقدونیا کی سرحدوں سے محدود کر دی گئیں، کوہِ بلقان کے جنوب میں 'مشرقی رومیلیا' کے نام سے ایک خود مختار صوبہ قایم کیا گیا، جو براہِ راست سلطان کی سیاسی اور فوجی حکومت کے تحت میں رکھا گیا، لیکن اس کا انتظام ایک عیسائی گورنر جنرل کے سپرد ہوا جس کے تقرر کے لیے یہ طے پایا کہ باب عالی کی نامزدگی اور دولِ یورپ کی منظوری سے پانچ سال کے لیے ہوا کرے، یہ بھی قرار پایا کہ بلغاریا کے فرماں روا کا انتخاب وہاں کے باشندے خود کریں اور اس کا تقرر دولِ عظمیٰ کی منظوری کے بعد باب عالی کی طرف سے عمل میں آئے لیکن ان بڑے شاہی خاندانوں کے ارکان کے لیے جو اس وقت برسرِ حکومت تھے، اس عہدہ کی امیدواری ممنوع قرار دی گئی، طے پایا کہ جب تک بلغاریا کی 'مجلس اعیان' دستور حکومت مرتب نہ کرے حکومت کا انتظام ایک روسی کمشنر کے سپرد کر دیا جائے مگر اس عارضی انتظام کی مدت صرف نو ماہ کے لیے محدود کر دی گئی، مشرقی رومیلیا کی تنظیم ایک یوروپین کمیشن کو

تفویض ہوئی اور اس کے لیے تین ماہ کی مدت متعین کی گئی، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا ہنگری کے قبضہ وانتظام میں دے دیے گئے، لیکن ایک خفیہ معاہدہ کے رو سے جو آسٹریا اور باب عالی کے درمیان ۱۳ر جولائی ۱۸۷۸ء کو طے ہوا یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ قبضہ 'عارضی' سمجھا جائے گا، رومانیا کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا، اس کی آزادی کے لیے یہ شرط قرار پائی کہ جنوبی بسرابیا کا علاقہ روس کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کے معاوضہ میں رومانیا جنوبی دوبروجا کے لینے پر قناعت کرے، یونان نے کریٹ اور ان عثمانی صوبوں کا مطالبہ کیا تھا جو یونانی حکومت کی سرحد پر واقع تھے، فرانس کے نمایندہ ویڈنگٹن (Waddington) نے کانگریس سے اس کی پرزور سفارش کی، لیکن لارڈ بیکینس فیلڈ نے ان مطالبات کی مخالفت کی اور کانگریس نے صرف اس قدر کیا کہ باب عالی سے سفارش کر دی کہ یونان میں تھسلی اور اپائرس کا ایک حصہ شامل کر دیا جائے، عہد نامۂ برلن کی دفعہ (۶۱) کے رو سے باب عالی نے آرمینیا کے عیسائیوں کی مقامی ضروریات کے مطابق جلد سے جلد اصلاحات جاری کر دینے کا وعدہ کیا، نیز اس بات کی ضمانت کی کہ آرمینی عیسائی چرکسوں اور کردوں کی دست برد سے محفوظ رکھے جائیں گے، باب عالی نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ ان اصلاحات کی اطلاعیں متعین وقفوں کے بعد دولِ عظمٰی کو دی جاتی رہیں گی، معاہدۂ قبرص کے رو سے برطانیہ نے آرمینیوں کے تحفظ کی ذمہ داری خاص طور پر اپنے سر لے لی اور اصلاحات کے وعدہ کے معاوضہ میں جو سلطان کی طرف سے کیا گیا تھا، دولت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات کو روس کے آیندہ حملوں سے محفوظ رکھنے کا عہد کیا، جزیرۂ قبرص اس وقت تک کے لیے برطانیہ کے حوالہ کر دیا گیا جب تک روس گذشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھا لے، یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلہ کے لیے وہاں سامانِ جنگ تیار رکھ سکے، سلطان کی فرماں روائی کا حق قایم رکھنے کے لیے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔

عہد نامۂ برلن نے یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا تقریباً خاتمہ کر دیا، عثمانی صوبوں کے بجائے یونان، رومانیا، سرویا، مونٹی نیگرو اور بلغاریا کی خود مختار حکومتیں قایم ہوگئیں، جن کا تعلق باب عالی سے محض سالانہ خراج کی حد تک رہ گیا، جو صوبے براہ راست باب عالی کے زیر حکومت رہ گئے ان میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو چکی تھی، چنانچہ باوجود اس کے کہ ۱۸۷۸ء کے بعد سے سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے آخر عہد حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی، دولت علیہ کو مسلسل مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہنا پڑا، علاوہ بریں مذکورہ بالا خود مختار مملکتوں کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہی اور دولِ عظمیٰ کے کسی نہ کسی رکن نے انھیں مدد پہنچا کر دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

مونٹی نیگرو کی نزاع: سب سے پہلی نزاع مونٹی نیگرو سے پیش آئی، عہد نامہ برلن کے رو سے مونٹی نیگرو کا رقبہ معاہدۂ پیرس کے مقابلہ میں دو چند سے زیادہ ہو گیا تھا اور اس کی آبادی ایک لاکھ چھیانوے ہزار سے بڑھ کر دو لاکھ اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، چند اہم مقامات اس میں شامل کر دئے گئے تھے، نیز انتی واری کا علاقہ مع بندرگاہ کے اس کے حوالہ کر دیا گیا تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ جنگی جہاز نہ رکھے جائیں گے، برلن کانگرس نے ڈیسینو کی بندرگاہ کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ دولت عثمانیہ کو واپس کر دی جائے اور اسپائنسا (Spica) کا موضع جو خلیج انتی واری کے دہانہ پر واقع تھا، مونٹی نگرو سے نکال کر آسٹریا ہنگری کی سلطنت میں شامل کر دیا تھا، اس کے معاوضہ میں البانیا کے دو شہر گوسنجہ اور پلاوا مونٹی نیگرو کو دے دئے گئے تھے، باب عالی نے مونٹی نیگرو کی آزادی تسلیم کر لی اور مونٹی نیگرو نے اس رقبہ کی مناسبت سے جو سلطنت عثمانی سے علاحدہ کر کے اس میں شامل کر دیا گیا تھا عثمانی قرضہ جات کے ایک جزو کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی مگر کانگرس کے اس فیصلہ سے البانیا کے باشندوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی، انھوں نے گوسنجہ اور پلاوا کو مونٹی نیگرو میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے ایک 'البانی لیگ' قایم کی اور دونوں قوموں

میں جنگ شروع ہوگئی، بالآخر دولِ یورپ نے یہ فیصلہ کیا کہ گوسنجہ اور پلاوا سلطنت عثمانیہ کو واپس کردئے جائیں اور ان کے معاوضہ میں ڈیسنو کا علاقہ اور بندرگاہ پھر مونٹی نیگرو کو دے دیا جائے، باب عالی نے اس فیصلہ کو نامنظور کردیا، لیکن برطانیہ کی تحریک پر جس کی عنانِ وزارت گلیڈسٹن کے ہاتھ میں آچکی تھی دول یورپ کا ایک جنگی بیڑا استمبر ۱۸۸۰ء کو ڈیسنو کے سامنے نمودار ہوا اور باب عالی کو مجبور ہوجانا پڑا۔

یونان کا قضیہ: یونان کا مسئلہ مونٹی نیگرو سے بھی زیادہ دشوار تھا، عہد نامۂ برلن میں اس کے رقبہ کی توسیع کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا، دولِ عظمیٰ نے صرف اتنا کیا تھا کہ اپائرس اور تھسلی کے الحاق سے متعلق باب عالی سے یونان کی سفارش کردی تھی، عہد نامۂ مذکور کے تکملہ کے بعد تین سال تک دولِ عظمیٰ رہا ستہائے بلقان کی جدید سرحدوں کے متعین کرنے میں مصروف رہیں اور جب رومانیا، بلغاریا، سرویا اور مونٹی نیگرو کی سرحدوں کا معین ہونے لگا تو یونان نے بھی اپائرس اور تھسلی کا مطالبہ پیش کر کے بین الاقوامی تصدیق حاصل کرنی چاہی، چنانچہ برلن میں دولِ عظمیٰ کی ایک کانفرنس نے اس مطالبہ کی سماعت کر کے باب عالی سے سفارش کی کہ تھسلی اور اپائرس کا پورا علاقہ مملکت یونان میں شامل کردیا جائے لیکن سلطان نے اسے منظور نہ کیا اور چوں کہ دولِ عظمیٰ یونان کی خاطر اس وقت دولت علیہ سے جنگ چھیڑنے پر آمادہ نہ تھیں، اس لیے یہ مسئلہ بدستور قایم رہا پھر بھی گفت وشنید کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور دو سال کی جدوجہد کے بعد بالآخر ۱۸۸۱ء میں یہ طے پایا کہ تھسلی کا تقریباً پورا علاقہ اور اپائرس کا ایک ثلث یونان میں شامل کردیا جائے، یانینا اور دوسرے اضلاع جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی، یونانی سرحد سے باہر رکھے گئے۔

مشرقی رومیلیا اور بلغاریا کا اتحاد: عہد نامۂ برلن کے مطابق بلغاریا کے عضوی قانون کی ترتیب وتکمیل تک انصرامِ حکومت ایک روسی کمشنر کے سپرد کردیا گیا تھا، دسمبر ۱۸۷۸ء میں مجلس وضع دستور (Conatitunt Assembly) کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۲۶ رفروری ۱۸۷۹ء کو کمشنر مذکور نے اس مجلس کو طلب کر کے عضوی قانون کی

ترتیب کا مسئلہ پیش کیا، خود کمشنر نے دستور حکومت کا جو مسودہ تیار کیا تھا اسے نوجوان ارکانِ مجلس نے ترمیم و تنسیخ کے بعد ایک حد درجہ جمہوری دستور بنا دیا، اس دستور کے مطابق مجلس قانون ساز میں صرف ایک ہی ایوان رکھا گیا، ہر شخص جس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی اور جو لکھنا پڑھنا جانتا تھا بشرطے کہ وہ کوئی پادری یا فوجی سپاہی نہ ہو یا ملکی حقوق سے محروم نہ کر دیا گیا ہو، اس مجلس کے لیے منتخب ہونے کا حق رکھتا تھا، ملک کے تمام مرد اس کے رائے دہندہ بنائے گئے، جماعتِ عاملہ کا کام آٹھ وزیروں کی ایک مجلس کے سپرد کیا گیا، ان کی نامزدگی حکمراں کے ہاتھ میں رکھی گئی، لیکن جواب ۵۶ مجلس ملیہ کے ٹھہرائے گئے، ارکانِ مجلس کے انتخاب کے بعد حکمرانِ مملکت کے انتخاب کی باری آئی، عام رائے پرنس الکزنڈر آف بیٹن برگ (Alexander of Batten Berg) کے موافق تھی، مجلس ملیہ کے نزدیک اس کے انتخاب کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ تھی کہ وہ زار الکزنڈر دوم کا عزیز تھا اور زار اسے بلغاریا کا حکمراں منتخب کرانا چاہتا تھا، چنانچہ اپریل ۱۸۷۹ء میں اس کا انتخاب بلا کسی اختلافِ رائے کے ہو گیا اور اس نے بلغاریا پہونچ کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد الکزنڈر اور بلغاریا کی مجلس ملیہ میں اختلافات شروع ہو گئے، الکزنڈر اگرچہ ملک کی خدمت کا پورا ولولہ اپنے اندر رکھتا تھا، تاہم وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ روس کا آدمی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وزارتیں سرعت کے ساتھ تبدیلی ہونے لگیں اور بہت جلد الکزنڈر اور اس کے روسی مددگاروں کو معلوم ہو گیا کہ یہ دستور حکومت کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں الکزنڈر نے اس دستور کو منسوخ کر دیا اور دو سال تک بغیر کسی قومی مجلس کے حکومت کرتا رہا، دو روسی جنرل اس کی حمایت کے لیے پٹروگراڈ سے بھیجے گئے، انھوں نے وزارت پر اپنا اقتدار بہت جلد قایم کر لیا اور الکزنڈر کو محسوس ہونے لگا کہ اس کی حیثیت محض ایک نام کے فرماں روا کی ہے، اس کے لیے دستور حکومت کو دوبارہ نافذ کر دینے کے علاوہ اب اور کوئی صورت نہ تھی،

چنانچہ ۱۸۸۳ء میں اس نے مجلس ملیہ پھر طلب کی، ملک میں جو برہمی اس کے خلاف پھیلی ہوئی تھی وہ دستور کے جاری ہوتے ہی جاتی رہی لیکن اب روس کے تیور بدل گئے، دونوں روسی جنرل بلغاریا سے روانہ ہو گئے اور نئے زار الکزنڈر سوم نے اپنے عزیز کے خلاف توقع رویہ پر ناراضگی ظاہر کی، شہزادہ الکزنڈر نے بہت کوشش کہ روس سے مخالفت کی نوبت نہ آئے لیکن جن لوگوں نے اسے اپنا فرماں روا منتخب کیا تھا، ان کے سیاسی حوصلوں سے متفق ہونے کے بعد محال تھا کہ وہ روس کو بھی راضی رکھ سکے، اس وقت اہل بلغاریا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مشرقی رومیلیا کا صوبہ جو برلن کانگریس کے فیصلہ کے مطابق باب عالی کو واپس کر دیا گیا تھا، اپنی مملکت میں شامل کر لیں، مشرقی رومیلیا کا نظام حکومت دولِ عظمیٰ کے ایک کمیشن نے اس طرز پر مرتب کیا تھا کہ وہ بھی بلغاریا کا ایک 'ناقص مثنیٰ' نظر آتا تھا اور دونوں میں نمایاں فرق صرف یہ تھا کہ ایک کا حکمراں خود اسی کا منتخب کردہ تھا اور دوسرے کی حکومت ایک عیسائی گورنر کے سپرد تھی، جس کا تقرر پانچ سال کے لیے باب عالی کی طرف سے ہوا تھا۔

ابتدا ہی سے کوہِ بلقان کے ہر دو سمت کے بلغاریوں کی خواہش تھی کہ یہ دونوں ولایتیں متحد کر دی جائیں، چنانچہ ستمبر ۱۸۸۵ء میں مشرقی رومیلیا کے پایہ تخت فلپو پولیس کے باشندوں نے اسی غرض سے علم بغاوت بلند کر کے بلغاریا سے اتحاد کا اعلان کر دیا اور اہل رومیلیا کے ایک وفد نے شہزادہ الکزنڈر کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے فلپو پولیس آنے کی دعوت دی، الکزنڈر کا تامل دیکھ کر ایک بلغاری مدبر اسٹامبولوف (Stambuloff) نے صاف الفاظ میں اس سے کہا کہ یا تو حضور فلپو پولیس کی دعوت قبول فرمائیں یا خاموشی کے ساتھ اپنے جرمن وطن کو واپس تشریف لے جائیں، الکزنڈر نے پہلی صورت کو ترجیح دی، فلپو پولیس میں متحدہ بلغاریا کے فرماں روا کی حیثیت سے اس کا استقبال شاندار طریقہ پر کیا گیا۔

سرویا اور بلغاریا کی جنگ: لیکن یہ معاملہ معاہدہ برلن کی صریح خلاف ورزی تھا،

باب عالی کے علاوہ دولِ عظمیٰ بھی الکزنڈر کی اس خودسری پر برافروختہ ہوئیں اور انھوں نے اس کے متعلق آپس میں مراسلت شروع کردی مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی عملی قدم بڑھا سکیں، بلغاریا پر سرویا کے غیر متوقع حملہ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کرلیا، سرویا کا جذبۂ رشک بلغاریا کے اس اقدام سے بھڑک اٹھا تھا، جزیرہ نمائے بلقان میں توازنِ قوت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے اپنی مملکت کی توسیع ضروری معلوم ہوئی، چنانچہ اس غرض سے پہلے تو اس نے عثمانی مقبوضات پر دست درازی کے لیے فوجیں اکٹھا کیں لیکن پھر دولت علیہ کی قوت سے خائف ہوکر اچانک ۱۴ر نومبر ۱۸۸۵ء کو بلغاریا کی سرحد پر حملہ کردیا، اہل بلغاریا نے جو قومی جوش سے سرشار ہورہے تھے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ۱۹ر نومبر کو سلیونٹزا (Slivintza) کے معرکہ میں حملہ آوروں کو زبردست شکست دی، ان کی اس خلاف توقع کامیابی نے سارے یورپ کو حیرت میں ڈال دیا، کیوں کہ سرویا ایک طاقتور حکومت تھی اور بلغاریا سے بہت پہلے آزاد ہوچکی تھی، علاوہ بریں بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کے اتحاد سے زار اس درجہ برافروختہ ہوا تھا کہ اس نے جنگ شروع ہونے سے قبل ہی تمام روسی افسروں کو جو بلغاریا کی فوج میں تھے روس واپس بلالیا تھا، بہرحال سلیونٹزا کی فتح کے بعد بلغاری فوج نے حملہ آوروں کا تعاقب کیا اور سرویا کی سرحد عبور کرکے آگے بڑھی، بلغراد کا راستہ اب کھلا ہوا تھا لیکن عین اس وقت دولِ عظمیٰ نے مداخلت کی اور حکومت آسٹریا نے الٹی میٹم دے دیا کہ بلغاری فوج ذرا بھی آگے بڑھے گی تو آسٹریا کی طرف سے اعلانِ جنگ کردیا جائے گا، دولِ عظمیٰ کے دباؤ سے مجبور ہوکر بلغاریا کو صلح کرلینی پڑی اور اسے اپنی فتوحات سے دست بردار ہوجانا پڑا، سرویا تاوانِ جنگ سے بھی بری کردیا گیا۔

اتحاد بلغاریا کی تکمیل: لیکن اس جنگ سے بلغاریا کو ایک نمایاں فائدہ یہ پہنچا کہ مشرقی رومیلیا کے اتحاد کی بنا پر دولِ عظمیٰ میں اس کے خلاف جو مراسلت شروع ہوگئی تھی موقوف ہوگئی اور بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کا اتحاد تسلیم کرلیا گیا، البتہ زار نے اس کی

شدید مخالفت کی، حالاں کہ 'برلن کانگریس' میں اسی کی طرف سے اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا جارہا تھا، ایسا ہی تعجب خیز برطانیہ کا طرز عمل تھا، اس نے نہ صرف اس اتحاد کی موافقت کی بلکہ اپنے اثر سے سلطان کو بھی اسے منظور کر لینے پر راضی کرلیا، معاہدہ برلن میں یہ طے ہوا تھا کہ مشرقی رومیلیا کا گورنر باب عالی کی طرف سے مقرر ہوگا، اس دشواری کو حل کرنے کے لیے سلطان نے اپریل ۱۸۸۶ء میں شہزادہ الکزنڈر ہی کو اس صوبہ کا گورنر مقرر کردیا، اس کے بعد دونوں ولایتوں کا اتحاد عملاً مکمل ہوگیا، روس کو بھی بدرجہ مجبوری یہ اتحاد تسلیم کرنا پڑا لیکن زار نے الکزنڈر کی یہ خودسری معاف نہیں کی، بلغاریا میں ایک سازش کرنے والی روسی جماعت اب بھی موجود تھی اس نے رات کے وقت الکزنڈر کے محل میں گھس کر اسے گرفتار کرلیا اور تاج وتخت سے دست برداری کی ایک تحریر جبراً اس سے حاصل کرلی، اس کے بعد اس جماعت نے اسے سرحد پار سلطنت روس میں پہنچادیا، اس واقعہ سے بلغاریا میں روس کے خلاف سخت شورش برپا ہوئی، جماعت ملی نے اسٹامبولوف کی رہبری میں روسی جماعت کو ملک سے باہر نکال دیا اور پھر شہزادۂ الکزنڈر کو واپس آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ فاتحانہ تزک واحتشام کے ساتھ دوبارہ صوفیا میں داخل ہوا، لیکن اب کی بار وہ روس کی مخاصمت اور زار کی خفگی کا مقابلہ نہ کرسکا اور باوجود اس کے کہ بلغاریا کی جماعت ملی، اس کی حمایت کے لیے ہر طرح مستعد تھی، ۷ ستمبر ۱۸۸۶ء کو وہ زار کی خواہش کے مطابق تاج وتخت سے دست بردار ہوگیا، اس کی جگہ شہزادہ فرڈینینڈ آف سیکس کوبرگ (Ferdinand of saxf coburg) سلطان کے زیر سیادت متحدہ بلغاریا کا حکمراں منتخب کیا گیا۔

دول یورپ کی مداخلت: سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد حکومت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں یوروپین حکومتوں کی مداخلت ہے، حالاں کہ عہدنامہ برلن میں جس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا تھا، وہ یہی تھی کہ دولت علیہ کے حقوقِ فرماں روائی غیروں کی دست برد سے محفوظ رکھے

جائیں گے، مداخلت کے لیے کسی حیلہ کا ہاتھ آجانا بہت آسان تھا، عیسائی رعایا کے حقوق کی حفاظت کا عذر ایک ایسا عذر تھا جس کی معقولیت میں کلام ممکن ہی نہ تھا، چنانچہ اسی عذر کی بنا پر مغربی حکومتوں نے ان صوبوں کے آزاد کرانے میں ہر طرح کی کوشش کی، جن میں عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی، دولت عثمانیہ کے جس صوبہ نے علم بغاوت بلند کیا اسے یورپ کی کسی نہ کسی حکومت کی حمایت ضرور حاصل تھی، مشرقی رومیلیا نے جب بلغاریا سے اتحاد کا مطالبہ پیش کیا تو انہی حکومتوں نے جن کی طرف سے برلن میں اس اتحاد کی شدید مخالفت کی گئی تھی، سلطان پر دباؤ ڈال کر اس مطالبہ کو منظور کرایا اور پھر چند سالوں کے بعد وہی حکومتیں ایک دوسرے صوبہ کی آزادی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

کریٹ: کریٹ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا آخری مفتوحہ تھا، یہ ۱۶۶۹ء میں جمہوریہ وینس کی حکومت سے نکل کر باب عالی کے زیر نگیں آیا تھا، اس کے یونانی باشندے ابتدا ہی سے شورش پسند تھے اور دولت علیہ کے خلاف وقتاً فوقتاً بغاوتیں برپا کرتے رہتے تھے، ۱۸۳۰ء میں یہ جزیرہ ان خدمات کے صلہ میں جو محمد علی پاشا نے بغاوت یونان کے فرو کرنے میں انجام دی تھیں، ولایت مصر میں شامل کردیا گیا تھا لیکن دس سال بعد معاہدۂ لندن کے رو سے ۱۸۴۰ء میں یہ پھر دولت عثمانیہ کو واپس کردیا گیا، ۱۸۳۰ء سے ۱۹۱۲ء تک جب تک کریٹ مملکت یونان میں شامل نہ ہوگیا، اس کے باشندوں نے حکومت کے خلاف چودہ بار بغاوتیں کیں (۱) اور ان تمام بغاوتوں کا مقصد صرف ایک تھا یعنی یونان سے الحاق، چنانچہ ۱۸۶۶ء میں بھی جزیرہ والوں نے حسب دستور بغاوت برپا کی اور ایک مجلس عمومی منعقد کرکے ۲ ستمبر کو سلطنت عثمانیہ سے آزادی اور مملکت یونان سے الحاق کا اعلان کردیا، تین سال تک بغاوت جاری رہی بالآخر ۱۸۶۸ء میں سلطان نے کریٹ کے دستور حکومت میں چند اہم اصلاحات نافذ کرکے اس بغاوت کا خاتمہ کردیا،

---

(۱) میریٹ ص ۳۷۰

جدید دستور 'قانون عضوی' (Organic Statute) کے نام سے مشہور ہے، کریٹ کے عیسائیوں کو پہلے سے جو حقوق حاصل تھے جدید دستور کے رو سے وہ از سر نو مستقل کر دیے گئے، علاوہ بریں کچھ نئی اصلاحات بھی جاری کی گئیں، گورنر جنرل کی مدد کے لیے دو اسیسر مقرر کیے گئے، جن میں سے ایک عیسائی اور دوسرا مسلمان تھا، جزیرہ کو دس صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر صوبہ میں ایک گورنر مقرر کیا گیا، مسلمان گورنر کے ساتھ عیسائی اسیسر اور عیسائی گورنر کے ساتھ مسلمان اسیسر رکھا گیا، گورنر جنرل کو مشورہ دینے کے لیے ایک مرکزی مجلس انتظامیہ قایم کی گئی، ایسی ہی ایک مقامی مجلس ہر صوبہ کے لیے مقرر ہوئی، پورے جزیرہ کے لیے ایک مجلس نیابیہ تجویز ہوئی، عدالتوں میں عیسائی اور مسلمان دونوں فرقوں کے جج مقرر ہوئے، عیسائیوں کو 'مذہبی تعدی' اور ٹیکسوں کی زیادتی کی جو شکایت تھی اس کا تدارک کر دیا گیا۔

لیکن یہ دستور بھی جس کے رو سے کریٹ کے مسلمانوں کے بہتیرے حقوق جو انھیں پہلے حاصل تھے تلف کر دیے گئے تھے، عیسائیوں کی تشفی کا باعث نہ ہوا اور انھوں نے یونان سے الحاق کے لیے پھر کوشش شروع کی، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو کریٹ کے عیسائیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی، پہلے ایک کمیٹی قایم کر کے انھوں نے باب عالی سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا اور پھر باب عالی کے انکار پر برلن کانگریس میں دول عظمیٰ کے سامنے اپیل پیش کی، دول عظمیٰ نے اس اپیل کے جواب میں صرف یہ وعدہ کیا کہ قانون عضوی کی اصلاحات میں اضافہ کر کے انھیں پوری پابندی کے ساتھ نافذ کر دیا جائے گا، چنانچہ اس وعدہ کے مطابق برطانوی سفیر کی وساطت سے قانون عضوی میں اضافہ کر کے معاہدہ ہلیپا (Halepa Pact) مرتب کر دیا گیا، اس معاہدہ کے رو سے محکمۂ عدالت صیغۂ انتظامی سے علاحدہ کر دیا گیا، ایک مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) تجویز ہوئی، جس کے ارکان میں انچاس عیسائی اور اکتیس مسلمان رکھے گئے، جزیرہ کے ملکی

باشندے (یعنی عیسائی) سرکاری عہدوں کے لیے زیادہ مستحق قرار دیے گئے اور سرکاری زبان اسمبلی اور عدالت دونوں میں یونانی قرار پائی، مال گذاری کی تنظیم اس طرح کی گئی کہ پبلک ورکس کے لیے کافی روپیہ بچ سکے، کاغذی سکوں کا اجرا روک دیا گیا اور پریس کو آزادی دی گئی، چند دنوں کے لیے ان شورش پسندوں کی زبان بندی ہوگئی لیکن ان کا اصلی مقصد یعنی یونان سے الحاق ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے پھر ہنگامہ برپا کیا۔

معاہدۂ ہلیپا کے رو سے کریٹ میں دستوری حکومت قایم ہوگئی تھی، اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں کے لیے عیسائیوں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ کشمکش موقوف ہوگئی اور بجائے اس کے پارلیمنٹری جنگ خود عیسائیوں میں شروع ہوگئی جو مجلسِ عمومی میں اکثریت رکھتے تھے، اس جنگ میں ملکی مفاد کو بالکل پس پشت ڈال دیا گیا اور عیسائیوں کی مخالف پارٹیاں ایک دوسرے کو شکست دے کر سرکاری عہدے اور اقتدار حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئیں، مالیات کا نظام درہم برہم ہونے لگا، جس پارٹی کو شکست ہوتی وہ موجودہ گورنر جنرل کے خلاف سازشیں کرتی اور قسطنطنیہ میں گورنر جنرل کے دشمنوں سے مل کر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی، اس جنگ میں قدامت پسند (کنزرویٹیو) پارٹی کو ۱۸۸۹ء میں شکست ہوئی اور اس کے لیڈروں نے ہتھیار سنبھال کر پہاڑوں کی راہ لی، اگرچہ اس معاملہ کو مذہبی عناد سے کوئی تعلق نہ تھا، تاہم حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ دونوں فرقوں کے مذہبی جذبات جلد برانگیختہ ہوگئے اور جزیرہ میں قتل و غارت کا ہنگامہ پھر برپا ہوگیا، اس سے پیشتر کی دو شورشوں میں غلبہ عیسائیوں کو حاصل ہوا تھا مگر اب کی بار مسلمان غالب آئے، باب عالی نے ہنگامہ فرو کرنے کے لیے ایک فوجی گورنر کریٹ کو روانہ کیا اور وہاں فوجی قانون جاری کر کے ایک فرمان کے ذریعہ معاہدۂ ہلیپا کی بعض اہم دفعات کو منسوخ کر دیا مثلاً مجلسِ عمومی کے انتخاب کا طریقہ بدل دیا گیا، اس کے ارکان کی تعداد کم کر دی گئی اور محصول درآمد و برآمد کی آمدنی جو اب تک قسطنطنیہ

اور کریٹ کے خزانوں میں تقسیم ہوتی آئی تھی، کل کی کل باب عالی میں طلب کر لی گئی، اس کے بعد جدید نظام کے مطابق جو انتخابات ہوئے ان میں عیسائیوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ پانچ سال تک کریٹ میں مسلمان والیوں کی حکومت رہی، ۱۸۹۴ء میں باب عالی نے دول عظمیٰ کی تحریک پر ایک عیسائی قرہ تھیوڈوری پاشا (Kara Theodory Pasha) کو کریٹ کا گورنر بنا کر بھیجا، عیسائی اب مجلس عمومی میں شرکت کرنے پر راضی ہو گئے، لیکن بہت جلد مالیات کا مسئلہ نئی دشواریوں کا سبب بن گیا باب عالی نے ان رقوم کی واپسی سے انکار کر دیا جو پچھلے ہنگامہ کے دوران میں کریٹ کے خزانہ سے نکال کر قسطنطنیہ منتقل کر دی گئی تھیں، قرہ تھیوڈوری پاشا حالات کو درست نہ کر سکا، اس لیے باب عالی نے اسے واپس بلا لیا، اس پر عیسائیوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی، لیکن اس واقعہ سے قبل ہی 'انجمن اصلاح' (Committe of Reform) کے نام سے ایک جماعت انھوں نے قایم کر لی تھی، اس انجمن کی ابتدا دراصل یوں ہوئی تھی کہ چند شکست خوردہ لیڈروں نے جو پارٹیوں کی گذشتہ کشمکش میں قوت واقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، اپنے حریفوں کے مقابلہ کے لیے پہاڑوں میں ایک مسلح جماعت تیار کی تھی، کبھی کبھی اس جماعت کو بعض ترک سپاہیوں سے لڑنے کی نوبت آئی اور ان آویزشوں میں اسے ایک حد تک کامیابی ہوئی، یہ دیکھ کر ہزاروں مسلح عیسائی اس جماعت میں شامل ہو گئے، اپریل ۱۸۹۶ء تک اس نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ واموس (Vamos) کے اہم شہر کا محاصرہ کر لیا مگر خانہ جنگی پھر شروع ہو گئی، دول عظمیٰ نے دباؤ ڈال کر باب عالی سے چند خاص مراعات اس شورش کو فرو کرنے کے لیے منظور کرائیں، چنانچہ معاہدۂ ہلیپا ازسرنو نافذ کر دیا گیا، ترکی فوجیں واپس بلا لی گئیں، مالی مدد کا وعدہ کیا گیا اور ایک عیسائی گورنر جنرل مقرر رہا، عیسائی لیڈروں نے معاہدۂ ہلیپا کی بنا پر اصلاحات کا ایک نظام مرتب کیا جسے دولِ عظمیٰ کی سفارش سے باب عالی نے منظور کر لیا۔

اس درمیان میں ایک قومی تحریک یونان میں شروع ہو گئی تھی، جس کی ایک

شاخ نیشنل سوسائٹی (Ethnike Hetareia) کے نام سے ۱۸۹۴ء میں قایم کی گئی تھی، اس سوسائٹی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کریٹ اور یونان کے الحاق میں مدد دی جائے لیکن اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مقدونیا کے حصول کے لیے ترکی سے جنگ کی جائے، اس کو اپنی تدبیروں کی کامیابی کے لیے کریٹ کے عیسائیوں کی حالت جو ۱۸۹۶ء کی اصلاحات سے بھی غیر مطمئن ہو رہے تھے بہت کارآمد معلوم ہوئی، چنانچہ اس نے اپنے گماشتے کریٹ میں بھیجے اور اسلحوں کی ایک کثیر تعداد وہاں پہنچائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۷ء کی ابتدا ہی میں عیسائیوں نے علم بغاوت بلند کر دیا، فروری ۱۸۹۷ء میں کینیا (Canea) میں جنگ شروع ہوگئی اور باغیوں نے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، اب نیشنل سوسائٹی کا مقصد پورا ہوتا نظر آرہا تھا، تمام یونانیوں نے ان باغیوں کی حمایت میں مظاہرے شروع کر دیے، ایتھنز میں ان کا جوش وخروش سب سے زیادہ تھا، حکومت یونان جواب تک دولِ عظمیٰ کے مصالح کی بنا پر اہل کریٹ کو عملاً کوئی مدد نہ دے سکتی تھی اس قومی جوش سے اپنی مجبوری کا اعلان کر کے آگے بڑھی اور ۱۰ ارفروری ۱۸۹۷ء کو بادشاہ کے منجھلے لڑکے شہزادہ جارج کو جنگی جہازوں کے ساتھ روانہ کیا اور پھر تین روز بعد کرنل واسوس (Vassos) کی سرکردگی میں ایک یونانی فوج کریٹ پہونچ گئی، حکومت یونان کا یہ فعل گویا سلطنت عثمانیہ سے جنگ کا اعلان تھا، دولِ عظمیٰ کے نزدیک یہ جنگ اس وقت مناسب نہ تھی، لہٰذا انھوں نے فوراً اپنے جنگی جہاز اور فوجیں کریٹ روانہ کیں اور کینیا پر قبضہ کر کے دونوں فریق کو صلح پر مجبور کیا، لیکن کریٹ کے باغیوں کو اصلی قوت ایتھنز سے پہنچ رہی تھی اور ایتھنز باب عالی سے صلح کے لیے تیار نہ تھا، حکومت یونان نے دولِ عظمیٰ کے پیش کردہ شرایط صلح منظور نہیں کیے اور کریٹ کے عیسائیوں کی حمایت سے دست کش ہونے یا وہاں سے اپنی فوجیں ہٹانے سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک خود اہل کریٹ کو اپنے وطن کے مستقبل کی نسبت استشارہ کے ذریعہ فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے دی جائے، باغیوں کے لیے یہ شہ کافی تھی، انھوں نے بھی ہتھیار رکھنے

سے انکار کر دیا اور دوسری طرف دولِ عظمیٰ کے جہازوں نے کریٹ کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے پورے جزیرہ کی ناکہ بندی کر دی اور ایک اعلان اس مضمون کا شایع کیا کہ آیندہ یہ جزیرہ دولِ یورپ کے سایۂ عاطفت میں رہے گا جو اس کی حکومت خود اختیاری کی ضامن ہوں گی۔(۱)

جنگ یونان: تاہم کریٹ کی ناکہ بندی اور دولِ یورپ کا یہ اعلان یونان اور دولت علیہ کی جنگ کو روک نہ سکا، نیشنل سوسائٹی نے اہل یونان کو توسیعات ملکی کی جو شراب پلائی تھی اس کے نشہ سے وہ بدمست ہو رہے تھے، یونانیوں نے سرحد عبور کر کے مقدونیا کے بعض علاقوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا، باب عالی کے لیے مدافعت ناگزیر تھی، چنانچہ ۷/اپریل ۱۸۹۷ء کو ادھر سے بھی اعلانِ جنگ ہوا، عثمانی فوجیں حال ہی میں جرمن افسروں کے زیرنگرانی اعلیٰ تربیت اور تنظیم حاصل کر چکی تھیں، جس کے باعث ان کی قوت یونانی فوجوں سے بڑھی ہوئی تھی، ترکوں کے پہلے ہی حملہ میں یونانیوں کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ بدحواس ہو کر بھاگے، ایک مہینہ کے اندر اس جنگ کا جس کے لیے یونانی اس درجہ بے قرار تھے خاتمہ ہو گیا، ترک ان کا پیچھا کرتے ہوئے تھسلی میں داخل ہو گئے اور قریب تھا کہ ایتھنز پہنچ جائیں مگر عین اس وقت دولِ عظمیٰ کی مزاحمت نے حسبِ دستور قدیم ترکوں کی راہ روک لی اور ۲۰/مئی کو انھیں مجبوراً ایک عارضی صلح کے لیے راضی ہونا پڑا، دسمبر میں اس عارضی صلح کو مستقل کر دیا گیا، یونان کو تھسلی کے ایک حصہ سے جو سلطنت عثمانیہ کی سرحد پر واقع تھا دست بردار ہونا پڑا، علاوہ بریں اس پر تخمیناً چالیس لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ بھی عاید کیا گیا، ترکوں نے اس کے بعد تھسلی کو خالی کر دیا۔

یونان سے کریٹ کا الحاق: لیکن یہ جنگ یونان کے لیے خواہ کتنی ہی نقصان رساں رہی ہو کریٹ کے حق میں مفید ہی ثابت ہوئی، دولِ عظمیٰ کی جمعیۃ سے جرمنی اور آسٹریا ہنگری نے ذاتی مصالح کی بنا پر علاحدگی اختیار کر لی تھی، تاہم انگلستان، اٹلی، روس اور

---

(۱) میریٹ ص ۳۰۱-۳۰۰

فرانس نے متفقہ طور پر دباؤ ڈال کر باب عالی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کریٹ سے عثمانی فوجوں اور ترکی عہدہ داروں کو واپس بلالے اور محض خراج قبول کرنے پر قناعت کرے، اس کے بعد ۲۱ر دسمبر ۱۸۹۸ء کو انھوں نے یونان کے شہزادہ جارج کو بلا کر آٹھ سال کے لیے کریٹ کا ہائی کمشنر مقرر کیا، ایک جدید دستور حکومت مرتب کیا گیا، جس پر ۱۹۰۵ء تک کامیابی کے ساتھ عمل درآمد ہوتا رہا لیکن ۱۹۰۵ء میں کریٹ کے عیسائیوں نے پھر شورش برپا کی اور یونان سے اتحاد کا مطالبہ از سر نو پیش کیا، شہزادہ جارج کے تقرر سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ دولِ عظمیٰ اس الحاق کی حامی ہیں کیوں کہ یونان کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو ہائی کمشنر مقرر کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ یونان اور کریٹ کا الحاق پیش نظر ہے، لیکن یہ دیکھ کر کہ شہزادہ کی آمد کے بعد بھی سالوں گذر گئے اور یہ مقصد حاصل نہ ہوا، ان میں بے چینی پیدا ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں وینزیلوس (M. Venizelos) کی سرکردگی میں انھوں نے علم بغاوت بلند کر کے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا، دولِ عظمیٰ کو پھر مداخلت کا موقع ملا، شہزادہ جارج نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا اور شاہ یونان نے دولِ عظمیٰ کی اجازت سے زیمیس (M. Zaimis) نامی ایک یونانی کو ہائی کمشنر مقرر کیا، تین سال تک دولِ عظمیٰ کے فوجی دستے 'قیام امن' کے خیال سے کریٹ میں مقیم رہے لیکن زیمیس کے 'حسنِ انتظام' نے ان کی ضرورت باقی نہیں رکھی اور ۱۹۰۸ء میں وہ واپس بلا لیے گئے، ۱۹۰۸ء میں جب بلغاریا نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو کریٹ نے پھر الحاق کا مطالبہ پیش کیا اور ایک عارضی حکومت قایم کر کے وینزیلوس کو وزیر عدالت و امور خارجہ مقرر کیا، دولِ عظمیٰ نے باضابطہ طور پر اس عارضی حکومت کو تسلیم تو نہیں کیا لیکن عملاً اس سے تعلقات قایم کر لیے، چند ہی سالوں میں یونان اور کریٹ کا باضابطہ الحاق بھی عمل میں آ گیا اور سلطنت عثمانیہ کا ایک اور صوبہ دولِ عظمیٰ کی سرپرستی میں آزاد کر دیا گیا، کریٹ کی آزادی بھی دولِ عظمیٰ کی اسی حد تک رہینِ منت ہے جس حد تک یونان کی، اگرچہ

کریٹ کے معاملہ میں ان مغربی حکومتوں نے باغیوں کی حمایت علانیہ اس طرح نہیں کی، جس طرح یونان کی تھی، یہ احتیاط کسی خوش نیتی پر مبنی نہ تھی بلکہ خطرہ یہ تھا کہ علانیہ مدد کرنے سے دولت عثمانیہ سے جنگ چھڑ جائے گی اور چونکہ جرمنی اور آسٹر یا ہنگری ان کی جمعیۃ سے علاحدہ ہو گئے تھے اور جرمنی کے استعماری مقاصد اسے روز بروز دولت علیہ سے زیادہ قریب لاتے جارہے تھے، اس لیے جنگ میں خود مغربی حکومتوں کا باہم دگر مقابل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا، یہ وہ خطرہ تھا جس کے لیے باغیان کریٹ کی علانیہ مدد سے اجتناب کیا جا سکتا تھا، خصوصاً جب مقصد ایسی مدد کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

مسئلۂ آرمینیا: سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں دخل دینے کے لیے دولِ عظمیٰ کو کسی خاص حیلہ کے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی، عیسائی رعایا کے حقوق کا تحفظ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ہر مداخلت کے لیے کافی عذر ہو سکتا تھا، تمام یوروپین حکومتوں نے اپنی جگہ یہ فرض کر لیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور ان مظالم کے تدارک کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ عیسائیوں کو دولت علیہ کی فرماں روائی سے آزاد کر دیا جائے اور ان کی خود مختار حکومتیں قایم کر دی جائیں، یونان، سرویا، بلغاریا، رومانیا، کریٹ یہ تمام صوبے اسی مقصد کے ماتحت اور دول عظمیٰ کی سرپرستی میں سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ کر دیے گئے تھے، اب صرف دو علاقے اور رہ گئے تھے جن میں عیسائیوں کی آبادی مسلمانوں سے زیادہ تھی آرمینیا اور مقدونیا، یورپ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ ان 'مظلوموں' کو بھی ترکوں کے پنجہ سے آزاد کرائے۔

آرمینی قوم نہایت قدیم زمانہ سے ایشیائے کوچک کے ان کوہستانی علاقوں میں رہتی آئی تھی جو شمال مشرق میں واقع ہیں، اس سے بہت پہلے عیسائیت قبول کر لی تھی اور سب سے قدیم کلیسا کی متبع تھی، جس کی بنا سینٹ گریگوری (متوفی ۳۳۲ء) نے رکھی تھی، آرمینی کلیسا یونانی کلیسا سے اکثر باتوں میں مشابہ ہونے کے باوجود اپنی ایک مستقل اور جداگانہ ہستی رکھتا ہے، اس کا پیشوا کیتھولیکس (Catholicus) کہلاتا ہے، لیکن

باوجود اس کے کہ یہ قوم زمانہ قدیم سے آباد ہے اور اس کا ایک مستقل کلیسا بھی ہے جہاں تک جغرافی رقبہ کا تعلق ہے، اس کے حدود مستقل اور متعین نہیں، یہ قوم جن علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ بحر کاسپین، بحر اسود، کوہ کاف اور کردستان سے گھرے ہوئے ہیں اور روس، ترکی اور ایران کی سلطنتوں میں تقسیم ہیں۔

سلطنت عثمانیہ میں آرمینیوں کی حالت ابتدا ہی سے اچھی تھی، تجارت ان کا خاص پیشہ تھا اور اس حیثیت سے وہ قسطنطنیہ اور سلطنت کے تمام دوسرے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے اس پیشہ میں یہاں تک فروغ حاصل کیا کہ مشرق ادنیٰ کی تجارتی قوموں میں وہ یونانیوں اور یہودیوں کے مدمقابل ہوگئے، انیسویں صدی کے آغاز میں جب مغربی تہذیب وتمدن نے سلطنت عثمانیہ میں بار پانا شروع کیا تو آرمینی بھی جدید خیالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی قوم میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے یورپ کے جدید نظامِ تعلیم کے مطابق مدرسے قایم کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد وہ اپنی ہمسایہ قوموں سے تعلیم میں آگے بڑھ گئے۔

تعلیم کی ترقی کے ساتھ سیاسی خیالات بھی پھیلنا شروع ہوئے اور ریاستہاے بلقان کی مثالیں دیکھ کر آرمینیوں میں بھی حصولِ آزادی کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ کوئی متعین علاقہ ایسا نہ تھا جس میں آرمینیوں کی اکثریت ہو، علاوہ بریں تمام آرمینی سلطنتِ عثمانیہ کے زیرنگیں بھی نہ تھے، ان میں سے کچھ روس اور کچھ ایران کی سلطنت میں آباد تھے، اکثریت جو تقریباً بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھی، سلطنت عثمانیہ کی چھ ولایتوں، سیواس بطلیس، ارض روم، خارپت ویار بکر اور وان میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن ان میں سے کسی ولایت میں ان کی تعداد وہاں کے دوسرے باشندوں یعنی ترک، یونانی اور کرد سے زیادہ نہ تھی (۱) ۱۸۶۳ء میں باب عالی نے ایک ''آرمینی دستور'' عطا کیا تھا جس کے رو سے آرمینیوں کے تمام ملکی اور مذہبی معاملات ایک 'قومی مجلس عامہ' کو تفویض کردیے گئے تھے، اس مجلس کا صدر آرمینی کلیسا کا پیشوا تھا اور اس

(۱) ''جزیرہ نمائے بلقان اور مشرق ادنیٰ'' از شیویل ص ۴۲۶

کے ماتحت دو چھوٹی مجلسیں تھیں جن میں علاحدہ علاحدہ ملکی اور مذہبی امور طے ہوتے تھے۔(۱)

سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی کے وقت آرمینیوں کی حالت پہلے سے بہتر تھی، لیکن روس اور ترکی کی جنگ (۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء) کے بعد ہی 'مسئلہ آرمینیا' پیدا کر دیا گیا اور سب سے پہلے معاہدۂ سان اسٹیفانوس میں روس نے باب عالی سے یہ وعدہ لیا کہ جن صوبوں میں آرمینی آباد ہیں ان میں اصلاحات جاری کر دی جائیں گی اور انھیں کردوں اور چرکسوں کے دست برد سے محفوظ رکھا جائے گا پھر جب معاہدۂ سان اسٹیفانو کی منسوخی کے بعد ۱۳ر جولائی ۱۸۷۸ء کو صلح نامہ برلن مرتب ہوا تو باب عالی نے یہی وعدہ تمام دولِ عظمیٰ سے کیا، اس سے قبل معاہدۂ سائپرس میں بھی جو ۴ر جون ۱۸۷۸ء کو باب عالی اور برطانیہ کے درمیان طے ہوا تھا، سلطان نے اپنے ایشیائی علاقوں کی عیسائی رعایا کے لیے ضروری اصلاحات اور تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اس طرح ۱۸۷۸ء کے بعد آرمینی اپنے کو دولِ عظمیٰ اور خصوصاً برطانیہ کے زیر حمایت سمجھنے لگے، معاہدۂ سائپرس میں آرمینیوں کا ذکر اگرچہ تصریح کے ساتھ نہیں آیا تھا، تاہم عیسائی ہونے کے علاوہ انھیں برطانیہ کی مخصوص حمایت کا یقین جس وجہ سے ہوا وہ یہ تھی کہ معاہدۂ برلن میں برطانیہ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ روس سلطان کے وعدہ پر اعتماد کر کے اپنی ایشیائی مفتوحات سے قبضہ اٹھا لے اور ان اصلاحات کے اجرا کا انتظار نہ کرے۔

غرض ۱۸۷۸ء کے بعد آرمینی قوم نے مسیحی یورپ کی حمایت پر اعتماد کرنا شروع کیا اور معاہدۂ برلن میں جن اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا، انھیں حکومتِ خود اختیاری کا زینہ قرار دے کر ان کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن کرنے لگی، یہ صورتِ حال باب عالی کے لیے تشویشناک تھی کیوں کہ دولِ عظمیٰ کی ایسی ہی حمایت اور ایجی ٹیشن کی یہی شکل اس سے قبل عیسائی صوبوں کی آزادی کا باعث ہو چکی تھی، بوسنیا، سرویا اور بلغاریا میں جو ہنگامے دولِ عظمیٰ کی سرپرستی میں کامیاب ہو چکے تھے، وہ آرمینیا کی حوصلہ افزائی کے لیے

(۱) 'سلطنت عثمانیہ اور اس کے جانشین' ازملر ص ۴۲۸

کافی تھے، باب عالی کے لیے آرمینیوں کی شورش اس وجہ سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی کہ ان میں اعدامیت (Nihilism) کی تحریک رونما ہو چکی تھی، جو ایک نہایت شدید انقلابی تحریک تھی اور موجودہ نظامِ حکومت کو درہم برہم کر دینا چاہتی تھی، یہ تحریک کسی خاص مذہب سے وابستہ نہ تھی، بلکہ اس کے انقلابی مقاصد کے سامنے اسلامی اور مسیحی سلطنتوں میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا، چنانچہ یہ اعدامی سازش ہی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۱ء میں زار الکزنڈر ثانی قتل کیا گیا، اس تحریک کا خوف سلطان عبدالحمید ثانی اور زار الکزنڈر ثالث دونوں پر یکساں طاری تھا، ۱۸۸۵ء میں بھی اس جماعت نے ایک شورش برپا کی تھی لیکن باب عالی نے اسے آسانی کے ساتھ فرو کر دیا تھا، آرمینیوں کو بحیثیت عیسائی ہونے کے روس کی جو سرپرستی حاصل تھی وہ ۱۸۸۱ء میں زار الکزنڈر ثانی کے قتل کے بعد جاتی رہی، حکومت روس نے ان کے مدرسے بند کرادئے، آرمینی زبان دبائی جانے لگی اور آرمینیوں کو روسی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، مسیحی روس کی سرپرستی میں حکومت خود اختیاری کی جو توقعات تھیں وہ ان کارروائیوں سے مفقود ہوگئیں، ٹفلس کے آرمینیوں نے اس کے بعد ترکی آرمینیوں کی طرف توجہ کی، وہ ریاستہائے بلقان میں سلافی شورشوں کی کامیابی دیکھ چکے تھے، اسی قسم کے ہنگامے انھوں نے آرمینیا میں برپا کرنے شروع کیے۔(۱)

روس کی حمایت سے محروم ہو جانے کے بعد آرمینیوں کی انقلابی جماعت نے جس میں سے بعض یورپ کے تعلیم یافتہ اور وہاں کی آزاد خیالی اور تحریک اعدامیت سے حد درجہ متاثر تھے، اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہی تدبیریں اختیار کیں جو بلغاریا میں کامیاب ہو چکی تھیں، چنانچہ انقلابی رسالوں اور اخباروں کی اشاعت کے لیے ٹفلس اور متعدد یوروپین پایہ تختوں میں انجمنیں قایم کی گئیں اور خفیہ سوسائٹیاں انقلابی تجاویز کو عمل میں لانے کی غرض سے بنائی گئیں، گماشتوں کے ذریعہ ترکی آرمینیا میں پروپگنڈا جاری کیا گیا، اسلحہ اور بم وغیرہ بھجوائے گئے اور حکومت عثمانیہ کی معمولی بدنظمی کے واقعات

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۷

کو یورپ کے سامنے شدید مظالم کی صورت میں پیش کیا گیا، اس انقلابی تحریک میں کچھ نوجوان بھی شریک ہو گئے، جنھوں نے اعدامی اصول کی بنا پر مقامی کمیٹیاں قایم کیں، لیکن آرمینی پادری اور امریکن مشنری اس سے علاحدہ رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کا رجحان مذہب کے خلاف تھا، مخالف مذہب ہونے کے باعث نیز اس وجہ سے کہ اس میں لیڈروں کے ذاتی اغراض کو بہت کچھ دخل تھا یہ تحریک عوام میں مقبول نہ ہو سکی، اپنی تدبیروں میں ناکام ہو کر آرمینی گماشتوں نے افراد پر حملے کرنے شروع کیے، لوگوں کے نام تہدیدی خطوط بھیجے اور مشنریوں کو حکومت کی نظر میں مشکوک بنانے کے لیے ۵؍ جنوری ۱۸۹۳ء کو مارسیوان (Marsivan) میں امریکن کالج کی دیواروں پر انقلابی اشتہارات چسپاں کر دیے، یہ آخری تدبیر کارگر ہوئی، اشتہارات کی اشاعت کا الزام امریکن مشنریوں پر عاید کیا گیا اور دو آرمینی پروفیسر قید کر دیے گئے، اس کے بعد قیصاریہ اور دوسرے مقامات پر بلوے ہوئے جو آسانی سے فرو کر دیے گئے۔

انقلابیوں کا ایک مقصد یہ تھا کہ ڈارون (Daron) کے قدیم شہر کو جدید آرمینیا کا پایہ تخت بنائیں، ۱۸۹۳ء کے موسم گرما میں ایک انقلابی گماشتہ موش کے قریب گرفتار ہوا، اس خیال سے کہ ممکن ہے اور گماشتے بھی ہاتھ آ جائیں گورنر نے کرد سواروں کے بے ضابطہ دستہ کو وہاں کے پہاڑی علاقہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا، آرمینیوں نے کردوں کو بھگا دیا اور دوسرے سال موسم بہار میں جب دوبارہ حملہ کیا گیا تو پھر آرمینی مغلوب نہ ہوئے، انقلابی جماعت کی باغیانہ کوششوں کو دیکھتے ہوئے اس فتنہ کا استیصال ضروری تھا، چنانچہ صوبہ کے والی نے باضابطہ فوجیں روانہ کیں، اب کی بار آرمینی مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور کثرت سے مارے گئے، اس واقعہ کی خبر جب یورپ پہنچی تو مسیحی حکومتوں نے ایک قیامت برپا کر دی اور باغیوں کی سزا کو جو حکومت عثمانیہ کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے، بے گناہوں کے قتل عام سے تعبیر کر کے ایک تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کیا، نومبر ۱۸۹۴ء میں یہ کمیشن آرمینیا بھیجا گیا، برطانیہ، فرانس اور روس کے قنصل اس کے ممبر

بنائے گئے، تحقیقات کے بعد کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ آرمینیا میں اصلاحات کے نافذ کرنے کی سخت ضرورت ہے، چنانچہ متفقہ طور پر برطانیہ، فرانس اور روس کی طرف سے ۱۱ر مئی ۱۸۹۵ء کو اصلاحات کی ایک تجویز باب عالی کے سامنے پیش کی گئی۔

لیکن اس درمیان میں آرمینیوں کی خفیہ انجمنیں اپنا کام کرتی رہیں، طارسوس میں ہنگامے برپا ہوئے اور جو آرمینی اس 'قومی' تحریک میں شریک نہیں ہوئے تھے قتل کردئے گئے، خفیہ انجمنوں کے کارکنوں نے خود آرمینی کلیسا کے پیشوا کو قتل کی دھمکی دی اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ برطانوی سفیر چاہتا ہے کہ چند آرمینی قتل کردئے جائیں تاکہ اسے جنگی بیڑا قسطنطنیہ کے سامنے لانے کے لیے بہانہ ہاتھ آئے (۱)، یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو آرمینیوں کا ایک جلوس جس میں مسلح اشخاص بھی تھے، اپنے مطالبات لے کر باب عالی میں حاضر ہوا، باب عالی کی طرف سے غور کرکے جواب دینے کا وعدہ کیا گیا، لیکن آرمینیوں نے مطالبات کے اسی وقت منظور کیے جانے پر اصرار کیا اور جب پولیس نے ان کو منتشر کرنا چاہا تو بلوہ کردیا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں اور فریقین میں سے کچھ ہلاک ہوئے، اس کے بعد برطانیہ نے اصلاحات کی منظوری پر پھر زور دیا اور ۱۷ر اکتوبر ۱۸۹۵ء کو سلطان نے تجویز اصلاحات کو منظور کرلیا، لیکن قبل اس کے کہ اصلاحات نافذ کی جائیں آرمینیا کی شورشوں سے مجبور ہوکر باب عالی کو ادھر فوجیں روانہ کرنی پڑیں، باغیوں نے مقابلہ کیا اور اکتوبر و نومبر ۱۸۹۵ء میں ان کی ایک بڑی تعداد قتل کردی گئی، بغاوت کے فرو کرنے سے پہلے اصلاحات کا نفاذ ناممکن تھا، خفیہ انجمنوں کی کوشش سے یہ فتنہ اس حد تک پھیل چکا تھا کہ اس کے استیصال کے لیے باضابطہ فوجوں کی مدد کے بغیر چارہ نہ تھا، ۲۶ر اگست ۱۸۹۶ء کو قسطنطنیہ کے آرمینیوں نے بینک عثمانی پر قبضہ کرلیا، باب عالی نے فوراً اس کا تدارک کیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر یہ بغاوت فرو کردی گئی، بعض انگریز مورخین کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ کے ہنگامہ میں چھ ہزار آرمینی قتل کیے گئے، لیکن وہ

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۸

بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس قتلِ عام میں مذہبی تعصب کو مطلق دخل نہ تھا، میریٹ لکھتا ہے: ''صرف گریگورین کلیسا کے آرمینی قتل کیے گئے، شاید ہی کسی کیتھولک کو ہاتھ بھی لگایا گیا ہو، قسطنطنیہ میں فساد کی ابتدا آرمینیوں ہی نے کی، ترک مسلح بغاوت کے فرو کرنے میں بالکل حق بجانب تھے'' (۱) ملر کہتا ہے کہ ''شاید ہی کوئی غیر آرمینی قتل کیا گیا ہو'' (۲) قسطنطنیہ کے علاوہ مقتولین کی مجموعی تعداد بیس سے پچیس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ (۳)

آرمینیوں کے 'قتل عام' کا پروپگنڈا یورپ میں اس کثرت اور مبالغہ سے کیا گیا ہے کہ اب تک محض اس کا اشارہ ترکوں کے خلاف انتہائی نفرت اور غصہ کے جذبات برانگیختہ کردینے کے لیے کافی ہے، سلطان عبدالحمید ثانی کی فرد جرائم میں جو مدبرین یورپ کے قلم سے مرتب ہوکر تمام دنیا میں شائع ہوچکی ہے، سب سے بڑا جرم یہی آرمینیا کا 'قتل عام' ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس 'قتل عام' کی نوعیت وہی تھی جو بیان کی جاتی ہے تو مسیحی یورپ کی وہ حکومتیں کیوں خاموش تھیں جن کا جذبۂ دینی اس سے پیشتر کبھی دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں برانگیختہ ہونے سے قاصر نہیں رہا اور جنھوں نے رعایا کو باب عالی کی 'مطلق العنانی' سے آزاد کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، سرویا اور یونان کی آزادی جن حکومتوں کی رہینِ منت تھی، رومانیا کا استقلال جن کی کوششوں سے عمل میں آیا، بلغاریا نے جن کی حمایت میں خودمختاری کا اعلان کیا، وہ حکومتیں یورپ میں اس وقت بھی موجود تھیں اور ان میں سے ایک بھی دائرۂ مسیحیت سے نکل کر اسلام کی حلقہ بگوش نہیں ہوئی تھی، پھر کیا وجہ تھی کہ سرویا اور یونان، رومانیا اور بلغاریا کے عیسائیوں کی مدد کے لیے جن کی 'مظلومیت' یقیناً اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی جو آرمینیا کے مقتولین کی نسبت بیان کیا جاتا ہے، سارا یورپ متحد ہوکر سلطنت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے میں جہاں تک ممکن تھا کوئی تسمہ لگا نہیں رکھا، لیکن جب آرمینیا کے

---

(۱) میریٹ ص ۴۰۱ (۲) سلطنت عثمانیہ اور اس کے جانشین از ملر ص ۴۳۰ (۳) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۸

عیسائیوں نے ان حقوق کا مطالبہ کیا جن کی ضمانت تمام دولِ عظمیٰ نے معاہدۂ برلن میں کی تھی اور اس مطالبہ پر باب عالی کی طرف سے "قتل عام" کا حکم دے دیا گیا تو ان مدعیانِ حق وانصاف میں سے کسی ایک کا ہاتھ بھی مظلوموں کی حمایت کے لیے نہیں اٹھا؟ معہودہ حقوق کے مطالبہ کرنے پر اگر آرمینیوں کا "قتل عام" ضروری سمجھا گیا تو یہی مطالبہ تو کریٹ کے عیسائیوں نے بھی کیا تھا اور انھوں نے نہ صرف وفد وجلوس کے ذریعہ اپنے مطالبات پیش کیے تھے بلکہ سالہا سال تک شورشوں اور بغاوتوں کا ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، جس کا سلسلہ ۱۹۱۲ء میں اس وقت منقطع ہوا جب کریٹ اور یونان کا الحاق عمل میں آ گیا، لیکن کیا ایسا ہی "قتل عام" کریٹ میں بھی جاری کر دیا گیا تھا؟ برعکس اس کے وہاں تو یہ صورت پیش آئی کہ بغاوتوں کے فرو کرنے کے لیے جب عثمانی فوجیں پہنچیں تو فوراً ہی دولِ عظمیٰ کے جنگی بیڑوں نے کریٹ کی ناکہ بندی کر دی اور بالآخر سلطان کو مجبور ہو کر اپنی تمام فوجیں وہاں سے واپس کر لینی پڑیں۔

اصل یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے ابتدائی دور میں آرمینیوں میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو اصولِ اعدامیت (Nihilism) سے بغایت متاثر تھی اور موجودہ نظام کو خواہ وہ حکومت کا نظام ہو خواہ مذہب و معاشرت کا درہم برہم کر دینا چاہتی تھی، جہاں تک اصول کا تعلق تھا اس جماعت کے نزدیک روس کی مسیحی حکومت اور ترکی کی اسلامی حکومت مین کوئی امتیاز نہ تھا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں زار الکزنڈر ثانی کا قتل اسی جماعت کی سازش کا نتیجہ تھا، جس کے بعد ہی آرمینیوں کے ساتھ روس کی ساری ہمدردی کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت روس آرمینیوں کی شدید مخالف ہو گئی جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ اسی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ آرمینیوں کے مدارس بند کر دیے گئے، آرمینی زبان کا استعمال روکا جانے لگا اور آرمینیوں کو روسی بنانے اور روسی کلیسا میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، آرمینی بہرحال عیسائی تھے اور بالکل سرحد پر آباد ہونے کی وجہ سے سلطنت روس پر ہمسائگی کا حق بھی رکھتے تھے، روس کو دولت عثمانیہ سے جو بغض سترہویں صدی سے

چلا آتا تھا وہ پوشیدہ نہیں، اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع اس نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا پھر اس مقصد کے لیے اس سے بہتر موقع کیا مل سکتا تھا کہ ایک عیسائی قوم جس کے لاکھوں افراد خود اس کی سلطنت میں بھی آباد تھے، عین سرحد پر قتل کی جا رہی تھی اور اشتراکِ مذہب اور حق ہمسایگی کے علاوہ اس معاہدہ کی بنا پر بھی حمایت کا مطالبہ کر رہی تھی، جو برلن کی مجلس اقوام میں مرتب ہوا تھا، لیکن نہ صرف یہ کہ روس نے خود کوئی مدد نہ کی بلکہ جب برطانیہ نے ترکی آرمینیوں کی حمایت میں عملی قدم اٹھانا چاہا تو ۱۸۸۴ء کے بعد سے برابر اس کی پرزور مخالفت کرتی رہی (۱) ظاہر ہے کہ جس فتنہ کا استیصال سلطان کے نزدیک ضروری تھا، اس کا خوف زار پر بھی پوری طرح مسلط تھا، آرمینیوں کی خفیہ انقلابی انجمنوں کا قیام پہلے روس ہی میں ہوا اور وہیں سے ان کے گماشتے ترکی آرمینیا میں پروپگنڈا کرنے اور اسلحہ اور بم وغیرہ تقسیم کرنے کے لیے روانہ کیے گئے، روس کے علاوہ جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اٹلی کی طرف سے بھی ان باغیوں کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھی، حالاں کہ یہ حکومتیں بھی معاہدۂ برلن میں شریک تھیں جس میں آرمینیا کے حقوق و اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا، برخلاف اس کے ۱۸۸۳ء میں بسمارک نے حکومت برطانیہ کو مطلع کر دیا تھا کہ جرمنی کو آرمینیا کی اصلاحات کی مطلق پروا نہیں ہے اور یہ مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہے کہ اس قصہ کو چھوڑ ہی دیا جائے (۲) ۱۸۹۴ء کے "قتل عام" کے بعد جو تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، اس میں روس، برطانیہ اور فرانس کے قنصل تو شریک ہوئے لیکن دوسری حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا، اگر یہ "قتل عام" اتنے ہی بڑے پیمانہ پر تھا جتنا برطانوی مورخین بیان کرتے ہیں تو کم از کم یہ عیسائی حکومتیں اپنے نمایندوں کو تحقیق حال کے لیے تو روانہ کر سکتی تھیں، دفع دخل مقدر کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ دولِ عظمیٰ کی باہمی رقابتوں کے باعث باب عالی پر کافی دباؤ ڈالا نہ جا سکا (۳) قیصر جرمنی اپنے اقتصادی مقاصد کی خاطر جنھیں وہ ایشیائے کوچک میں

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۶۷ (۲) انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۵۶۷ (۳) میریٹ ص ۳۹۷

حاصل کرنا چاہتا تھا سلطان کا دوست بنا رہا، آسٹریا ہنگری کے بلقانی مصالح اسے جنگ کی اجازت نہیں دیتے تھے، روس نے اعلان کر دیا تھا کہ یورپ کے پچھلے تجربات کی بنا پر وہ اب ایشیاے کوچک میں کوئی دوسرا بلغاریا پیدا کرنا نہیں چاہتا (۱) لیکن جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے مقاصد و مصالح اور روس کا پچھلے تجربات کی بنا پر آرمینیوں کی مدد سے صاف انکار کر دینا اگر باہمی رقابتوں کا سبب بن سکتا تھا جس کے باعث باب عالی پر متحدہ دباؤ ڈالنا ممکن نہ تھا تو عین اسی زمانہ اور انہی رقابتوں کی موجودگی میں برطانیہ، فرانس اور روس کے جنگی بیڑے کریٹ کی ناکہ بندی کیوں کر رہے تھے اور پھر جب یونان نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور عثمانی فوجیں ان حملہ آوروں کے مقابلہ میں آگے بڑھیں تو باہمی رقابتیں کیوں مفقود ہو گئیں اور ایتھنز کو خطرہ سے بچانے کے لیے ان حکومتوں نے باب عالی کو صلح پر کیوں کر مجبور کیا؟

مقتولین کی تعداد کے تعین میں بھی مغربی مورخین پروپگنڈے کے جوش میں کہیں سے کہیں نکل گئے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار بیس سے پچیس ہزار تک تخمینہ کرتا ہے، علاوہ ان کے جو قسطنطنیہ میں مارے گئے اور جن کی مجموعی تعداد چھ ہزار بتائی جاتی ہے، میریٹ کے نزدیک قسطنطنیہ کے مقتولین کے علاوہ مجموعی تعداد غالباً 'پچیس ہزار' تھی، ایک دوسرے تخمینہ کے رو سے جو امریکہ کے 'محققین' نے کیا ہے، یہ تعداد پچھتر ہزار تھی (۲)، امریکہ ہی کا ایک اور 'محقق' پروفیسر فرڈی نینڈ شیول (Ferdinand Schevill) اپنی کتاب 'جزیرہ نمائے بلقان اور مشرق ادنیٰ' میں لکھتا ہے کہ غالباً ایک لاکھ مرد، عورتیں اور بچے بے دردی سے قتل کر دیے گئے، علاوہ ان ہزاروں کے جو پہاڑوں میں بھاگ گئے اور وہاں فاقہ کشی اور بیماریوں سے ہلاک ہو گئے (۴۲۸) میریٹ نے ضلع ساسون کے 'قتل عام' کے ذکر میں الیسٹ (Elist) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابتدائی اطلاعات کے رو سے وہاں کے مقتولین کی تعداد سات آٹھ ہزار تھی

---

(۱) ملر ص ۴۳۱ (۲) میریٹ ص ۴۰۰، فٹ نوٹ

لیکن سرکاری تفتیش سے نوسونکلی۔(۱)

آرمینیا میں اعدامیت کی شورش جس تیزی سے پھیل رہی تھی، اس سے ہر موجودہ نظام کو خطرہ تھا، حسن بن صباح کا فرقۂ باطنیہ اس قدر خطرناک نہ تھا جس قدر آرمینیا کا فرقۂ اعدامیہ، اس لیے کہ باطنیوں کا وار صرف افراد پر پڑتا تھا اور اعدامیوں کی زد میں افراد اور موجودہ نظام سب آتے تھے، روس کو الکزنڈر ثانی کے قتل سے اس خطرناک تحریک کا پورا تجربہ ہوگیا تھا، اس لیے باوجود اس کے کہ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا بہت اچھا موقع سامنے تھا وہ کبھی آرمینیوں کی حمایت کے لیے تیار نہ ہوا بلکہ برطانیہ کو بھی ان کی عملی ہمدردی سے روکنے کی کوشش کرتا رہا، جرمنی اور آسٹریا ہنگری کو ان کے ذاتی اغراض نے دولت علیہ کی مخالفت سے روک رکھا ہو مگر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے اور کریٹ میں ان کے متحدہ بیڑے باغیوں کی حمایت کر رہے تھے، لیکن یہ دونوں حکومتیں بھی خوب واقف تھیں کہ آرمینیا میں جس فتنہ کے استیصال کی کوشش ہو رہی ہے وہ تمام حکومتوں کے لیے یکساں طور پر خطرناک ہے، یہی سبب تھا کہ زبان اور قلم سے تو ان حکومتوں نے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کی بہت کوشش کی مگر کبھی ان دھمکیوں کو عمل میں لانے کی جرأت نہیں ہوئی، حالاں کہ کریٹ اور یونان میں ان کے جنگی بیڑے اور فوجیں فوراً پہنچ گئیں، یہ زبانی دھمکیاں بھی جو برطانیہ اور فرانس برابر دیتے رہے اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ آرمینیوں نے اپنی مظلومیت کا پروپگنڈا تمام یورپ میں نہایت کثرت سے کیا تھا اور مغربی اقوام کو یقین ہوگیا تھا کہ ترک ان کے مشرقی بھائیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں، باب عالی کی معمولی بدنظمیوں کو شدید مظالم کا رنگ دے کر یوروپین قوموں کے سامنے پیش کرنا آرمینیوں کا عام شیوہ تھا اور اس میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی، ترکوں کے خلاف نفرت اور غصہ کے جذبات یورپ میں مدت سے پھیلے ہوئے تھے اور بقول مسٹر نائٹ ان کے خلاف ہر بیان خواہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو بے چوں و چرا

(۱) میریٹ ص ۳۹۹ فٹ نوٹ

تسلیم کر لیا جاتا تھا(۱) ایسی صورت میں آرمینی پروپگنڈے کی کامیابی تعجب خیز نہیں، فرانس اور برطانیہ کی حکومتوں نے اس باب میں جو کچھ کیا وہ قوم کے شدید تقاضوں سے کیا، ورنہ وہ آرمینی انقلابیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر تھیں۔

تونس: اب تک سلطنت عثمانیہ کے جو صوبے مغربی حکومتوں کے زیر سایہ آزاد ہو چکے تھے، ان میں عیسائیوں کی آبادی بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ تھی اور انہی کے حقوق کا تحفظ دولِ عظمیٰ کے لیے مداخلت کا حیلہ بن جاتا تھا، لیکن دولت علیہ کے روز افزوں انحطاط نے اب دشمنوں کے اندر اس سے بڑے حوصلے پیدا کر دیئے اور انھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان صوبوں میں بھی جہاں کی آبادی تقریباً تمامتر مسلمانوں پر مشتمل ہے، مداخلت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ایک طرف وہ عیسائی رعایا کی آزادی کے لیے باب عالی پر ہر ممکن طریقہ سے دباؤ ڈال رہے تھے اور دوسری طرف سلطنت کے اسلامی صوبوں پر قبضہ کرنے کے لیے صرف موقع کے منتظر تھے، ۱۸۲۹ء میں معاہدۂ اورنہ کے رو سے یونان کی آزادی تسلیم کی گئی اور برطانیہ، روس اور فرانس نے اپنی متحدہ سرپرستی میں یونان کی خودمختار حکومت قایم کر دی، لیکن دوسرے ہی سال ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور جب قبائل عرب نے اپنے ملک کے لیے ہتھیار اٹھائے تو حکومت فرانس کی پوری قوت ان کے مقابلہ میں صرف کر دی گئی اور چالیس سال تک فرانسیسی سپاہیوں نے الجزائر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا، الجزائر کے بعد نگاہیں تونس کی طرف اٹھیں، یہ بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور موقع کے لحاظ سے فرانس کے استعماری مقاصد کے لیے نہایت اہمیت رکھتا تھا لیکن دقت یہ تھی کہ اس پر قبضہ کرنے کے لیے ویسا خفیف عذر بھی نہ تھا جیسا الجزائر پر حملہ کے لیے ہاتھ آ گیا تھا، اس مشکل کا حل فرانس کی خوش قسمتی سے برلن کانگریس میں مل گیا، کانگریس ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو منعقد ہوئی مگر اس سے قبل ہی انگلستان اور باب عالی کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ

---

(۱) بیداری ترکی از نائٹ ص ۱۷- The Awakening of Turkey by Knight

سائپرس کے متعلق ہو گیا تھا، جس کی اطلاع اس وقت تک دوسرے دولِ عظمیٰ کو نہ تھی، چوں کہ اس کانگریس میں نہایت اہم مسائل پیش ہونے والے تھے اور اندیشہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی سامنے آجائے گا، اس لیے مغربی حکومتوں کے نمایندے ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کو یہ بدگمانی تھی کہ ممکن ہے دوسرے نے باب عالی سے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے کر رکھا ہو، اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے افتتاح کے وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہر سفیر اس امر کا اعلان کرے کہ مسائل زیر بحث سے متعلق اس کی حکومت نے کوئی خفیہ معاہدہ پہلے سے نہیں کر رکھا ہے، بیکنس فیلڈ اور سالسبری جو حکومت برطانیہ کی نمایندگی کر رہے تھے، اس تجویز سے نہایت سراسیمہ ہوئے لیکن انھیں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور ان دونوں کو بھی دوسری حکومتں کے نمایندوں کی طرح مذکورہ بالا اعلان کرنا پڑا، ابھی کانگریس کا اجلاس ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ۹ رجولائی کو لندن کے ایک اخبار گلوب (Globe) میں معاہدۂ سائپرس کا مسودہ شایع ہو گیا، واقعہ یہ تھا کہ مارون (Marvin) نامی ایک سیاح کو جو مشرقی ممالک میں سیاحت کر چکا تھا اور مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھا، برطانیہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے معاہدۂ مذکور کا ترکی مسودہ ترجمہ کے لیے دیا گیا تھا، حالانکہ دفتر وزارت میں وہ کسی عہدہ پر مامور نہ تھا، اس شخص نے ایک بڑی رقم کے عوض گلوب کے ہاتھ ترجمہ کی ایک نقل فروخت کر ڈالی، بہر حال معاہدۂ سائپرس کی اشاعت سے برلن میں برطانوی سفارت پر گویا بجلی سی گر گئی اور اگرچہ لندن میں فوراً مسودہ کی صحت سے انکار کیا گیا تاہم برلن میں حقیقت حال زیادہ دنوں پوشیدہ نہ رہ سکی، برطانوی نمایندوں کی بددیانتی سے کانگریس میں اس قدر برہمی پھیلی کہ اس کے درہم برہم ہو جانیکا اندیشہ پیدا ہو گیا، پرنس گورچاکوف اور وڈنگٹن نے جو روس اور فرانس کی نمایندگی کر رہے تھے، علانیہ اپنے غصہ کا اظہار کیا، معاملہ نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی تھی اور اس کی مزید بدنمائی صرف بسمارک کی کوششوں سے رفع کی جا سکی، بسمارک نے 'ایماندار دلال' کی حیثیت

سے فرانس اور برطانیہ کے درمیان مندرجہ ذیل مصالحت طے کرادی، جس کے بعد ویڈنگٹن کا سارا غصہ جاتا رہا، فرانسیسی اور برطانوی نمایندوں کے درمیان یہ طے پایا کہ

(۱) انگلستان نے سائپرس کو جس طرح (خفیہ طریقہ سے) حاصل کرلیا ہے اس کی تلافی کے لیے فرانس کو اجازت دی جائے کہ وہ جس وقت کوئی مناسب موقع ہاتھ آئے تونس پر قبضہ کرلے، انگلستان کی طرف سے کوئی مخالفت نہ ہوگی۔

(۲) مصر میں جو مالیاتی انتظامات ہو رہے ہیں، ان میں فرانس کو بھی انگلستان کے برابر دخل دیا جائے۔

(۳) شام کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے تحفظ کا جو دعویٰ فرانس زمانہ قدیم سے کرتا آیا ہے برطانیہ اسے تسلیم کرلے۔(۱)

اس معاہدہ کے بعد فرانس کو انگلستان کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور وہ صرف مناسب وقت کا منتظر رہا لیکن جب حملہ کے لیے کوئی معقول حیلہ نظر نہ آیا تو تونس کے فرانسیسی نمایندہ تھیودور روستان (Theodore Roustan) نے بے بنیاد سفارتی شکایات تصنیف کر کے والی تونس محمد الصادق کے سامنے ایسے بے ہودہ مطالبات پیش کیے جن کو تسلیم کرلینا گویا اس علاقہ کو فرانس کے حوالہ کر دینا تھا، اس کے بعد جو ہوا اسے اسٹینلی لین پول اپنی کتاب بربری قزاق میں یوں بیان کرتا ہے: ''ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طاقت ور حکومت نے جس پر مقابل کی مضبوط حکومتوں کی طرف سے کوئی روک نہ تھی ایک نہایت کمزور لیکن ایماندار مملکت کے خلاف خفیہ طور پر اپنی جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں اور بالآخر الجزائر کی سرحد سے متصل بعض قبائل کے ہنگاموں کو عذر قرار دے کر جو ایک مضحکہ خیز عذر تھا تونس پر حملہ کا فیصلہ کرلیا، بے فائدہ محمد الصادق نے روستان کو یقین دلایا کہ قبائل میں امن وامان قایم کر دیا گیا ہے، بے فائدہ اس نے

---

(۱) تاریخ ''قبضہ مصر'' از ولفریڈ بلنٹ ص ۲۸-۲۷

Secret History of the British Occupation of Egypt by Wilfred Blunt

تمام حکومتوں اور خصوصاً انگلستان سے اپیل کی، لارڈ گرانویل (وزیر خارجہ انگلستان) نے حکومت فرانس کے اس بیان پر یقین کرلیا کہ ''الجزائر اور تونس کے درمیان سرحدی علاقہ میں جو فوجی نقل وحرکت عنقریب شروع ہونے والی ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ الجزائر کے علاقہ میں سرحدی قبائل کی جو یورشیں برابر ہوا کرتی ہیں، ان کا خاتمہ کردیا جائے، بے (محمد الصادق) کی آزادی اور اس کے علاقہ کا استقلال کسی طرح خطرہ میں نہیں ہے۔''(۱)

ان تصریحات کے باوجود اپریل ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی فوجوں نے تونس پر حملہ کردیا اور ۱۲ ارمئی کو محمد الصادق نے بالکل مجبور ہوکر معاہدۂ قصر السعید پر دستخط کردئے، اس معاہدہ کے رو سے تونس پر فرانسیسی تسلط قایم ہوگیا، اگرچہ حکومت نام کے لیے محمد الصادق کی رہی، محمد الصادق کے انتقال کے بعد سیدی علی بے حاکم مقرر ہوا، لیکن اس کی حیثیت بھی فرانسیسی محمیہ (Profectorate) کے ایک عہدہ دار سے زیادہ نہ تھی۔

قبائل نے معاہدۂ قصر السعید کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے، تونس کے جنوبی صوبوں نے علانیہ بغاوت کردی اور کچھ دنوں تک ان صوبوں میں ہر طرف بدامنی پھیلی رہی، اس کے استیصال میں فرانسیسی فوجوں نے اپنی سابق روایات کے مطابق پوری سرگرمی دکھائی، فاس پر بے دردی کے ساتھ گولہ باری کرکے اسے لوٹ لیا گیا، مکانات مع باشندوں کے جلادئے گئے، قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا اور جو کچھ اس سے قبل الجزائر میں ہوچکا تھا وہ سب تونس میں دہرایا جانے لگا، کچھ دنوں کے بعد بتدریج حالات رو بہ اصلاح ہونے لگے، خصوصاً جب روستان وہاں سے واپس بلالیا گیا تو امن و امان قایم کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوتی گئی۔

فرانس نے تونس کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس کے متعلق لین پول نے ایک فرانسیسی فاضل ہنری ڈی روشفورٹ (Henri de Rochfort) کا مندرجہ ذیل قول نقل

(۱) بربری قزاق ص ۳۰۸ The Barbary Corsairs by S. Lanepoole

کر کے اصل حقیقت واضح کر دی ہے، روشفورٹ لکھتا ہے: ''ہم نے تونس کی مہم کو ایک معمولی قریب سے تشبیہ دی تھی یہ صحیح نہ تھا، تونس کا معاملہ مثل قزاقی کے ہے، جس کی شدت قتل کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔''(۱)

'برلن کانگریس' میں سلطنت عثمانیہ کی حمایت کا مظاہرہ سب سے زیادہ جس طاقت نے کیا تھا وہ برطانیہ تھی، لیکن معاہدۂ سائپرس کے افشا کے بعد تونس کے متعلق جو معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے نمایندوں میں ہوا اور جس کی بنا پر تونس کو جو اس وقت تک دولت علیہ کی فرماں روائی میں داخل تھا فرانسیسی عسکریت کا شکار بنا کر آگ اور خون کی راہ سے حکومت فرانس کے قبضہ و اقتدار میں لایا گیا، وہ برطانیہ کی دوستی کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے، کانگریس میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ برطانیہ کے لیے نہایت تشویش ناک تھا، روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور جنگ کے آخری ایام میں خود قسطنطنیہ اس کی زد میں آ گیا تھا، ایسی صورت میں برطانیہ کی مداخلت اور کانگریس کے اجلاس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کے تحفظ پر زور دینا کچھ اس سبب سے نہ تھا کہ وہ دولت علیہ سے حقیقی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ محض اس خوف سے تھا کہ اگر روس کو آگے بڑھنے سے روکا نہ گیا تو مشرقِ ادنیٰ میں اس کا تسلط قایم ہو جائے گا جو برطانوی مصالح کے لیے حد درجہ خطرناک ثابت ہوگا اتنا ہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اس طرز عمل کا مقصود یہ بھی تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے جو فائدہ دوسری حکومتیں اٹھانا چاہتی ہیں اسے خود اپنے لیے محفوظ کر لے، چنانچہ عین اس وقت جب 'برلن کانگریس' میں برطانیہ کا وزیر اعظم لارڈ بیکنس فیلڈ عثمانی مقبوضاقت کے تحفظ پر نہایت پر جوش تقریریں کر رہا تھا اور اپنی ترک دوستی سے یوروپین قوموں کا نشانۂ ملامت بنا ہوا تھا، معاہدۂ سائپرس پر کامل راز داری کے ساتھ باب عالی کے نمایندوں کے دستخط لیے جا رہے تھے اور پھر جب کانگریس کے اختتام سے قبل ہی یہ راز منظر عام پر آ گیا اور دسری حکومتں کو برطانیہ کی

(۱) بربری قزاق ص ۳۰۹ - The Barbary Corsairs by S. Lanepoole

بددیانتی پر طیش آیا تو سلطنت عثمانیہ ہی کے ایک دوسرے صوبہ (تونس) کو فرانس کے حوالہ کر کے جس کی برہمی سے ساری کانگریس اور اس کے ساتھ مشرقِ ادنیٰ کے تمام برطانوی مصالح کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا اس دوستی کا حق ادا کیا گیا، لیکن یہ حق سائپرس اور تونس کے معاہدوں کے بعد بھی پوری طرح ادا نہ ہوا، اس کے لیے کسی اور موقع کا انتظار تھا، خوش قسمتی سے مصر نے یہ موقع بہت جلد بہم پہنچا دیا۔

مصر: سلطان عبدالحمید ثانی کی تخت نشینی کے وقت مصر کا والی اسماعیل پاشا تھا، محمد علی پاشا کے جانشینوں میں وہ پہلا شخص تھا، جس نے خدیو مصر کا لقب حاصل کیا ہے، یہ لقب اسے سلطان عبدالعزیز نے ۱۸۶۷ء میں عطا کیا تھا، نیز اسماعیل کی درخواست پر سلطان کی طرف سے ولایت مصر کے قانون وراثت میں اس تبدیلی کی اجازت بھی دی گئی تھی کہ آئندہ ولایت کا حقدار باپ کے بعد بیٹا ہوا کرے، بجائے اس کے کہ حکومت خاندان کے سب سے بڑے فرد کو سپرد کی جائے جیسا کہ سلطنت عثمانیہ میں دستور تھا، اس اہم تبدیلی کے معاوضہ میں اسماعیل نے مصر کے سالانہ خراج کی رقم جو باب عالی میں پیش کی جاتی تھی تین لاکھ چھہتر ہزار پونڈ سے بڑھا کر سات لاکھ بیس ہزار پونڈ کر دی تھی، ۱۸۷۳ء میں ایک دوسرے فرمان سلطانی کے رو سے اسماعیل کو بعض اور حقوق تفویض ہوئے جن کی بنا پر اس کی حیثیت بہت کچھ ایک خودمختار فرماں روا کی ہو گئی۔

ترقی و اصلاحات: اسماعیل ایک روشن خیال فرماں روا تھا اور اس کے پیشِ نظر اصلاحات کا ایک وسیع نظام تھا، اس نے محصول درآمد و برآمد کا نظام از سر نو مرتب کیا، ایک ڈاک خانہ قایم کیا، قاہرہ، سویز اور اسکندریہ میں گیس، پانی کی کلیں اور دوسری اصلاحات جاری کیں، شکر سازی کو رواج دیا اور ریلوے اور تار میں توسیع کر کے نیز بندرگاہیں اور نہریں تعمیر کر کے تجارت اور زراعت کو فروغ دیا، اس نے تعلیم کو ترقی دی، لڑکیوں کے لیے مدرسے قایم کیے، جو مصر میں تعلیم نسواں کے پہلے مدارس تھے، فوجی افسروں کے لیے مختلف فنون حرب کا ایک مدرسہ اور اہل مصر کے لیے ایک طبیہ کالج قایم

کیا، ۱۸۶۳ء میں جب عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تھی مصر میں صرف (۱۸۵) پبلک اسکول تھے، لیکن اس نے اپنے عہد میں ان مدارس کی تعداد (۴۵۱۷) تک پہنچادی، ۱۸۶۹ء میں اس نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ نہر سویز کا افتتاح کیا اور اس تقریب میں یورپ کے متعدد حکمرانوں کو شریک کر کے اہل مصر کی نگاہوں میں بڑی عزت حاصل کی، لیکن یہی تقریب بعد میں اس کے زوال اور مصر کی غلامی کا باعث ہوئی، ۱۸۷۵ء تک مصر میں یہ دستور تھا کہ غیر ملکی باشندوں کے مقدماتِ دیوانی ان کے قنصلوں کی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے تھے، اسماعیل نے اس دستور کو منسوخ کر کے مخلوط عدالتیں قایم کردیں۔(۱)

ملکی قرضہ کا بار: لیکن یہ اصلاحات اور ترقیاں مصر کے حق میں تباہ کن ثابت ہوئیں، سابق والی سعید پاشا کی وفات کے وقت مصر ایک نہایت خوش حال ملک تھا، کاشتکاروں کی حالت پہلے کی بہ نسبت کہیں بہتر تھی، وہ خاصے دولت مند تھے، مصر پر کسی ملکی قرضہ کا بار نہ تھا، لیکن اسماعیل پاشا کے آتے ہی نقشہ بدل گیا، ان اصلاحات میں نہ صرف خزانہ خالی ہوگیا بلکہ قرضہ لینے کی نوبت بھی آگئی، ۱۸ر نومبر ۱۸۷۶ء تک مصر کے ملکی قرضہ کی مقدار گیارہ کروڑ پینتیس لاکھ بہتر ہزار تین سوایک پونڈ تک پہنچ گئی۔(۲)

نہر سویز کے حصوں کی فروخت: قرضہ کا بار ملک کے اندرونی مصارف کے علاوہ بیرونی فتوحات کی کوشش میں بھی بڑھتا گیا، سوڈان اور ابی سینا کی مہموں میں ہزاروں جانیں اور لاکھوں روپیے ضایع ہوئے، سوڈان کی مہم تو ایک حد تک کامیاب رہی اور دارفور پر قبضہ ہوگیا لیکن ابی سینیا میں اسماعیل کی فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور خود اس کا لڑکا دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگیا، ان غیر معمولی مصارف کے لیے ایک طرف قرضہ کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا اور دوسری طرف کاشت کاروں پر بیش از بیش محصول عاید کیے جانے لگے پھر بھی حکومت کے معمولی اخراجات کے لیے روپیہ کافی نہ ہوتا اور اسماعیل

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۵۴۸ (۲) ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴ ص ۴۵۷

کو مزید قرضوں سے چارہ نہ تھا، یورپ کے ساہوکاروں نے مصر کی مالی حالت دیکھ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا، برطانیہ کے لیے مصر پر اپنا تسلط قایم کرنے کا یہ ایک نہایت زریں موقع تھا، لارڈ بیکنس فیلڈ نے جو اس وقت وزیر اعظم تھا اپنے خفیہ گماشتوں کے ذریعہ نہر سویز میں اسماعیل کے تمام حصے جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چھہتر ہزار چھ سو دو تھی، خاموشی کے ساتھ انتالیس لاکھ چھہتر ہزار پانچ سو بیاسی پونڈ میں خرید لیے (۱) اسماعیل اس معاملہ کے مہلک نتائج سے ناواقف نہ تھا لیکن اپنی فضول خرچیوں سے مجبور تھا اور نہر سویز کے حصوں کو فروخت کر دینے کے علاوہ روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

نہر سویز کی اہمیت: نہر سویز کی تعمیر ایک فرانسیسی انجینئر ڈی لیسیس (Delesse) کی تجویز سے ہوئی تھی، اسی نے اسماعیل کو نہر کی تجارتی اہمیت دکھا کر تعمیر پر آمادہ کیا تھا اول اول اس میں زیادہ تر فرانسیسی سرمایہ داروں کے حصے تھے، برطانیہ نے کوئی حصہ نہ لیا مگر جب ۱۸۶۹ء میں یہ نہر بن کر تیار ہوئی اور نہایت عظیم الشان پیمانہ پر اس کی رسمِ افتتاح ادا کی گئی تو برطانیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نہر کے کھل جانے سے مشرق کا بحری راستہ جو اس وقت تک راس امید سے ہو کر گذرتا تھا مسافت میں بہت کم ہو گیا اور اسی اعتبار سے اخراجات بھی بہت گھٹ گئے، علاوہ بریں اس سے خود مصر کی اہمیت حد درجہ بڑھ گئی اور وہ ملک جو اب تک بین الاقوامی اعتبار سے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا، دنیا کے اہم ترین تجارتی راستوں میں سے ایک کا مالک بن گیا، لیکن یہی چیز اس کی سیاسی بربادی کا باعث ہوئی چوں کہ نہر سویز میں زیادہ تر اہل فرانس کے حصے تھے، اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق بھی زیادہ تر فرانس ہی کو پہنچتا تھا، لیکن اپنے ایشیائی مقبوضات اور مقاصد کی بناء پر انگلستان کے لیے اس نہر پر تسلط قایم کرنا نہایت ضروری تھا، یہ عجیب بات ہے کہ برطانوی مدبرین نے شروع میں نہر سویز کی تجویز سے کوئی دلچسپی نہیں لی اور

---

(۱) ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴ ص ۳۵۷ (۱) ترکی ماضی، حال و مستقبل از ٹلفر ڈواہ ص ۲۵

Turkey Yesterday, today & Tomorrow by T. Waugh

وہ اس کی تعمیر کو ایک ناممکن شے خیال کرتے رہے، مگر جب ۱۸۶۹ء میں ڈی لیسپس نے اسے بنا کر تیار کر دیا اور ساری دنیا نے اس تجویز کی کامیابی اپنی نظروں سے دیکھ لی تو برطانیہ کی بھی آنکھیں کھلیں، اس کی خوش قسمتی سے وزارت اس وقت لارڈ بیکنس فیلڈ کے ہاتھ میں تھی، جو اپنے ارادوں کی تکمیل میں دوسرے وزراء کی مخالفت کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا اس نے خفیہ طور پر اسماعیل سے معاملت شروع کر دی اور چونکہ اسماعیل کو روپیوں کی شدید ضرورت تھی اور کہیں سے قرض مل نہیں رہا تھا، اس لیے بیکنس فیلڈ کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں اور اسماعیل کے تمام حصے برطانیہ کے ہاتھ فروخت ہو گئے۔

مصر میں فرانسیسی اور برطانوی اقتدار: لیکن ان حصوں کی فروخت سے بھی اسماعیل کے اخراجات پورے نہ ہو سکے اور اسے مزید قرض کی ضرورت محسوس ہوئی، ادھر یورپ کے ساہوکاروں نے اپنی رقموں کی ادائگی کے لیے شدید تقاضے شروع کیے، اسماعیل ان کو ادا کرنے سے بالکل قاصر تھا، اس کی یہ تدبیر کہ پرانے قرضوں کے ادا کرنے کے لیے سنگین شرحِ سود پر اور قرضے لیے جائیں، بقول ایلیسن فلپس ایک جرعۂ لطیف کی حیثیت رکھتی تھی، جو مرض کی مزید ترقی کا باعث ہوا، اس کے سامنے اب صرف دو راہیں تھیں یا تو اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے یا یوروپین حکومتوں کی مداخلت منظور کرے، جس کی وجہ سے نہ صرف مغربی ساہوکاروں کے بے ہنگام تقاضوں کی روک تھام کی امید تھی بلکہ یہ توقع بھی تھی کہ مزید قرضے مل سکیں گے، چنانچہ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر اسماعیل نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے دوسری صورت اختیار کی اور حکومت برطانیہ سے ایک ماہر مالیات کی درخواست کی جو مصر کے صیغۂ مالیات کا معاینہ کر کے اس کے متعلق صحیح رپورٹ پیش کر سکے، اس درخواست پر دسمبر ۱۸۷۵ء میں مسٹر اسٹیفن کیو (Stephen Cave) حکومت برطانیہ کی طرف سے مصر بھیجے گئے اور ان کی رپورٹ اپریل ۱۸۷۶ء میں شایع ہوگئی، رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ مصر کی مالی ساکھ قایم رکھنے کے لیے یوروپین حکومتوں کی مداخلت ضروری ہے، بغیر اس کے دیوالہ نکلنے سے مفر نہیں

اس کے بعد دوسرے تحقیقاتی کمیشن آنا شروع ہوئے اور ان میں سے ہر ایک اسماعیل کو اور زیادہ یورپ کے قبضہ میں لاتا گیا، نومبر ۱۸۷۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کی طرف سے گوشن (Goschen) اور جوبرت (Joubert) کا مشن آیا، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کا صیغۂ مالیات مشترکہ طور پر فرانس اور انگلستان کی نگرانی میں آ گیا پھر مئی ۱۸۷۸ء میں ایک اور تحقیقاتی کمیشن پہنچا، اس مشن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور انگلستان کی نگرانی صیغۂ مالیات کے علاوہ خدیو مصر کی زمینداری پر بھی قایم کر دی گئی، اس وقت سے مصر گویا مالکانِ دستاویز کے ہاتھوں رہن ہو گیا اور ملک کے تمام ذرائع آمدنی اس سنگین قرض کی ادائگی کی نذر ہونے لگے، جس کا ذمہ دار صرف اسماعیل تھا، چند دنوں کے بعد فرانس اور انگلستان کی مشترکہ نگرانی کی بجائے اسماعیل کو ایک ایسی وزارت قایم کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں ان دونوں حکومتوں کے نمایندے بحیثیت رکن کے مقرر کیے گئے، چنانچہ ستمبر ۱۸۷۸ء میں نیوبر پاشا کی صدارت میں جو وزارت قایم ہوئی اس میں مالیات کا وزیر ریورس ولسن (Rivers Wilson) اور پبلک ورکس کا بلنییرے (Blignieres) مقرر ہوا، یہ گیا ملک کو تمامتر برطانیہ اور فرانس کے اقتدار میں دے دینا تھا، اس سے سخت برہمی پھیلی اور فوج نے عرابی پاشا کی سرکردگی میں بغاوت کردی، اسماعیل کے لیے بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں رہی کہ برطانوی اور فرانسیسی وزرا کو برخاست کر کے اس یوروپین وزارت کا خاتمہ کر دے، برطانیہ اور فرانس کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے باب عالی پر دباؤ ڈال کر اسماعیل کو خدیو کے عہدہ سے معزول کرا دیا، ۲۶ / جون ۱۸۷۹ء کو باب عالی کا ایک تار اسماعیل کو ملا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا توفیق خدیو مقرر کیا گیا۔

توفیق پاشا: عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے سے پہلے توفیق، سید جمال الدین افغانی اور جامع ازہر کے ان مصلحین کے زیر اثر آ چکا تھا جو مصر میں قومی تحریک کے بانی اور دستوری حکومت کے اولین محرک تھے اور اس نے سید جمال الدین افغانی کے توسط سے بار بار یہ

معاہدہ شیوخِ ازہر سے کیا تھا کہ اگر کبھی اسے مصر کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوا تو وہ تمام تر دستوری اصولوں کے مطابق حکومت کرے گا، یہی تھی کہ توفیق کے تقرر کو اس جماعت نے ملک کی خوش نصیبی خیال کیا لیکن ان کی مسرت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور تخت نشینی کے بعد بمشکل ایک مہینہ گذرا تھا کہ وہ اپنے وعدوں کو بھول گیا اور اپنے سابق دوستوں سے غداری کرنے لگا۔

توفیق کے سامنے دو قوتیں تھیں، جن کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے، ایک طرف اس کے اصلاح پسند دوستوں کی جماعت تھی جو اسے دستوری حکومت کے قدیم وعدے یاد دلا رہے تھے، دوسری طرف یورو پین قنصلوں کی قوت تھی جو اسے دستوری حکومت سے روک رہے تھے اور اس بات پر زور دے رہے تھے کہ وہ اپنے اختیارات کے کسی حصہ سے بھی دست کش نہ ہوتا کہ وہ خود اس کے نام سے مصر پر حکومت کرتے رہیں، پہلی قوت سے متاثر ہو کر شروع میں تو اس نے اپنے وزیر شریف پاشا کے مشورہ کے مطابق دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا اور ایک فرمان کے ذریعہ اس کی اشاعت کی اجازت دے دی لیکن جب دوسری طرف سے زور پڑا تو اس فرمان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، اس واقعہ پر شریف پاشا نے استعفا دے دیا اور توفیق نے قنصلوں کی تجویز سے ریاض پاشا کو وزیر مقرر کیا جو یورو پین حکومتوں کے زیر اثر تھا، توفیق نے اپنے دور حکومت کے پہلے ہی اہم معاملہ میں جو کمزوری دکھائی، وہ اس کی تمام آیندہ مشکلات کا سبب بن گئی، اگر اس نے اپنے وعدوں کے مطابق اس وقت ایک مجلس اعیان طلب کر لی ہوتی تو اس کی تمام رعایا اس کے ساتھ ہو جاتی اور وہ سازشیں وجود میں نہ آتیں جو دو سال تک ملک کو بے چینی میں مبتلا رکھنے کے بعد بالآخر ۱۸۸۲ء کے انقلاب کا باعث ہوئیں۔

دستوری حکومت کا اعلان: توفیق کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت حقیقتاً یورو پین سفیروں کے ہاتھ میں آگئی اور انگلستان اور فرانس نے اپنی مشترکہ نگرانی پھر قائم کر لی،

یوروپین عہدہ داروں کی ایک کثیر تعداد نے پہنچ کر ملک کو لوٹنا شروع کیا، اہل مصر میں سخت برہمی پھیلی، خصوصاً جب مصری فوج کی تعداد پچاس ہزار سے گھٹا کر صرف پندرہ ہزار کردی گئی تو ان کے غصہ کی انتہا نہ رہی، توفیق اپنے یوروپین مشیروں کے ہاتھ میں ایسا بے بس تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر نہیں سکتا تھا، اہل مصر کے لیے موجودہ نظام حکومت کے خلاف بغاوت ناگزیر ہوگئی اور مصری فوج نے احمد عرابی پاشا کے زیر علم جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: ''مصر مصریوں کے لیے'' ستمبر ۱۸۸۱ء میں بغاوت کردی اور دستوری حکومت کا مطالبہ پیش کیا، توفیق ملک کے اس متفقہ مطالبہ کو مسترد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اسے مجبوراً دستوری حکومت کا مطالبہ منظور کرنا پڑا، مصری فوج کی تعداد بھی جو یوروپین مشیروں کی رائے کے مطابق گھٹادی گئی تھی پھر بدستور سابق کردی گئی، دستوری حکومت کا فرمان اہل مصر کے لیے ویسی ہی مسرت کا باعث ہوا جیسی مسرت قیدیوں کو مژدۂ رہائی سے پہنچ سکتی ہے، تمام ملک میں جشن کے شادیانے بجنے لگے اور توفیق کے خلاف جو شکایتیں قایم ہوگئی تھیں وہ یک قلم رفع ہوگئیں، اس دستوری حکومت میں یوروپین قنصلوں کے شدید اختلاف کے باوجود عرابی پاشا وزیر جنگ مقرر ہوئے اور توفیق نے اس قانون پر دستخط کردئے جس کے رو سے جدید ٹکسوں کے لیے مجلس اعیان کی منظوری لازمی قرار دی گئی۔

انگلستان اور فرانس کا طرز عمل: اہل مصر کی بیداری یوروپین حکومتوں کے مقاصد کے لیے نہایت مضر تھی کیوں کہ انھوں نے بتدریج مصر پر اپنا تسلط قایم کرنا شروع کردیا تھا، چنانچہ انگلستان اور فرانس نے ایک متفقہ مراسلہ مورخہ ۶ / جنوری ۱۸۸۲ء توفیق پاشا کے پاس بھیجا جس میں اپنی سرپرستی کا یقین دلاتے ہوئے قومی جماعت کے خلاف پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس مراسلہ کے مضمون نے مصریوں کو اور بھی برافروختہ کردیا، خصوصاً جب سلطان نے بھی انگلستان اور فرانس کے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے سفیروں کے ذریعہ جو لندن اور پیرس میں مقیم تھے انھیں مطلع کیا کہ مصر سلطنتِ

عثمانیہ کا ایک صوبہ ہے، اس لیے حکومتِ مصر سے کوئی معاملت باب عالی کے توسط کے بغیر نہیں ہونی چاہیے، تو وطنی جماعت کے حوصلے اور بڑھ گئے، انگلستان اور فرانس نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایک متحدہ جنگی بیڑا اسکندریہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور یہ دھمکی دی کہ اگر عرابی پاشا کو مصر سے نکال نہ دیا جائے گا اور ان کی وزارت توڑ نہ دی جائے گی تو جنگی بیڑے کے ذریعہ یہ مطالبات پورے کرائے جائیں گے، توفیق نے تو دب کر یہ باتیں منظور کر لیں لیکن قومی جماعت پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا، برخلاف اس کے اس نے خود توفیق کو معزول کر دینے کی دھمکی دی اور اسے مجبور کر کے عرابی پاشا کو پھر وزیر جنگ مقرر کرایا، اس کے بعد مصر کی حکومت عملاً عرابی پاشا کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس موقع پر فرانس کی تجویز سے مغربی حکومتوں کے سفرا کی ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی، جس میں حکومت مصر کے معاملات سے متعلق باب عالی کو مشورے دئے گئے اور ان مشوروں کے مطابق مداخلت کرنے کی درخواست کی گئی، سلطان نے اپنی سلطنت کے اندرونی معاملات میں غیر حکومتوں کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے انکار کر دیا، بجائے اس کے اس نے توفیق اور قومی جماعت کی استدعا پر مصر کے لیے ایک کمشنر کا تقرر منظور کیا اور درویش پاشا کو مقرر کر کے روانہ کیا۔

درویش پاشا: درویش پاشا نے قاہرہ پہنچ کر حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کی، لیکن توفیق نے پچاس ہزار پونڈ نقد اور پچیس ہزار پونڈ کے جواہرات نذر کر کے اسے اپنا طرفدار بنالیا(۱) نتیجہ یہ ہوا کہ جب شیوخ ازہر کا وفد اس سے ملنے آیا اور اس نے ملکی جذبات کی پوری ترجمانی کر کے درویش پاشا کے سامنے قوم کے مطالبات پیش کیے تو درویش پاشا نے یہ جواب دے کر وفد کو رخصت کر دیا کہ "میں حکم دینے آیا ہوں، تم سے مشورہ کرنے کے لیے نہیں آیا۔" شیوخ نہایت برہمی کی حالت میں واپس ہوئے اور جو برتاؤ ان کے ساتھ درویش پاشا نے کیا تھا اس کی خبر بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئی،

تاریخ قبضہ مصر از بلنٹ ص ۲۳۳

ہر طرف احتجاجی جلسے اور مظاہرے ہونے لگے اور حکومت کی مخالف کوششوں کے باوجود درویش پاشا کو ملک کے صحیح جذبات سے مطلع ہونا پڑا، معاملات پر قابو پانے کے لیے اس نے عرابی پاشا کو بلا کر دیر تک گفتگو کی اور اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ عرابی پاشا بطور خود وزارتِ جنگ سے دست بردار ہو کر قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں، لیکن عرابی پاشا نے جواب دیا کہ ''چوں کہ اس وقت ملک کی حالت نازک ہے اور امن وامان کا ذمہ دار میں ہوں اس لیے جب تک مجھے باقاعدہ تحریری حکم نہ ملے گا میں اپنے عہدہ سے دست بردار نہیں ہو سکتا''، درویش پاشا کے لیے یہ جواب خواہ کتنا ہی غیر متوقع رہا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ توفیق اور اس کے یوروپین مشیروں کے لیے عرابی پاشا کے خلاف ایک عمدہ موقع ہاتھ آ گیا اور جس شورش کا مواد پہلے سے فراہم کر لیا گیا تھا اسے فوراً درویش پاشا کی موجودگی ہی میں برپا کرا دیا گیا تاکہ باب عالی کے فرستادہ کمشنر پر عرابی کے حسن انتظام کی حقیقت کھل جائے۔

اسکندریہ کا بلوہ: اسکندریہ میں اتفاق سے ایک مصری لڑکے اور ایک مالٹی کے درمیان ۱۱ رجون کو جھگڑا ہو گیا، جس نے دفعۃً بڑھ کر ایک سخت ہنگامہ کی شکل اختیار کر لی، تقریباً دو سو آدمی مارے گئے، جن میں انچاس یوروپین تھے، برطانوی قنصل کوکسن (Cookson) کو سخت چوٹ آئی اور اطالوی اور یونانی قنصل بھی کسی قدر زخمی ہوئے، ان کے علاوہ اسّی (۸۰) نوے (۹۰) یوروپین اور زخمی ہوئے، یہ ہنگامہ ایک بجے دن سے لے کر پانچ بجے شام تک جاری رہا مگر اسکندریہ کی پولیس جو وہاں کے گورنر عمر پاشا لطفی کے زیر حکم تھی، اسے فرو کرنے سے قاصر رہی اور جب تک فوجی دستہ پہنچ نہ گیا کشت وخون ہوتا رہا۔

حقیقت حال: اس ہنگامہ کی ذمہ داری حقیقتاً کن لوگوں پر عاید ہوتی ہے، اس کا اظہار مسٹر بلنٹ نے نہایت صفائی اور دیانت داری کے ساتھ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''چوں کہ اس معاملہ کی ذمہ داری جو مصر کی قومی تحریک کے لیے ایسا افسوس ناک تھا اس شخص پر عاید کی گئی ہے، جس کو اس سے سب سے زیادہ نقصان پہونچا یعنی عرابی اور چوں کہ اس واقعہ نیز دوسرے عذرات کو جو اس سے کم غیر منصفانہ نہ تھے، ہماری وزارت خارجہ وبحریہ نے

یہ عذر پیش کر کے کہ مصر یقینی طور پر بدامنی کی حالت میں ہے، اسکندریہ پر گولہ باری کرنے اور اس کے بعد کی جنگ کا حیلہ بنالیا تھا، اس لیے مناسب ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں بتادیں کہ اس پورے واقعہ کے جرم کی ذمہ داری صحیح طور پر کن لوگوں پر عاید ہوتی ہے، جب میں نے اس کی خبر لندن میں سنی تو میرا پہلا خیال یہ ہوا کہ یہ واقعہ اس سازش کا ایک جز ہے جو میں جانتا تھا کہ درویش پاشا کے ذریعہ سے وزارت خارجہ میں مرتب کی گئی ہے، تاکہ عرابی کو اس کے جال میں پھانسا جائے لیکن اس کے متعلق پوری تفصیلات مجھے لڑائی کے بعد معلوم ہوئیں اور اسی وقت میں اس قابل ہوا کہ قوم پروروں کے خلاف جو غلط الزامات لائے جاتے تھے کہ یہ ہنگامہ انہی کا تجویز اور پیدا کیا ہوا ہے، ان کی تردید کرسکوں، اس وقت ظاہر ہوا کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس تھی جیسا کہ ہم لوگ جو اس وقت کے رازوں سے باخبر ہیں جانتے ہیں، یہ بلوہ اگرچہ اس کی ابتدا غالباً اتفاقی طور پر ہوگئی، چند ہفتے قبل سے درباری جماعت کے زیر تجویز تھا اور وہ اسے کسی مناسب موقع پر عرابی کو بدنام کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتی تھی کہ یہ شخص ملک میں امن وامان قایم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اسکندریہ کی صورتِ حال یہ تھی، مصر کے دوسرے شہروں کی بہ نسبت اسکندریہ بڑی حد تک ایک یوروپین شہر تھا جس میں اسلامی آبادی کے علاوہ یونانی، اطالوی اور مالٹی نوآبادیاں قایم تھیں، یہ سب لوگ تجارت کرتے تھے اور ان میں سے بہتیرے مہاجنی پیشہ تھے، دونوں جماعتوں کے باہمی تعلقات کبھی بھی بہت اچھے نہ تھے اور پھر جنگی بیڑہ کے پہنچنے کے بعد جو علانیہ یوروپین اغراض کے تحفظ کے لیے آیا تھا کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی، امن قایم رکھنے کے لیے شہر کے گورنر کا بہت وفادار مضبوط اور سمجھ دار ہونا ضروری تھا، نیز جنگی بیڑہ کے لیے بھی بہت سوچ سمجھ کر کام کرنے کی ضرورت تھی، بدقسمتی سے گورنر عمر لطفی پاشا نیشنلسٹ منسٹری کا بالکل مخالف تھا، وہ چرکس تھا، درباری پارٹی کا ممبر تھا اور سابق خدیو اسماعیل کا طرفدار تھا اور چرکسی سازش کے موقع پر اس نے مغرب کے

بدوؤں کو خدیو توفیق کا حامی بنا کر اس کی بڑی مدد کی تھی، اس بنا پر اس نے بجائے دبانے کے مسلمان آبادی میں شورش کرنے والوں کو اور ابھار دیا تھا، دوسری طرف یونانی اپنی جماعت کے سردار امبرائز سیناڈینو (Ambroise Sinadino) کی مدد سے جو ایک دولت مند ساہوکار اور مصر میں روتھس چائلڈز (Rothschilds) کا ایجنٹ بھی تھا، مسلح ہونے لگے تھے اور مالٹیوں نے بھی جن کی تعداد زیادہ تھی انگریزی قنصل کوکسن (Cookson) کے اشارہ سے اپنے کو مسلح کر لیا تھا، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مئی کے آخری ہفتہ میں بلوہ کے لیے تیاریاں ہو گئی تھیں۔(۱)

اسکندریہ کی گولہ باری: اس بلوہ کی تیاری جیسا کہ مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے درویش پاشا کے اسکندریہ پہنچنے (۸رجون) سے قبل ہو چکی تھی اور اس کا مقصد درویش پاشا پر یہ ظاہر کر دینا تھا کہ عرابی پاشا ملک میں امن و امان قایم رکھنے کی اہمیت اور قوت نہیں رکھتا، مسٹر بلنٹ کا خیال ہے کہ درویش پاشا اس سازش سے بے خبر نہ تھا اور اگر عرابی پاشا اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے جیسا کہ درویش پاشا نے زور دیا تھا تو یہ بلوہ روک دیا جاتا، بہر حال جس مقصد سے یہ بلوہ کرایا گیا تھا نتیجہ اس کے برخلاف نکلا، اس کے ترتیب دینے والوں نے جس پیمانہ پر اسے کرانا چاہا تھا یہ اس سے بہت بڑھ گیا اور پھر مجبوراً اسے فرو کرنے کے لیے فوجی مدد منگانی پڑی، بجائے اس کے کہ عرابی پاشا کی پوزیشن کو اس سے نقصان پہنچے اسکندریہ کی عیسائی آبادی انھیں اپنا محافظ سمجھنے لگی، فوج نے اس کے بعد اسکندریہ اور قاہرہ میں پوری طرح امن قایم کر لیا، جس کی وجہ سے عرابی پاشا کا اثر و اقتدار اور زیادہ بڑھ گیا، یہ موقع عرابی پاشا کے لیے بہت اچھا تھا، وہ اگر تدبر اور قوت سے کام لیتے تو وطنی تحریک کے دشمنوں کو بھی قابو میں لا سکتے تھے اور عیسائیوں کو بھی مطمئن کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس قیمتی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور چوں کہ یورپ کی سیاسی چالوں سے ناواقف تھے، اس لیے آسانی کے ساتھ میلٹ (Malet) اور کالوین

(۱) بلنٹ ص ۲۳۶-۲۳۵

(Colvin) کے فریب میں آگئے، جو ایک طرف تو ان سے امن قایم رکھنے کی تاکید کر رہے تھے اور دوسری طرف برطانوی جنگی بیڑہ کو اسکندریہ پر گولہ باری کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کر رہے تھے(۱) برطانوی امیر البحر سیمور (Seymour) کے لیے گولہ باری کا عذر پیدا کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی، گذشتہ بلوہ میں اس کا ایک ملازم بھی مارا گیا تھا، اس نے قسم کھائی تھی کہ اس قیمتی جان کا خون بہا اسکندریہ والوں سے لے کر رہوں گا، عرابی پاشا کو بھی اب اصلی خطرہ کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے اسکندریہ کی قلعہ بندی کا کام شروع کر دیا تھا، سیمور نے ان کو قلعہ بندی کے کام سے روکنا چاہا لیکن عرابی پاشا نے انکار کر دیا، یہ عذر برطانوی امیر البحر کے لیے بہت کافی تھا اور اس نے فوراً ہی اسکندریہ پر گولہ باری شروع کر دی (۱۱ر جولائی ۱۸۸۲ء) شہر کا ایک بڑا حصہ مسمار ہو گیا، مصری فوج کو قلعہ چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا اور اسکندریہ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

جنگ آزادی: اسکندریہ کی گولہ باری مصر پر انگریزی قبضہ کا مقدمہ تھی، دو ماہ تک اہل مصر عرابی پاشا کی سرکردگی میں انگریز حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن بالآخر خود اپنوں نے غداری کی اور تل کبیر کی شکست نے قومی جماعت کے بازو توڑ دیے، مسٹر بلنٹ نے جو مصر کی وطنی تحریک میں شروع سے شریک تھے اور اس کی کامیابی کے لیے کسی امکانی کوشش سے باز نہ آئے، اس جنگ آزادی کے سچے واقعات اپنی کتاب 'مصر پر انگریزی قبضہ کی مخفی تاریخ' کے سولھویں باب میں تفصیل کے ساتھ درج کر دیے ہیں، ہم اس کا خلاصہ اور اہم اقتباسات ذیل میں پیش کرتے ہیں، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں:

> ''اس جنگ کا کوئی صحیح بیان کسی انگریز مصنف کی کتابوں میں نہیں ملے گا اور فرانسیسی بیانات میں تو سچائی اس سے بھی کم پائی جاتی ہے، انگریزی فوجی دستہ کی سرپرستی میں خدیو اور ترکی چرکسی حکومت کے قاہرہ میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک سال یا اس سے

(۱) بلنٹ ص ۲۴۰

زیادہ عرصہ تک جس عہد درشت کا قیام رہا۔اس نے کافی طور پر اہل مصر کی زبان بندی کردی، جس کی وجہ سے وہ ان واقعات کو بیان نہ کر سکے جو خدیو کی غیر موجودگی کے زمانہ میں وہاں پیش آئے تھے اور گو عرابی کے مقدمہ کی شہرت سے عارضی طور پر کچھ روشنی ان واقعات پر پڑ گئی تاہم ملکی پریس کے کسی جریدہ میں اتنی جرأت نہیں پائی گئی کہ وہ سرکاری بیان سے ہٹ کر ان واقعات کو بیان کر سکے پھر اس کے بعد جب فرانس کی سرپرستی میں قومی اخباروں میں کچھ ہمت پیدا ہوئی تو اس وقت تک چند غلط روایتیں مشہور ہو چکی تھیں، جو آج بھی بڑی حد تک مصر کے تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر انداز ہیں۔

پہلی بات جسے واضح کر دینا ضروری ہے، کیوں کہ یہ پارلیمنٹ کی رپورٹوں (Blue Books) میں مسخ کر کے پیش کی گئی ہے اور تمام انگریز مصنفوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے، یہ ہے کہ انگریزی حملہ کے مقابلہ میں جو مدافعت مصر کی طرف سے پیش کی گئی وہ اصلاً ایک قومی مدافعت تھی، سرکاری بیان یہ ہے کہ صرف فوج نے گولہ باری کے وقت سیمور کے ناممکن مطالبات کا اور پھر اولزلے (Wolseley) کے بری حملہ کا مقابلہ کیا، یہ محض اُس سیاسی افسانہ کا تسلسل ہے جو وزارت خارجہ میں اس غرض سے مرتب کیا گیا تھا کہ مصر کی مالیات میں مداخلت کرنے کا عذر ہاتھ آجائے اور یہ افسانہ جھوٹ کی ایک حد درجہ مسخ شدہ صورت میں لارڈ ڈفرن کی افتتاحی تقریر میں پڑھا جا سکتا ہے، جو انھوں نے قسطنطنیہ کی یوروپین کانفرنس میں کی تھی، انگریزی سفیر (ڈفرن) کے بیان کے مطابق مصر گولہ باری سے قبل بدامنی کی حالت میں تھا، جہاں لوگوں کی جان و مال کا کوئی تحفظ نہ تھا اور قتلِ عام جاری

تھا اور اس کی ذمہ دار فوج تھی جو عرابی پاشا اور دوسرے باغی افسروں کی سرکردگی میں کام کر رہی تھی اور جس کی وجہ سے حکومت کو چلانا اور امن و امان اور مالیاتی استواری قایم رکھنا ناممکن تھا، میں اس سے قبل کافی طور پر واضح کر چکا ہوں کہ یہ بیان سیاسی صورتِ حال کا کس قدر شدید مبالغہ آمیز نقشہ تھا نیز یہ کہ کس طرح رفتہ رفتہ اسے دروغ اور اختراعات کی بنیاد پر قایم کیا گیا تھا۔''(۱)

مئی میں جنگی بیڑہ کے اسکندریہ پہونچ جانے کے بعد اہل مصر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یوروپین حکومتوں نے جو سلوک تونس کے ساتھ کیا ہے وہی ان کے ملک کے ساتھ بھی کیا جانے والا ہے، تونس پر قبضہ کرنے سے پہلے غلط طور پر مشہور کیا گیا تھا کہ وہاں بدامنی اور بغاوت پھیلی ہوئی ہے، جس سے یوروپین باشندوں کی جان و مال خطرہ میں ہے اور ان کے تحفظ کے لیے مداخلت ضروری ہے، اس کے بعد یہ ظاہر کیا گیا کہ وہاں کے فرماں رواکو اس کی باغی رعایا سے بچانے کی ضرورت ہے اور اس عذر کی بنا پر اسے قبضہ میں کر لیا گیا پھر اسے مجبور کیا گیا کہ اپنے لیے ایک 'فوجی تحفظ' منظور کرے یعنی اپنے کو تمام تر حملہ آوروں کے حوالہ کر دے، یہ سب کچھ فرانس نے تونس میں کیا تھا اور اب بالکل یہی نقشہ انگریزوں نے مصر کے لیے تیار کیا تھا، قلعہ بندی کا کام روکنے کے لیے جب سیمور کا حکم نامہ عرابی پاشا کے پاس پہنچا تو یہ نقشہ ہر مصری کی آنکھوں کے سامنے تھا اور کسی کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ جو تلوار وطن کی حفاظت کے لیے ہاتھ میں لی گئی ہے اسے حملہ آوروں کے خون سے رنگین کرنے سے پہلے خاموشی سے حوالہ کر دیا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ ۱۰؍جولائی کو جس فیصلہ کی بنا پر سیمور کے مطالبات مسترد کر دئے گئے تھے اس میں عرابی پاشا کی رائے کو بہت کچھ دخل تھا، تاہم مجلس شوریٰ کے تمام ارکان اس امر پر متفق تھے کہ جنگ یا فرمانِ سلطانی کے بغیر سرزمینِ مصر کا کوئی حصہ کسی اجنبی کے

(۱) بلنٹ ص ۲۸۶-۲۸۵

حوالہ کر دینا خدیو کے قانونی اختیارات سے باہر تھا، خدیو کی خود بھی یہی رائے تھی، ہر شخص نے یہ رائے دی کہ قلعوں کا بچانا ضروری ہے، اس مجلس میں جو خاص طور پر اسی مسئلہ کے لیے منعقد کی گئی تھی، درویش پاشا بھی موجود تھا اور اس نے بھی دوسرے ارکان کی رائے سے اتفاق کیا، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان کو بھی اس فیصلہ سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، اس متفقہ فیصلہ کی بنا پر خدیو نے عرابی پاشا کو جو وزیر جنگ اور وزیر بحریہ تھا حکم دیا کہ جس وقت برطانوی بیڑہ گولہ باری شروع کرے، مصری توپخانوں سے اس کا جواب دیا جائے اور ۱۰ر جولائی کو شام کے وقت نائب وزیر جنگ کو قاہرہ میں اطلاع دی گئی کہ تمام صوبوں میں اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کو ہدایت کی گئی کہ فوجیں تیار رکھے اور نئے دستوں کے لیے سپاہی بھرتی کرے۔(۱)

خدیو کی وطن دشمنی: لیکن ان احکام کے باوجود توفیق پاشا انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، وہ خفیہ طور پر سیمور سے نامہ و پیام کا سلسلہ قایم کیے ہوئے تھا اور ۶ر جولائی کو اسے انگریزوں کی طرف سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ اسکندریہ پر گولہ باری ہو کر رہے گی نیز اس سے باصرار کہا گیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے کسی انگریزی جہاز پر منتقل ہو جائے لیکن چوں کہ وہ علانیہ اہل مصر سے غداری کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اس نے یہ دعوت قبول نہ کی اور مصر سے باہر جانے پر راضی نہ ہوا لیکن گولہ باری شروع ہونے سے پہلے وہ رملہ چلا گیا جو اسکندریہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں بیٹھا ہوا امید و بیم کی حالت میں اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرتا رہا، مصر میں عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ اسکندریہ کی توپیں انگریزی بیڑہ کو غرق کر دیں گی، گولہ باری کے روز توفیق رملہ میں تھا اور ہر نصف گھنٹہ کے بعد دوڑ کر اپنے محل کی چھت پر جاتا تھا کہ جنگ کا انجام معلوم کرے، شام تک اسے معلوم ہو گیا کہ قلعہ کی توپیں خاموش ہو گئیں اور انگریزی

(۱) بلنٹ ص ۲۸۷

بیڑہ اپنی جگہ پر قایم ہے، اس کے بعد اس کا تذبذب بھی جاتا رہا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے کو سیمور کی حفاظت میں دیدے۔(۱)

قومی حکومت: قاہرہ میں جس وقت یہ خبر پہنچی کہ توفیق انگریزوں کے زیر اثر آگیا، فوراً ایک مجلس عمومی منعقد کی گئی تاکہ صورتِ حال پر غور کر کے آیندہ کے لیے کوئی فیصلہ کیا جائے، اس مجلس میں نمایاں حصہ فوجی لوگوں سے زیادہ مذہبی اور ملکی عمایدین نے لیا، ملک کی ہر جماعت کے نمایندوں نے اس میں شرکت کی، یہاں تک کہ قبطیوں کا مذہبی پیشوا اور یہودیوں کا ربی بھی شریک ہوا، مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ توفیق انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، اس لیے قانوناً اس کے احکام قابل تعمیل نہیں ہوسکتے، چنانچہ انگریزوں کی حمایت اختیار کرنے کے بعد توفیق نے عرابی پاشا کو وزارتِ جنگ سے برخاست کرنے کا جو حکم صادر کیا تھا مجلس نے اس کے خلاف حکم صادر کیا اور عرابی پاشا کو ہدایت کی کہ وہ بدستور اپنے عہدہ پر قایم رہ کر ملک کی مدافعت کرتے رہیں، عرابی پاشا کی مدد کے لیے ایک 'مجلس مدافعت' مقرر کی گئی جس کے صدر یعقوب پاشا سامی، نائب ناظم جنگ مقرر ہوئے، ملکی انتظامات بدستور قایم رکھے گئے اور راغب پاشا اور دوسرے وزرا کی غیر حاضری کے باوجود جنھیں توفیق اور اس کے انگریز محافظین نے بحیرا اسکندریہ میں روک رکھا تھا، حکومت کے تمام کام بغیر کسی ہرج یا نقصان کے انجام پاتے رہے، مسٹر بلنٹ لکھتے ہیں کہ دورانِ جنگ میں قومی حکومت کے انتظامات اتنے عمدہ تھے کہ مصر میں کبھی کسی حکومت نے اس سے بہتر طریقہ پر انتظامات نہیں کیے، پھر لکھتے ہیں کہ 'لارڈ ڈفرن کے اس قول سے زیادہ غلط بات کوئی نہیں ہوسکتی، جس کا ذکر انھوں نے قسطنطنیہ کی کانفرنس میں بار بار کیا کہ مصر میں عیسائیوں کا قتل عام روز ہوتا رہتا ہے۔''(۲)

کفر دوار: اسکندریہ کی گولہ باری کے بعد عرابی پاشا کو اپنی فوجیں قلعہ سے نکال لینی پڑیں، اب انھوں نے مدافعت کے لیے کفر دوار کا مقام منتخب کیا جو قاہرہ کی ریلوے

(۱) بلنٹ ص ۲۸۹ (۲) ایضاً ص ۲۹۱

لائن پر واقع تھا اور بہت محفوظ اور مضبوط مقام تھا، یہ سیمور کی توپوں کی زد سے باہر تھا، یہاں مصری فوجیں پانچ ہفتہ تک انگریزوں کا مقابلہ کرتی رہیں اور کبھی کبھی انھیں شکست دے کر اسکندریہ کے قریب تک بھگا دیتی تھیں لیکن چوں کہ مصر میں داخل ہونے کا تنہا یہی ایک راستہ نہ تھا اور برطانوی سیاست نے نہ صرف خدیو کو انگریزوں کا حامی بنالیا تھا بلکہ رشوت ستانی کے ذریعہ قبائل عرب کی ہمدردی اور مدد بھی حاصل کر لی تھی، اس لیے مصری فوجیں زیادہ دونوں تک مقابلہ نہ کرسکیں، عرابی پاشا کی شکست کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ خود ان کے افسروں نے انگریزوں سے رشوت لے کر عین وقت پر غداری کی، اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اسماعیلیہ: ۱۶/اگست کو اولزلے ایک تازہ انگریزی فوج کے ساتھ اسکندریہ پہنچا اور یہ دیکھ کر کہ کفر دوار کی طرف سے آگے بڑھنا ممکن نہیں، اس نے نہر سویز کی جانب رخ کیا، یہ خطرہ قاہرہ کی مجلس حربی نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور ارکانِ مجلس کی یہ قطعی رائے تھی کہ سویز کی ناکہ بندی کر کے انگریزی فوج کا اقدام روک دیا جائے، اس درمیان میں ڈی لیسپس اسکندریہ پہونچ گیا تھا، وہاں اسے معلوم ہوا انگریز نہر سویز کی راہ سے مصر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں چونکہ ایسا کرنے سے نہر کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا ڈی لیسپس پورٹ سعید پہنچا اور اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ نہر پر جنگ نہ ہونے پائے، یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ مجلس حربی کے فیصلہ کے باوجود عرابی پاشا سویز کی ناکہ بندی کے لیے تیار نہ ہوئے، ڈی لیسپس نے انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے اثر سے انگریزوں کو بھی نہر کے استعمال سے باز رکھے گا، عرابی پاشا کا ڈی لیسپس کے وعدہ پر بھروسا کر کے سویز کی ناکہ بندی سے ہاتھ اٹھالینا فوجی نقطۂ نظر سے ایک ایسی شدید غلطی تھی جس کی تلافی آخر وقت تک نہ ہوسکی، اولزلے نے ڈی لیسپس کے اس عذر کی مطلق پروا نہ کی کہ نہر سویز کا علاقہ ایک غیر جانبدار علاقہ ہے جس میں جنگ نہ ہونی چاہیے اور عرابی پاشا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ۲۱/اگست کو انگریزی فوج اسماعیلیہ میں اتار دی، اسماعیلیہ پر قابض ہوجانے کے بعد قاہرہ

کا راستہ کھلا ہوا تھا، ادھر تل کبیر کی نامکمل خندقیں حائل تھیں، انگریزی فوج کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی، اس کے مقابلہ میں کفر دوار کی مصری فوج آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور پورے مصر میں باقاعدہ فوج کا شمار تیرہ ہزار سے زیادہ نہ تھا، عین وقت پر جو سپاہی بھرتی کیے گئے تھے وہ بالکل ناتجربہ کار تھے اور صرف خندق وغیرہ کھودنے کے کام آسکتے تھے۔(۱)

پروفیسر پامر کی خفیہ مہم: لیکن حکومتِ برطانیہ نے محض فوجی دستوں پر قناعت نہیں کی اس نے اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے پہلے ہی وہ خفیہ ذرائع اختیار کر لیے تھے، جو بقول مسٹر بلنٹ زمانۂ حال کی جنگوں میں ہمیشہ استعمال کیے جاتے ہیں لیکن کبھی ان کا اعتراف نہیں کیا جاتا، نہر سویز کی راہ سے مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ برطانوی وزارتِ جنگ و بحریہ نے شروع سال ہی میں کر لیا تھا اور وسط جون میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ رشوت کے ذریعہ سے عرب قبائل خصوصاً مشرقی بدویوں کو ہموار کر لیا جائے، لیکن دقت یہ تھی کہ اس وقت بمشکل کوئی انگریز ایسا مل سکتا تھا جو عربی زبان بول سکتا ہو، اس مشکل میں لارڈ نارتھ بروک (North Brook) وزیر بحریہ کی نظر ایڈورڈ پامر (Edward Palmar) پر پڑی جو کیمبرج یونی ورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر تھے، پروفیسر مذکور ایک زمانہ میں فلسطین کی مجلس تحقیق ارضی (Palistin Exploration Society) کے رکن بھی رہ چکے تھے اور اس وجہ سے نہر سویز کے مشرقی علاقوں سے جہاں کے عرب قبائل پر رشوت کا عمل کیا جانے والا تھا کچھ واقف تھے، چنانچہ ۲۴ رجون کو لارڈ نارتھ بروک نے پامر کو اپنے ہاں ناشتہ پر مدعو کیا اور ان کے سپرد یہ خدمت کی کہ فوراً سویز کے مشرقی علاقوں میں جا کر بدوی قبائل کو انگریزی فوج کا حامی بنانے کی کوشش کریں، پانچ سو پونڈ تو ابتدائی اخراجات کے لیے نارتھ بروک نے اسی وقت دیئے اور آیندہ کے لیے وعدہ کیا کہ بشرط کامیابی ایک بہت بڑی رقم انعام کے طور پر دی جائے گی، روانگی سے قبل ۲۶ رجون کو پامر صاحب مسٹر بلنٹ سے ملے اور ان سے یہ بیان کیا کہ میں اخبار اسٹینڈرڈ (Standard) کا نامہ نگار بن کر اسکندریہ جا رہا ہوں اور مجھے وطنی تحریک کے ساتھ بڑی

(۱) بلنٹ ص ۳۰۴

ہمدردی ہے اور میں اس اخبار میں اس تحریک کی حمایت میں مضامین لکھتا رہوں گا، پھر مسٹر بلنٹ سے خواہش کی کہ اپنے نیشنلسٹ مصری دوستوں کے نام تعارف کے خطوط دے دیجیے، پامر نے اپنے اصلی مشن کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا، بہر حال مسٹر بلنٹ نے مصر کے چند ممتاز آدمیوں کے نام تعارف کے خطوط لکھ کر ان کے حوالہ کر دیے۔

پروفیسر پامر پہلے اسکندریہ پہنچے اور وہاں سیمور سے مل کر یافہ کے لیے روانہ ہو گئے، یافہ میں وہ برطانوی قنصل کے ہاں مقیم ہوئے، وہاں عربی پوشاک زیب تن کر کے بظاہر پورے عرب بنے ہوئے قبائل تیاحہ وطرابین کے شیوخ پر ڈورے ڈالنے کے لیے روانہ ہوئے، پامر کے روز نامچہ کے بعض حصے شائع ہو گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے مشن میں بہت کچھ کامیابی ہوئی، قبیلہ تیاحہ کے شیخ نے جو ان علاقوں میں سب سے زیادہ اہم اور طاقتور قبیلہ تھا، انگریزوں کی حمایت کا وعدہ کیا، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ بیس ہزار پونڈ صرف کرنے سے چالیس ہزار عرب ہاتھ آ جائیں گے، یہ روز نامچہ نہایت دلچسپ ہے اور ان خفیہ ذرائع پر کافی روشنی ڈالتا ہے جو حکومت برطانیہ نے مصر کی قومی تحریک کو فنا کرنے کے لیے استعمال کیے تھے، اس کے بعض حصے جو مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں کیمبرج یونی ورسٹی کے فاضل پروفیسر کی سیرت کو بھی واضح اور نمایاں کرتے ہیں، پروفیسر موصوف دولت وشہرت کے خواب میں مدہوش ہیں، اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں کہ ''میرے اختیارات کی انتہا نہیں، جو چاہوں سو کروں، اگر میں ایک درجن گھوڑے بھی دیکھوں تو انھیں فوراً خرید سکتا ہوں، کل میں نے تیس اونٹ دیکھے اور تین سو ساٹھ پونڈ میں اسی وقت خرید لیے، میرے ماتحت ملازمین ہیں، کلرک ہیں، ترجمان ہیں اور یہ سب میرے اشاروں پر چلتے ہیں، مختصر یہ کہ میں اس سے زیادہ بلند مرتبہ تک پہنچ نہیں سکتا تھا، امیر البحر بہت عمدہ آدمی ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اپنے افسروں کو کبھی نہیں بھولتا اور انہیں برابر ترقی دیتا رہتا ہے، اس نے مجھ سے کہا ہے کہ مجھے ''ستارۂ ہند'' ضرور ملے گا۔'' (۱)

---

(۱) بلنٹ ص ۳۰۸

لیکن پامر کی یہ تمام امیدیں ایک خوابِ پریشاں ثابت ہوئیں، ۷؍اگست کو وہ دو انگریز افسروں گل (Gill) اور کیرنگٹن (Charrington) کے ساتھ سویز سے روانہ ہوا، ان افسروں کا مقصد یہ تھا کہ مصر اور شام کے درمیان تار کا سلسلہ منقطع کر دیں، اس کے لیے انھوں نے ڈائنامائٹ کا ایک بکس اپنے ساتھ لے لیا تھا، پامر نے اپنے سفر کا مقصد اونٹوں کی خریداری ظاہر کیا تھا، تینوں عربی لباس میں تھے، ابھی چند ہی میل سفر طے کیا ہوگا کہ قبیلہ حیوتیہ اور حونیہ کے بدوؤں کو معلوم ہوا کہ یہ عرب نما مسافر اپنے ساتھ قبیلہ تیاحہ کے لیے ایک بڑی رقم لیے جا رہے ہیں، ان بدوؤں نے حملہ کر کے ان کو گرفتار کر لیا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا، جس میں وہ رقم بھی تھی جو پامر حسب وعدہ قبیلہ تیاحہ کے لیے لے جا رہا تھا اور آخر میں تینوں کو گولی مار دی، اس رقم کے متعلق تین ہزار پونڈ سے لے کر آٹھ ہزار پونڈ تک مختلف بیانات ہیں، قبیلہ مذکور میں تقسیم کرنے کے لیے پامر کو بیس ہزار پونڈ منظور ہوئے تھے اور وہ پوری رقم اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، لیکن امیر البحر نے مخالفت کی جس کی وجہ سے اس رقم کا بڑا حصہ بدوؤں کے ہاتھ آنے سے بچ گیا، اس حادثہ کی خبر جب انگلستان پہنچی تو پارلیمنٹ میں اس کے متعلق حکومت سے سوالات کیے گئے، حکومت نے پوری سنجیدگی اور اپنی روایتی صداقت کے ساتھ اعلان کیا کہ پامر کے سفر کا مقصد اونٹوں کی خریداری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

پامر کے روز نامچہ کی تصدیق گل کی ڈائری سے بھی ہوتی ہے، رشوت کے ذریعہ سے بدوی قبائل کو حامی بنانے کی جو خدمت نہر سویز کے مشرقی علاقوں میں پامر کو سپرد ہوئی تھی وہی نہر کے مغربی علاقوں میں کیپٹن گل سے متعلق تھی، وہ اپنی ڈائری میں اس کے متعلق واضح طور پر بیان کرتا ہے، ان تحریری شہادتوں کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ تل کبیر کی جنگ سے پیشتر حکومت برطانیہ نے رشوت کے زہر سے مصریوں کی قوت کو بہت کچھ فنا کر دیا تھا۔(۱)

---

(۱) بلنٹ ص ۳۱۰-۳۰۹

خدیو کی غداری: اس باب میں پامر اور گل سے زیادہ خود توفیق نے انگریزوں کو مدد پہنچائی، بدوی قبائل کا ایک ممتاز شیخ سعود الطحاوی عرابی پاشا کا معتمد علیہ تھا، سب سے زیادہ اسی نے غداری کا ثبوت دیا، توفیق نے اسے پانچ ہزار کراؤن (۱) کے عوض عرابی پاشا کے لشکر میں بحیثیت ایک جاسوس کے مقرر کر رکھا تھا، اس کا اعتراف سعود الطحاوی نے خود مسٹر بلنٹ سے ۱۸۸۷ء میں کیا (۲) توفیق نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ رشوت کے ذریعہ اور ترقی کی امیدیں دلا کر عرابی پاشا کے بہت سے فوجی افسروں کو غداری پر آمادہ کر لیا، عرابی پاشا کی قوت کو سب سے زیادہ اسی چیز نے نقصان پہنچایا، توفیق کے جاسوس جن کا صدر خود اس کا ایڈی کانگ عثمان بے رفعت تھا، افسروں میں بددلی پھیلانے کی کوشش کرتے اور ان کی باہمی رقابتوں کو برانگیختہ کرتے، وہ ان افسروں خصوصاً چرکسی نسل والوں سے کہتے کہ خدیو سے مقابلہ زیادہ دنوں تک نہیں کیا جا سکتا، بہتر یہ ہے کہ شکست سے پہلے ہی باز آجاؤ اور اس کی خوشنودی حاصل کر کے انعام و اکرام کے مستحق بن جاؤ، ورنہ جب وقت گذر جائے گا اور میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے گرفتار کیے جاؤ گے تو اس سزا سے مفر نہ ہوگا جو باغیوں کے لیے مقرر ہو چکی ہے، وہ یہ بھی سمجھاتے کہ اولزلے اور اس کے انگریز سپاہی حقیقتاً خدیو کے ملازم ہیں جو ملک کی موجودہ بغاوت فرو کرنے کے لیے بلائے گئے ہیں، علاوہ بریں خود سلطان بھی جس نے عرابی پاشا کو باغی قرار دے دیا ہے، عنقریب خدیو کی مدد کے لیے فوج روانہ کرنے والا ہے، یہ دلائل چرکس افسروں پر کارگر ثابت ہوئے، دوسروں کے سامنے دلیلوں کے علاوہ نقد بھی پیش کیا گیا، بعض افسر جو فوجی قابلیت میں عرابی پاشا سے بڑھے ہوئے تھے پہلے ہی سے بددل تھے کیوں کہ عرابی پاشا نے ان کے مشورہ کے خلاف نہر سویز کی ناکہ بندی نہ ہونے دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی فوج اسماعیلیہ میں اتر آئی تھی اور اب اس کو آگے بڑھنے سے روکنا نہایت دشوار تھا۔

---

(۱) ایضاً ۳۱۲ (۲) کراؤن ایک انگریزی سکہ = پانچ شلنگ

وطنی جماعت کے غیر فوجی سرداروں کو قومی تحریک سے برگشتہ کرنے کے لیے توفیق نے سلطان پاشا کو مقرر کیا تھا جو پہلے اس تحریک کا ایک نہایت ممتاز لیڈر رہ چکا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے تمامتر انگریزوں کا حامی اور حلیف تھا، اس کے اثر سے قاہرہ کے بہت سے سر برآوردہ اشخاص خدیو کے حامی ہو گئے۔

وطنی فوج کی بدقسمتی: ان کمزوریوں کے باوجود عرابی پاشا کی فوج انگریزوں کا مقابلہ زیادہ دنوں تک کر سکتی تھی، اگر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اسے بعض ناقابل تلافی نقصانات نہ پہنچ گئے ہوتے، جس وقت یہ معلوم ہو گیا کہ حملہ مشرق کی طرف سے ہوگا محمود فہمی جو عرابی پاشا کے سب سے زیادہ لایق افسر اور ایک نہایت ہوشیار انجینئر تھے فوراً تل الکبیر روانہ کیے گئے تاکہ وہاں کی خندقوں کو مکمل کرا دیں لیکن تل الکبیر پہنچنے سے قبل ہی راستہ میں ایک انگریزی دستہ نے ان کو گرفتار کر لیا، یہ واقعہ ایک عجیب وغریب اتفاق سے پیش آیا، اثنائے راہ میں محمود فہمی ایک گاؤں میں اتر گئے تھے، قریب ہی ایک ٹیلہ تھا، تفریح کے لیے یا بلندی سے گرد وپیش کے مقامات کا معاینہ کرنے کے لیے اس ٹیلہ پر چلے گئے، اتفاق سے بالکل تنہا تھے اور سادہ لباس پہنے ہوئے تھے اسی وقت ایک انگریزی دستہ بھی ادھر سے گذر رہا تھا اس نے ان کو گرفتار کر لیا لیکن چونکہ یہ فوجی وردی میں نہ تھے اس لیے کرنل ٹالبٹ (Col. Talbot) جو اس دستہ کا افسر تھا ان کے رتبہ کے متعلق کوئی رائے قایم نہ کر سکا اور اپنے ساتھ انھیں انگریزی فوج کے مرکز پر لیتا گیا، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ قیدی کتنا قیمتی ہے، محمود فہمی کی گرفتاری سے تل الکبیر کی مدافعت کو اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ اس کی تلافی نہ ہو سکی۔

معرکہ قصاصین: تل الکبیر سے پہلے ہی قصاصین کے مقام پر عرابی پاشا کی فوج کے ایک دستہ سے جو آگے بڑھ کر دشمن کی نقل وحرکت معلوم کرنا چاہتا تھا ولزلے کی فوج کا مقابلہ ہو گیا، انگریزوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کا یہ بہترین اور آخری موقع تھا اور قریب تھا کہ اس میں مصری دستہ کامیاب ہو جائے، وہ اچانک انگریزی دستہ پر ٹوٹ پڑا

تھا، لڑائی دیر تک ہوتی رہی اور رن ایسے گھمسان کا تھا کہ ڈیوک آف کناٹ (Duke of Connaught) جو اس معرکہ میں شریک تھا ایک بار گرفتار ہوتے ہوتے رہ گیا، اگر یہ شہزادہ گرفتار ہوگیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ جنگ کا سارا نقشہ ہی بدل جاتا اور وطنی تحریک کامیاب ہو جاتی کیونکہ بقول مسٹر بلنٹ انگلستان کی رائے عامہ میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور ان کسانوں کے خلاف جنگ کرنے سے جو اپنے ملک کو قدیم مظالم سے آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اہل برطانیہ کو شرم محسوس ہونے لگی تھی لیکن اس معرکہ میں دو مصری جنرل علی فہمی اور راشد پاشا بہت بری طرح زخمی ہو گئے اور پھر کوئی تجربہ کار افسر ان کا قائم مقام نہ ہو سکا، علاوہ بریں مصری فوج کے ایک دوسرے جنرل علی بے یوسف نے عین وقت پر دشمن سے مل کر شکست کو یقینی بنا دیا۔

تل الکبیر: قصاصین کی ہزیمت کے بعد تل الکبیر کی مدافعت بہت کمزور ہو گئی، عرابی پاشا کے بہترین جنرل گرفتار یا زخمی ہو چکے تھے، جو باقی رہ گئے تھے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، توفیق کے جاسوسوں نے فوج میں ہر طرف رخنے پیدا کر دیے تھے، بدقسمتی سے عرابی پاشا کو اب بھی سعود التہاوی پر پورا اعتماد تھا اور اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ اولزلے آگے نہیں بڑھ رہا ہے، تل الکبیر میں جو فوج تھی وہ حد درجہ ناقص اور بے میل تھی، باقاعدہ پیدل فوج کی تعداد چھ سات ہزار سے زیادہ نہ تھی، سوار فوج دو ہزار تھی اور اتنے ہی توپچی تھے، بقیہ رنگروٹوں کی ایک بھیڑ تھی جن کے پاس اتنا لباس بھی نہ تھا کہ اپنا پورا جسم چھپا سکتے، یہ غریب سیدھے سادے فلاحین تھے جو اپنی خوشی سے آ کر قومی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور خندق وغیرہ کے کھودنے میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے، لیکن لڑائی کے کام کے بالکل نہ تھے ان کی مجموعی تعداد بیس ہزار رہی ہوگی۔

دفعۃً ۱۳ رستمبر کو علی الصباح انگریزی فوج نے حملہ کر دیا، خود عرابی پاشا کے دو افسروں نے حملہ آوروں کی رہنمائی کی، یہ دونوں چند روز قبل خدیو کے آدمیوں سے رشوت قبول کر چکے تھے، ان میں سے ایک عبدالرحمٰن بے حسن تھا جو خندقوں کے باہر

مشرق سے آنے والی ریگستانی سڑک پر اپنے دستہ کے ساتھ تعینات کیا گیا تھا لیکن عین اس رات میں جس کی صبح کو انگریزی فوج حملہ آور ہوئی یہ اپنے آدمیوں کو متعینہ مقام سے ہٹا کر بائیں جانب کافی فاصلہ پر لیتا گیا تاکہ انگریزوں کے لیے راستہ کھلا رہے، دوسرا علی بے یوسف تھا جس کا نام اوپر آچکا ہے، یہ خندقوں کے ایک ایسے حصہ پر تعینات تھا جو نسبتاً بہت کمزور تھا، اس نے نہ صرف یہ کیا کہ اس رات کو اپنا پہرہ وہاں سے ہٹالیا بلکہ اشارہ کے لیے لالٹین بھی گل کر دی، اس غداری کے صلہ میں اس کو ایک ہزار پونڈ جنگ سے قبل دے دئے گئے تھے اور دس ہزار کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن تل الکبیر کے بعد جب حکومت پھر خدیو کے ہاتھ میں آئی تو بجائے اس معہودہ رقم کے اس کے لیے صرف بارہ پونڈ ماہوار کی پنشن مقرر کر دی گئی جو اس کے انتقال تک اسے ملتی رہی۔(۱)

سعود الطہاوی نے عرابی پاشا کو کم از کم اس رات کے متعلق پورا اطمینان دلا رکھا تھا کہ انگریز حملہ آور نہ ہوں گے، اس بھروسہ پر خود عرابی پاشا اور فوج کے سپاہی غافل سو رہے تھے، اچانک انگریزی فوج خندق کے اسی حصہ سے جس کو علی بے یوسف نے خالی کر دیا تھا ان کے سروں پر آ پہنچی، پہلے رنگروٹوں ہی سے مقابلہ ہوا جو دن بھر خندقوں میں کام کرنے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گئے تھے اور اب میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے، یہ غریب آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے اور ابھی ہتھیار بھی نہ سنبھال سکے تھے کہ دشمن نے ان کا قتلِ عام شروع کر دیا، اتنے میں باقاعدہ فوجیں تیار ہو گئیں اور مقابلہ میں کچھ گرمی پیدا ہوئی، لیکن حملہ اس قدر اچانک تھا اور غنیم کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ مصری زیادہ دیر تک میدان میں ٹھہر نہ سکے، جس مقام پر لڑائی ہو رہی تھی عرابی پاشا کا خیمہ وہاں سے کسی قدر دور تھا، جب توپوں کی آواز سے ان کی آنکھ کھلی اور فوراً مسلح ہو کر وہ گھوڑے پر تیزی سے ادھر بڑھے تو دیکھا کہ شکست خوردہ سپاہیوں کی ایک ٹولی بھاگی ہوئی آرہی ہے، ان لوگوں نے بیان کیا کہ لڑائی حقیقتاً ختم ہو گئی اور اب مقابلہ بے سود ہے، سعود الطہاوی کے

(۱) بلنٹ ص ۳۱۸

بدوی سپاہی اپنے گھوڑے ادھر ادھر دوڑا رہے تھے، جس سے اور زیادہ خلفشار پیدا تھا، عرابی پاشا نے سپاہیوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر سراسیمہ تھے کہ کسی طرح قابو میں نہ آئے، مجبوراً عرابی پاشا کو بھی میدان چھوڑنا پڑا، ایک گھنٹہ کے اندر جنگ کا خاتمہ ہوگیا، وطنی تحریک کا لاشہ تل الکبیر کے صحرا میں دفن کردیا گیا۔

عرابی پاشا قاہرہ پہنچے لیکن توفیق کی سازشیں وہاں بھی اپنا کام کرچکی تھیں، سلطان کی طرف سے عرابی پاشا کے باغی قرار دیے جانے سے صورتِ حال اور بدتر ہوگئی تھی، یہ دیکھ کر کہ مدافعت اب بے سود ہے عرابی پاشا نے عباسیہ جاکر بحیثیت ایک فوجی قیدی کے اپنی تلوار انگریزی جنرل کے حوالہ کردی، جو لاشہ تل الکبیر میں دفن کیا گیا تھا یہ اس کی تربت کا آخری پھول تھا۔

مصر پر انگریزوں کا قبضہ: توفیق برٹش سنگینوں کے سایہ میں اسکندریہ سے قاہرہ آیا اور برطانیہ کی سرپرستی میں عنانِ حکومت ہاتھ میں لی، شریف پاشا نے وزارت قایم کی، نئے دور کا افتتاح یوں ہوا کہ وطنی تحریک کے علمبردار باغیوں کی حیثیت سے عدالت میں لائے گئے، عرابی پاشا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی لیکن مسٹر بلنٹ نے ایک کثیر رقم اپنی جیب خاص سے خرچ کرکے اس مقدمہ کی پیروی جس انگریز بیرسٹر کے سپرد کی تھی اس نے صفائی میں ایسی شہادتیں پیش کیں کہ خدیو کو موت کی سزا منسوخ کردینی پڑی، تاہم عرابی پاشا تمام عمر کے لیے جلاوطن کرکے سیلون بھیج دیے گئے۔

انگریزوں نے جس آسانی کے ساتھ مصر پر قبضہ پالیا تھا، اس کے لحاظ سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ملک کی حکومت توفیق کے حوالہ کرکے خود واپس چلے جائیں گے، تل الکبیر کے بعد ہی انھوں نے مصر پر اپنا تسلط قایم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب وہ مالیاتی امور کے انتظام میں بھی فرانس کو شریک کرنے پر تیار نہ تھے، توفیق ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کررہا تھا اس نے ایک انگریز کالوین (Colvin) کو اپنی حکومت کا تنہا مشیر مال مقرر کیا، لارڈ ڈفرن جو اس وقت قسطنطنیہ میں برطانوی سفیر تھا،

بحیثیت ہائی کمشنر کے مصر آیا اور حکومت کے آیندہ انتظام کا خاکہ مرتب کر گیا، اس خاکہ کی تفصیلی خانہ پری سر ایولین بیرنگ (Sir Evelyn Baring) کے سپرد ہوئی جس نے جنوری ۱۸۸۴ء میں بحیثیت قنصل جنرل کے چارج لیا، یہی شخص ہے جو بعد میں لارڈ کرومر (Croumer) کے نام سے مشہور ہوا، اسی کے آنے کے بعد مصر گویا سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، ملک کے ہر معاملہ میں برٹش قنصل جنرل کی رائے فیصلہ کن تھی، مصری فوجیں انگریزی افسروں کے زیر کمان کر دی گئیں، انگریزی فوجیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی، پورے ملک پر اپنا تسلط قایم کر چکی تھیں، برطانیہ نے اعلان کیا کہ مصر کی مالی حالت کے درست ہو جانے کے بعد انگریزی فوجیں واپس بلالی جائیں گی، لیکن مالی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی اور حکومت برطانیہ کی فرض شناسی نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ غریب مصریوں کو اپنے سایہ عاطفت سے محروم کر دے۔

جرمنی کا فوجی اور اقتصادی اثر: دولت عثمانیہ کے انحطاط سے جس سلطنت نے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا تھا وہ جرمنی کی سلطنت تھی، ۱۸۷۱ء تک تو جرمنی میں اتنی طاقت نہیں آئی تھی کہ وہ کسی دوسری مملکت پر دست درازی کا حوصلہ کر سکے، لیکن اتحاد کے بعد جب فرانس سے جنگ کی نوبت آئی اور اس میں اسے شاندار فتح نصیب ہوئی تو پھر توسیعِ سلطنت کا حوصلہ بھی پیدا ہوا اور اسی ملک کی طرف نگاہ اٹھی جسے یورپ کی دوسری حکومتیں بہت پہلے سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں، لیکن دقت یہ تھی کہ ان حکومتوں نے جرمنی کے لیے کوئی ایسا میدان نہیں چھوڑا تھا کہ اس پر فوجی تسلط قایم کیا جا سکے، تونس پر فرانس کا قبضہ تھا، مصر برطانیہ کے زیر نگیں آ چکا تھا اور طرابلس پر اٹلی کا حق یورپ کے سیاسی حلقوں میں تسلیم کیا جا چکا تھا، اگرچہ ابھی تک وہ باب عالی کی فرماں روائی سے خارج نہیں ہوا تھا اور عرب قبائل دولت عثمانیہ کے نمایندوں کی حیثیت سے اس پر حکمراں تھے، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے جو برلن کانگریس میں عارضی طور پر آسٹریا کی نگرانی میں دے دئے گئے تھے، آسٹریا انھیں مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا تھا،

سب سے بڑھ کر روس کی ریشہ دوانیاں تھیں جن کا سلسلہ ایک صدی سے بلقان میں جاری تھا اور جن کا اصلی مقصد آبنائے باسفورس اور دردانیال پر قبضہ کر لینا تھا۔

ان حالات میں جرمنی کے لیے ایشیائے کوچک کے علاوہ کوئی دوسرا میدان باقی نہ رہ گیا تھا، خوش قسمتی سے جرمنی کو باب عالی میں اپنا اثر قایم کرنے کے لیے ایک اچھا موقع بھی ہاتھ آ گیا، روس اپنے بلقانی شاگردوں کی ناشکر گذاری سے دل برداشتہ ہو کر مشرق بعید کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور وہاں جاپان سے قوت آزمائی میں مصروف تھا، برطانیہ مصر میں غیر متوقع کامیابی حاصل کرنے کے بعد جس نے بحر روم میں اس کے اقتدار کو حد درجہ غالب کر دیا تھا، دولت عثمانیہ کی دوستی سے بے پروا ہو گیا تھا اور جو باہمی تعلقات انیسویں صدی کے دوران میں استوار ہوئے تھے ان میں بہت کچھ کمزوری پیدا ہو گئی تھی، جرمنی نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا، باب عالی کی دعوت پر ایک جرمن فوجی مشن جنرل فان ڈر گولٹز (Vonder Golty) کی سرکردگی میں عثمانی فوجوں کی تنظیم و اصلاح کے لیے قسطنطنیہ پہنچا، ساتھ ہی ساتھ جرمن تاجر کثیر تعداد میں آ گئے اور پھر جرمن بنکوں نے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں کھول دیں، ۱۸۹۰ء میں قیصر ولیم ثانی جس نے حال ہی میں عنانِ سلطنت ہاتھ میں لی تھی، ایک دوست کی حیثیت سے سلطان عبدالحمید خاں سے ملنے قسطنطنیہ آیا، قیصر کی آمد کے بعد سلطان نے جرمن تاجروں کے ساتھ مزید مراعات کرنی شروع کیں، یہ ترکی جرمن اتحاد کا پہلا قدم تھا۔

بغداد ریلوے: قیصر کے سفر قسطنطنیہ کے بعد سلطنت عثمانیہ میں جرمنی کی سرگرمیاں ہر طرف پھیلنے لگیں لیکن سب سے زیادہ توجہ ایشیائے کوچک میں ریلوے لائن کی تعمیر پر تھی جدید ذرائع حمل ونقل کی عدم موجودگی کے باعث ایشیائے کوچک کے وسیع اور زرخیز صوبہ میں سفر اور تجارت کی دشواریاں بہت زیادہ تھیں، یہ صحیح ہے کہ اس سے قبل ایک انگریز کمپنی کو سمرنا کے قریب ایک چھوٹی سی ریلوے لاین قایم کرنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن قسطنطنیہ سے ایشیائے کوچک میں جانے کے لیے کوئی لاین نہ تھی، اب ایک جرمن کمپنی

نے ایک ریلوے لائن حیدر پاشا سے جو استنبول کے مقابل واقع ہے، انگورہ تک تعمیر کی اور ۱۸۹۶ء میں اسے جنوب مشرق کی طرف بڑھا کر سلجوقیوں کے قدیم پایہ تخت قونیہ تک پہنچا دیا، ان لائینوں کی تعمیر سے سفر اور تجارت کے لیے بڑی سہولت پیدا ہو گئی اور سلطان نے ان کو ایشیائے کوچک سے بڑھ کر مسوپوٹامیا میں بھی جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی، جرمن سرمایہ دار جن کو سلطان کی سرپرستی حاصل تھی، اس کے لیے پہلے سے تیار تھے اور ٹھیکہ انہی کو دیا گیا، ۱۸۹۸ء میں قیصر ولیم دوبارہ قسطنطنیہ آیا جو تعلقات اس کی پہلی آمد سے قایم ہو گئے تھے وہ اور زیادہ مضبوط ہو گئے اور بغداد تک ریلوے لائن بنانے کی پہلی شاہی سند ایک جرمن کمپنی کو ۱۸۹۹ء میں عطا کی گئی، اس سند میں کئی بار ترمیمیں ہوئیں اور بالآخر ۱۹۰۳ء میں یہ آخری طور پر مکمل کر دی گئی اور تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا، ریلوے لائن قونیہ سے جنوب مشرق کی طرف تیزی کے ساتھ بنتی گئی، یہاں تک کہ جبل طور تک پہنچنے کے بعد پہاڑ کاٹنے کی وجہ سے کام کی رفتار سست ہو گئی اور بعض دشواریوں کے رفع کرنے میں اتنی دیر ہوئی کہ آخری سرنگ جنگ عظیم کے شروع ہونے تک مکمل نہ ہو سکی۔

بغداد ریلوے کی اہمیت: فرانس اور انگلستان کے پریس اور پارلیمنٹ میں بغداد ریلوے کی تعمیر سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اس کا سبب یہ تھا کہ جرمن ریلوے اسکیم کا مقصد محض ایشیائے کوچک میں اقتصادی تسلط قایم کرنا نہ تھا بلکہ اس کے پیشِ نظر مسوپوٹامیا اور خلیجِ فارس کی اقتصادی تسخیر بھی تھی، بغداد ریلوے کی تعمیر کے بعد وہ شاہراہ پھر کھل جاتی تھی جو تہذیب وتمدن کی ابتدا سے یورپ اور ایشیا کے درمیان قایم تھی، لیکن کچھ مدت سے بند ہو گئی تھی، ''بغداد ریلوے'' کے جاری ہو جانے سے جرمن تجار نہ صرف مشرق ادنیٰ کے بازاروں پر قابض ہو جاتے بلکہ جنوبی اور مشرقی ایشیا تک بھی پہنچ سکتے تھے، ''بغداد ریلوے'' اسکیم نے انگریز تاجروں کی نظر میں نہر سویز کے راستہ کی اہمیت بھی کم کر دی کیوں کہ اس راستہ کے ذریعہ بہ نسبت نہر سویز کے راستہ کے جرمنی کے مسافر اور وہاں کی تجارتی اشیا بہت کم وقت میں خلیج فارس تک پہنچ سکتی تھیں، برطانیہ کے لیے اس سے بھی زیادہ تشویشناک

یہ چیز تھی کہ ممکن ہے آیندہ کسی زمانہ میں حکومت جرمنی ''جرمن ریلوے کمپنی'' کے اختیارات پر قابض ہو جائے تو اس وقت یہ اقتصادی چیز ایک سیاسی حربہ بن جائے گی، جس سے نہ صرف ہندوستان کا بازار بلکہ خود ہندوستان خطرہ میں پڑ جائے گا۔

اتحاد ثلاثہ: ''بغداد ریلوے'' کی تعمیر سے جو نزاع جرمنی اور فرانس وانگلستان کے درمیان پیدا ہوگئی تھی، روس مشرقِ اقصیٰ کی مصروفیتوں کی وجہ سے ابتداءً اس سے علاحدہ تھا لیکن جب ۱۹۰۵ء میں اس نے جاپان کے مقابلہ میں شکست کھائی تو مجبوراً بلقان کی طرف پھر توجہ کرنی پڑی، اس درمیان میں یہاں کا نقشہ بدل چکا تھا؛ زار کو یہ دیکھ کر بہت اندیشہ ہوا کہ جرمنی کا اثر قسطنطنیہ میں روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اسے یہ خطرہ ہونے لگا کہ ممکن ہے آیندہ روسی جہازوں کے لیے درۂ دانیال کی گذرگاہ بند کر دی جائے، چوں کہ اس وقت پیرس اور لندن کی حکومتیں جرمنی کی مخالف تھیں اس لیے قدرۃً روس انہی کی جانب مائل ہوا اور مختلف عہد ناموں کی بنا پر جو ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک مرتب ہوئے، تینوں حکومتوں کے درمیان ایک اتحاد قایم ہوگیا جس کی بنیاد حقیقتاً یہ قرار پائی کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی سلطنتوں کے ٹکڑے کر کے ان پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جو معاہدہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوا اس میں فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے مراکش پر قبضہ کر لے، اس کے معاوضہ میں فرانس ان تمام حقوق سے دست بردار ہوگیا جو بزعمِ خود اسے حکومت مصر کی نگرانی میں حاصل تھے اور مصر کی فرماں روائی تمامتر انگلستان کے سپرد کر دی، اس کے بعد فرانس کی وساطت سے انگلستان اور روس کا جھگڑا جو مدت سے ایران کی نسبت چلا آتا تھا، ۱۹۰۷ء میں یوں ختم ہوا کہ ایران کی سلطنت معاہدہ کے رو سے دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی، جن میں سے ایک پر روس نے اور دوسرے پر انگلستان نے اپنا تسلط قایم کر لیا۔(۱)

اندرونی اور بیرونی سازشیں: یوروپین حکومتوں کی سرگرمیاں یہیں تک محدود نہ تھیں۔

(۱) شیویل ص ۴۵۰

انھوں نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبوں پر قبضہ کرلیا بلکہ جو صوبے اس کی فرماں روائی میں باقی رہ گئے تھے، ان کے اندر بھی ہر امکانی ذریعہ سے بدامنی اور بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، ستم یہ تھا کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی شورشوں کو عذر قرار دے کر یہ حکومتیں عیسائی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی خاطر دولت علیہ کے اندرونی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرتیں اور جہاں تک بس میں ہوتا سلطنت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں، بلقانی صوبوں کی بغاوت اور آزادی انہی حکومتوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کی رہینِ منت تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان عبدالحمید کے استبداد نے سلطنت کے ہر طبقہ میں بیزاری پیدا کردی تھی، خصوصاً دستوری حکومت کا اعلان کرنے کے بعد پارلیمنٹ کو برخاست اور دستور کو عملاً منسوخ کرنے سے تمام رعایا برہم تھی، لیکن یوروپین حکومتوں اور بالخصوص روس اور آسٹریا نے اس عام برگشتگی کو خوب بھڑکایا، اگر ایک طرف ان کی فوجیں سلطنت عثمانیہ کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتی رہیں تو دوسری طرف ان کے گماشتے عیسائی رعایا کو مسلسل بغاوت کے لیے آمادہ کرتے رہے، مسٹر نائٹ جو تیس سال تک ترکی میں رہ کر وہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کرچکے ہیں اپنی کتاب بیداری ترکی (Awakening of Turkey) میں لکھتے ہیں:

> ''ایک مقولہ ہے کہ ہر قوم کو وہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے، یہ مقولہ صحیح ہوسکتا ہے اگر کوئی قوم اپنے حسب خواہش نظامِ حکومت قایم کرنے کی آزادی رکھتی ہو لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے، اس کے باشندوں کو کوئی موقع اس حکومت کے حاصل کرنے کا نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے کیوں کہ ترکی کے طاقت ور دشمنوں کی غرض یہ تھی کہ استبدادی حکومت کی برائیاں قایم رکھی جائیں اور جب کبھی ترکوں نے اپنے اندرونی معاملات کو درست کرنے کی کوشش

کی، کوئی نہ کوئی مسیحی طاقت اس خوف سے کہ ممکن ہے ایک اصلاح شدہ ترکی ایک قومی ترکی ثابت ہو یا تو مسلح فوجوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑی یا مجوزہ اصلاحی تبدیلیوں کی راہ روک کر کھڑی ہوگئی، علاوہ بریں جو طاقتیں ترکی مقبوضات کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے درپے تھیں وہ اس بات کی نگرانی کرتی رہتی تھیں کہ ترکی کے حدود میں امن نہ رہنے پائے اور وہ اس غرض سے شورشیں برپا کرتی رہتی تھیں، وہ عیسائی کسانوں کو بغاوت کے لیے ابھارتیں اور ہنگامے برپا کراتیں تاکہ مداخلت کرنے اور ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا حیلہ ہاتھ آئے، یہ طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی طریقہ کے اختیار کرنے میں تامل نہ کرتیں مثلاً بہتیرے فساد پھیلانے والوں (Agents Provocaters) میں سے ایک درویش بھی تھا جو روس کا تنخواہ دار مخفی ایجنٹ تھا، چند سال ہوئے اس نے روس کی ہدایت کے مطابق ایشیائے کوچک میں کافروں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو عیسائی باشندوں پر حملہ کرنے کے لیے برانگیختہ کیا، اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے دشمنان ترکی کی دغابازی اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اس کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے۔''(۱)

مقدونیا کی بدامنی: ان شرانگیزیوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب سرزمین مقدونیا کی تھی، مقدونیا سلطنت عثمانیہ کا وہ صوبہ تھا جس میں بلغاری، سروی، یونانی اور ترک سب ہی آباد تھے، چوں کہ بلغاریا، سرویا اور یونان کی آزاد ریاستیں بالکل سرحد پر واقع تھیں اس لیے ان میں سے ہر ایک مقدونیا کے اس حصہ کو جہاں اس کی ہم قوم آبادی

(۱) ''بیداری ترکی'' از نائٹ ص ۲-۳

زیادہ تھی اپنے اندر شامل کر لینا چاہتی تھی، دولِ عظمیٰ کی طرح ان ریاستوں کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ عنقریب فنا ہو جائے گی اور چوں کہ اس کے ترکہ کی تقسیم کے وقت مقدونیا کی سب سے زیادہ حقدار یہی تین ریاستیں تھیں، اس لیے ہر ایک اپنا حصہ پہلے ہی سے محفوظ کر لینا چاہتی تھی، پروپگنڈا اور ہنگامہ پروری کا نہایت کامیاب تجربہ اس سے قبل ہو چکا تھا، جس کی بنا پر پورا اطمینان تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں اپنے چھوٹے بچوں کی حوصلہ افزائی میں مطلق دریغ نہ کریں گی، چنانچہ بلغاریا، سرویا اور یونان نے اپنی ہم قوم آبادی کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے مقدونیا میں پہلے خفیہ ایجنٹ بھیجنا شروع کیے اور پھر یہ دیکھ کر کہ مخفی تدبیریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں مسلح جتھے روانہ کیے، ان جتھوں نے پورے صوبہ میں ایک قیامت برپا کر دی، قتل وخون کا بازار گرم ہو گیا، گاؤں کے گاؤں جلائے جانے لگے، ان غارت گروں نے عیسائیوں اور ترکوں کی تمیز بھی اٹھا دی تھی، وہ اپنے علاوہ تمام دوسرے فرقوں کے ساتھ یکساں مظالم کرتے تھے، چنانچہ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک بلغاری جتھے نے ایک یونانی پادری کو زندہ جلا دیا، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں:

''اس واقعہ پر کسی نے کچھ نہیں کہا، اگر یہی چیز مسلمانوں نے کی ہوتی تو کیسا واویلا مچتا۔''(۱)، اصل یہ ہے کہ یہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شدید عداوت رکھتی تھیں ان کے جتھے جس قدر ترکوں کو نقصان پہنچاتے تھے، اسی قدر آپس میں بھی قتل وخون کرتے رہتے تھے، یونانی جتھے مقدونیا کی بلغاری اور سروی آبادی کو فنا کر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ مقدونیا کا زیادہ سے زیادہ حصہ یونان میں شامل کیا جا سکے، یہی جذبہ بلغاری اور سروی جتھوں کا تھا، بلغاری جتھوں کی سرگرمیاں سب سے بڑھی ہوئی تھیں، ان ہنگاموں سے بلغاریا کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دولِ عظمیٰ کو مقدونیا کی جانب متوجہ کرے اور ان کی مداخلت سے بیش از بیش فائدہ اٹھانیکی کوشش کرے۔

مرزنگ پروگرام: دولِ عظمیٰ کو اسی دعوت کا انتظار تھا، انھوں نے آپس میں مشورہ کیا

(۱) نائٹ ص ۱۹-۲۰

اور تمام یورپ کی طرف سے روس اور آسٹریا کو نمایندہ مقرر کر کے مقدونیا کے لیے ایک نظامِ اصلاح مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی، اس کام کے لیے اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں روس اور آسٹریا کی تیار کردہ اسکیم جو 'مرزٹگ پروگرام' (Murzsteg Programme) کے نام سے مشہور ہے متفقہ طور پر منظور کی گئی اور مقدونیا کی اصلاح کا کام شروع ہوا، سلطان عبدالحمید کو بھی یورپ کی متحدہ قوت سے دب کر یہ مداخلت تسلیم کرنی پڑی، عثمانی فوجیں جس کشت وخون، آتش زنی اور غارت گری کے استیصال میں ناکام ثابت ہوئی تھیں اسے ختم کرنے کا بیڑہ اب انہی حکومتوں نے اٹھایا جن کی شہ پاکر یہ قیامت برپا کی گئی تھی، مقدونیا کا صوبہ تین ولایتوں: اسکوب، سالونیکا اور موناستر پر مشتمل تھا، ان ولایتوں کے لیے ایک ترکی انسپکٹر جنرل (حسین حلمی پاشا) مقرر کیا گیا اور اس کی نگرانی کے لیے روس اور آسٹریا کے نمایندے مقرر ہوئے، امن وامان قایم رکھنے کی خدمت ایک بین الاقوامی پولیس کو تفویض ہوئی جس کا افسر اعلیٰ ایک یوروپین تھا، تینوں ولایتیں روس، آسٹریا، انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان اس طرح تقسیم کر دی گئیں کہ ہر حکومت اپنے حصہ کے امن وامان کی ذمہ دار قرار پائی لیکن مشترکہ امور کی نگرانی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہوئی۔

اس نظام کے جاری کرنے کے کچھ دنوں بعد دولِ عظمیٰ نے مقدونیا کی مالیات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن بھی مقرر کر دیا، یوں فوجی اور مالی دونوں شعبے دولت علیہ کے ہاتھ سے حقیقتاً نکل گئے لیکن مقدونیا کی حالت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا، امن وامان قایم کرنے میں بین الاقوامی پولیس بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی جیسی عثمانی فوج اس سے پہلے ہو چکی تھی، یونانی اور بلغاری جتھوں کی غارت گری برابر جاری رہی، شیویل لکھتا ہے کہ نسلی جماعتوں کی باہمی عداوتیں خصوصاً یونانیوں اور بلغاریوں کی اور پھر اس سے کسی قدر کم سرویوں، ولاچیوں اور البانیوں کی دشمنیاں اس درجہ قابو سے باہر ہو گئی تھیں کہ عقل وخرد کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور پوری آبادی اپنے کو ہلاک

کرنے پر تلی ہوئی تھی، جو ریاستیں مقدونیا کی سرحد پر واقع تھیں، وہ ان غارت گروں کی پوری طرح مدد کر رہی تھیں، جنھوں نے سلطان کے بعد مقدونیا کی وراثت پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔(۱)

مقدونیا کی تقسیم کے منصوبے: ''مرزٹگ پروگرام'' اور مالیاتی کمیشن کا تقرر ترکوں کی غیرتِ ملی کے لیے ایک سخت تازیانہ تھا، ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ بین الاقوامی مداخلت کی باگ روس اور آسٹریا کے ہاتھوں میں دے دی گئی تھی جب کہ یہ دونوں سلطنتیں دولت عثمانیہ کی شدید ترین دشمن تھیں، چنانچہ ترکوں کا خیال تھا اور بقول مسٹر نائٹ غیر جانبدار اشخاص کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ روس اور آسٹریا نے بالقصد اس پروگرام کو ناکام بنایا اور ان کے نمایندوں نے اس کا نفاذ ایسے طریقہ پر کیا کہ اس سے عیسائیوں میں ہنگامہ وفساد کی آگ بھڑکتی ہی گئی، اس سے غرض یہ تھی کہ یوروپین ٹرکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز آگے بڑھائی جائے(۲)، ۱۹۰۴ء کے بعد انگلستان، روس اور فرانس نے 'مرد بیمار' کے مال کے حصے بخرے کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا اور ۱۹۰۵ء کے آخر میں لارڈ لینس ڈاؤن (Lord Lansdowne) کے زیر قیادت دولِ عظمٰی کے متحدہ جنگی بیڑوں کا مظاہرہ ایک ایسا کھلا ہوا اشارہ تھا جسے ہر ترک سمجھ سکتا تھا، مسٹر بکسٹن (C.B. Buxton) جو 'بلقان کمیٹی' میں انگلستان کے نمایندہ تھے، اعتراف کرتے ہیں کہ ''ترکی حکومت کے دشمن خواہ ذاتی اغراض کی بناء پر یا نوعِ انسانی کی ہمدردی کے خیال سے پھر حملہ آور ہو رہے تھے، یہ گفتگو بھی تھی کہ مقدونیا کو تقسیم کر دیا جائے۔''(۳)

جون ۱۹۰۸ء میں شاہ ایڈورڈ اور زار نکولس نے ریوال میں ملاقات کی اور مقدونیا میں امن قایم کرنے کے لیے ایک جدید پروگرام مرتب کیا، ترک مرزٹگ پروگرام

(۱) شیویل ص ۴۳۶ (۲) نائٹ ص ۹۶ (۳) ''ترکی حالت انقلاب میں'' از چارلس بکسٹن ص ۲۴

Turkey in revolution by C.B. Buxton

کا نتیجہ دیکھ رہے تھے، ان میں اب کسی نئے تجربہ کی برداشت کی طاقت نہ تھی، اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان اور روس کی یہ متحدہ سرگرمی سلطنت عثمانیہ کے یوروپین صوبوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی اگر نوجوان ترکوں نے عجلت سے کام لے کر علمِ انقلاب نہ بلند کر دیا ہوتا، جس سے نہ صرف سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ دول عظمیٰ کے سارے منصوبے بھی دفعتہً خاک میں مل گئے۔

عبدالحمید کا استبداد: عبدالحمید ایک استبداد پسند سلطان تھا اور اس کا استبداد مطلق العنانی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، لیکن عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد ہی بلغاریا کے مسئلہ پر اسے دولِ عظمیٰ کے متفقہ مطالبہ کے سامنے سر جھکانا پڑا اور عین اس وقت جب یوروپین طاقتوں کے نمایندے قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر عیسائی رعایا کے لیے اصلاحات کی تجویزوں پر غور کر رہے تھے عبدالحمید نے مدحت پاشا کے تیار کردہ دستور کو جس کا نفاذ سلطان عبدالعزیز کے عہد میں نہ ہو سکا تھا منظور کر کے یہ اعلان کر دیا کہ آیندہ دولت علیہ کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب و ملت قانون کی نگاہ میں یکساں خیال کی جائے گی، ساتھ ہی پارلیمنٹ کا افتتاح کر کے گویا دستوری حکومت قایم کر دی، عبدالحمید نے اس کارروائی سے یوروپین طاقتوں اور مدحت پاشا کی حزب الاصلاح (رفارم پارٹی) دونوں کے مطالبات بظاہر پورے کر دئے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ دستوری حکومت کا شدید مخالف تھا، چنانچہ جب دستور کے اعلان کے بعد قسطنطنیہ کی کانفرنس منتشر ہو گئی تو چند ہی دنوں میں عبدالحمید نے عثمانی پارلیمنٹ کو بھی برخاست کر دیا اور دستور کے اصلی محرک اور مصنف مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا، مدحت پاشا جلاوطن کر دئے گئے لیکن ان کے پیدا کردہ خیالات قوم کے دلوں سے نہ نکل سکے، یہ دیکھ کر عبدالحمید نے مدحت پاشا کو الطاف خسروانہ کا یقین دلا کر واپس بلا لیا اور چند مہینے شام اور اس کے بعد سمرنا کی ولایت پر مامور کرنے کے بعد ان پر سلطان عبدالعزیز کے قتل میں شریک ہونے کا الزام لگایا اور عدالت عالیہ کو اس جرم کی تحقیقات کا حکم دیا، بقول خالدہ ادیب خانم تحقیقات کیا تھی

مکرو ریا کا ایک نظر فریب منظر تھا، مدحت پاشا کو قتل کی سزا تجویز ہوئی لیکن عبدالحمید نے سزا میں تخفیف کر کے اسے حبسِ دوام سے بدل دیا، یہ محض دکھانے کے لیے تھا، مدحت پاشا طائف میں قید کیے گئے اور چند دنوں بعد کچھ اور آدمیوں کے ساتھ وہیں قید خانے میں انھیں پھانسی دے دی گئی، مدحت پاشا سلطنت عثمانیہ کے آخری صدر اعظم تھے جنھیں موت کی سزا دی گئی۔

لیکن مدحت پاشا کی موت سے آزادی کے وہ خیالات فنا نہیں ہوئے جو دور تنظیمات سے ترکوں کے اندر پرورش پا رہے تھے، عبدالحمید ان خیالات سے بے خبر نہ تھا، وہ جانتا تھا کہ یورپ کی آزاد خیالی ترکی میں پھیلتی جا رہی ہے، اس نے سب سے پہلے انہی خیالات کی اشاعت روکنے کی کوشش کی، چوں کہ یہ خیالات زیادہ تر مغربی تعلیم اور یورپ کے سفر کا نتیجہ ہوتے تھے، اس لیے عبدالحمید نے ان دونوں چیزوں پر سخت پابندیاں عاید کر دیں، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ''عبدالحمید اپنی مسلمان رعایا کو جاہل رکھنا چاہتا تھا کہ بحیثیت بادشاہ اس کی اطاعت آنکھ بند کر کے ہوتی رہے، وہ جانتا تھا کہ جدید یورپ کی آزاد خیالی کا پودا ترکی میں نصب کر دیا گیا ہے اور اس نے عزم کر لیا تھا کہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دے گا یا کم سے کم اسے بڑھنے نہ دے گا، اس نے مغربی ترقی کے اثر سے ترکی کو الگ کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا، چند مستثنیات کے علاوہ اس کی رعایا کو غیر ملکوں میں سفر کرنے کی اجازت نہ تھی اور سلطنت کے اندر بھی لوگوں کی نقل و حرکت شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی تھی (۱) عبدالحمید نے مدحت پاشا اور ان کے پیرووں کی تصنیفات کو ممنوع قرار دے دیا تھا، جس کسی کے پاس تنظیمات کے متعلق کوئی کتاب پکڑی جاتی تھی اسے بہت سخت سزا ملتی تھی، ایسی کتابوں کا ایک صفحہ بھی پڑھ لینا بغاوت میں داخل تھا، آزادی، دستور، حب وطن اور اس قسم کے دوسرے الفاظ لغت کی کتابوں سے نکال ڈالے گئے۔'' (۲) عبدالحمید پر سازشوں کا

(۱) نائٹ ص ۴۳ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش از خالدہ ادیب خانم ص ۶۰

خوف اس قدر طاری رہتا تھا کہ اس کی احتیاطی تدبیریں بعض اوقات حد سے متجاوز ہو جاتی تھیں مثلاً اس خطرہ سے کہ ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون سازش کرنے والوں کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں، اس نے ترکی میں ان چیزوں کی درآمد ممنوع قرار دے دی تھی، پریس کو مطلق آزادی نہ تھی، باہر سے چھپ کر جو چیز بھی ترکی میں آتی تھی اس پر نہایت سخت نظر رکھی جاتی تھی، اگر کسی شخص کے پاس ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کی کوئی تصنیف پائی جاتی تو اسے قید کر لیا جاتا، نگرانی اتنی سخت تھی کہ تھیٹر میں ہیملٹ (Hamlet) کا ڈراما کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کیوں کہ اس میں ایک بادشاہ کے قتل کیے جانے کا واقعہ دکھایا گیا ہے۔(۱)

فوج کی تعلیم: تاہم یورپ کے اثر سے عبدالحمید فوج کو محفوظ نہ رکھ سکا، وہ جانتا تھا کہ سلطنت کی بقا اس بات پر منحصر ہے کہ فوج کی تربیت اور تنظیم یورپ کے جدید اصولوں کے مطابق کی جائے، اس لیے مجبوراً اس نے فوجی مدارس قایم کیے جہاں یورپ کے ماہرین حرب ترک نوجوانوں کو تعلیم دیتے تھے، ہزاروں فوجی افسر انھی مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلے اور اپنے ساتھ یورپ کے فوجی اصولوں کے علاوہ سیاسی خیالات بھی لائے، اعلیٰ تعلیم کے لیے عبدالحمید نے بہت سے فوجی افسروں کو جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی روانہ کیا، یہ افسر جب واپس ہوئے تو ایک بنیادی انقلاب کی ضرورت کا احساس لے کر آئے، عبدالحمید ان جدید تعلیم یافتہ افسروں سے مطمئن نہ تھا بلکہ انھیں اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا، اسی لیے انھیں قسطنطنیہ میں نہیں رکھتا تھا بلکہ سلطنت کے مختلف صوبوں اور دور دراز مقامات میں بھیج دیتا تھا تاکہ ان کے خیالات سے دارالسلطنت متاثر نہ ہونے پائے۔

نظامِ جاسوسی: آزادخیالی کی روک تھام کے لیے عبدالحمید نے جاسوسی کا ایک زبردست محکمہ قایم کیا تھا، جس کی سرگرمیاں ترکوں کا گلا گھونٹ رہی تھیں، کوئی گھر جاسوسوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھا، ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تلاش میں پولیس اکثر

---

(۱) نائٹ ص ۴۴

تعلیم یافتہ ترکوں کے مکانات میں بے تامل داخل ہو جایا کرتی تھی، خاص اجازت کے بغیر کوئی جلسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اس میں اتنی سختی برتی جاتی تھی کہ تین چار دوستوں کا کسی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر بات چیت کرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا، کوئی ترک خود اپنے گھر میں بھی احباب کی ضیافت نہیں کر سکتا تھا، جب تک حکامِ بالا سے اجازت نہ حاصل کر لے اور اجازت کے بعد بھی اکثر کوئی پولیس کا سپاہی اس کے ہاں بھیج دیا جاتا تھا کہ مہمانوں کی گفتگو سنتا رہے اور اندازہ کرے کہ دعوت کسی سازش کے سلسلہ میں تو نہیں ہے، یہ ناخواندہ مہمان صحبت کا سارا لطف خاک میں ملا دیتا تھا۔(۱)

جو لوگ اپنی خاندانی وجاہت، روشن خیالی، حب الوطنی یا شرافتِ نفس کی وجہ سے ممتاز تھے ان پر خاص طور سے نظر رکھی جاتی تھی، جاسوسی کی شدت نے ان کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی، جاسوسی کا نظام اتنا وسیع تھا کہ اس پر اوسطاً بیس لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا، کوئی مقام، کوئی طبقہ، کوئی گھر جاسوسوں کی زد سے باہر نہ تھا، غضب یہ تھا کہ خود وزرا ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے تھے، ملازمین اپنے آقا کے جاسوس تھے، بعض اوقات خود اپنے اعزہ اور رشتہ دار جاسوسی کرتے تھے، خاندان، فوج، بحریہ کوئی بھی اس کے مہلک اثرات سے محفوظ نہ تھا، اجتماعی زندگی کا سارا اعتماد جاتا رہا تھا، کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا، ہر شخص دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا، تمام فضا خوف اور بے اعتمادی سے بھری ہوئی تھی، طرہ یہ تھا کہ خود ان جاسوسوں پر بھی جاسوس مقرر کیے گئے تھے، عبدالحمید کے جاسوس یورپ کے ہر پایہ تخت میں تھے، جاسوسوں کی یہ زبردست فوج جو سلطنت کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی تھی، اپنی رپورٹیں سلطان کے پاس بھیجتی رہتی تھی اور ان رپورٹوں کی بنا پر ہزاروں آدمیوں کو قید، جلاوطنی اور قتل کی سزا ملتی تھی، جاسوس جن لوگوں کو نامزد کر دیتے تھے انھیں اکثر بغیر اس کے کہ عدالت میں صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے سزا دے دی جاتی تھی، ملک کے بعض بہترین افراد اپنے گھروں سے

(۱) نائٹ ص ۴۵

دفعۃً غائب ہو گئے اور پھر پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے، یہ لوگ قصر سلطانی میں بلائے جاتے تھے اور وہاں خاموشی کے ساتھ قتل کر کے باسفورس میں ڈال دئے جاتے تھے، باسفورس کی مچھلیاں قصر سلطانی کے ان الوانِ نعمت کی منتظر رہا کرتی تھیں، جلاوطنی یا قید کی سزا تو معمولی جرائم کے لیے مقرر تھی مثلاً باب عالی کے طرز حکومت سے اختلاف کا اظہار یا کسی آزاد خیال غیر ملکی اخبار کا اپنے پاس رکھنا، لوگ باب عالی میں بلائے جاتے تھے اور انھیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے خلاف بیان دینے پر مجبور کیا جاتا تھا، دستوری حکومت کے اعلان کے بعد تقریباً ستر ہزار آدمی جو سلطنت کے دور دراز مقامات مثلاً طرابلس اور یمن اور غیر ممالک میں جلاوطن کر دئے گئے تھے، ترکی میں واپس آئے، جو قتل کر دئے گئے تھے یا جو قید کی حالت میں مر گئے ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ (۱)

اس نظام کی زد تقریباً تمام تر ترکوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ ترکوں پر تھی، کیوں کہ عبدالحمید کو انہی کی طرف سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا، عیسائی رعایا اور دوسرے مسلمان نسبتاً آزاد تھے، عیسائیوں کو ایک بڑی آزادی یہ بھی حاصل تھی کہ سابق معاہدوں کی بنا پر حکومت ان کے تعلیمی نظام میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی، برخلاف اس کے ترکوں کے مدارس کی نگرانی نہایت سختی سے ہوتی تھی، عبدالحمید نے اپنی رعایا میں سے ترکوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوا، اس نے کرد، عرب اور البانی رئیسوں پر لطف و کرم کا مینہ برسا دیا اور انھیں اپنے مقربین میں داخل کر لیا، تنظیمات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ترکی زبان میں تھا اور دوسرے مسلمانوں پر ان خیالات کا اثر نہیں ہوا تھا، اس لیے ان پر اس دورِ استبداد میں اتنی سختیاں نہیں ہوئیں جتنی ترکوں پر کی گئیں اور ابھی ان میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ یہ مرحمتِ خسروانہ محض رشوت ہے جو انھیں اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ ترقی نہ کر سکیں اور انھیں نئے خیالات کی ہوا نہ لگنے پائے۔" (۲)

---

(۱) نائٹ ص ۴۶-۴۸ (۲) خالدہ خانم ص ۶۹

عوام کی بیزاری: عوام میں بھی عبدالحمید کے استبداد نے بیزاری پھیلا رکھی تھی، دیہاتی علاقوں کے سیدھے سادے ترک سلطان کو نہ صرف اپنا فرماں روا بلکہ مذہبی پیشوا بھی سمجھتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل کو اپنا اولین فرض خیال کرتے تھے لیکن باب عالی کی بدنظمیوں سے ان پر جو مظالم ہو رہے تھے ان سے خود سلطان کے خلاف برگشتگی پیدا ہو گئی تھی ترک کسانوں کو بھی بڑے بڑے ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے، یہ غریب سال بھر کی جفاکشی اور کفایت شعاری سے جو سرمایہ جمع کرتے، اس کا بڑا حصہ ٹیکس جمع کرنے والوں کی نذر ہو جاتا، قانونی طور پر جو ٹیکس نافذ تھے وہ زیادہ سخت نہ تھے، لیکن باب عالی کے عمال کی سختیاں حد سے بڑھ گئی تھیں اور غریب کسانوں کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور امرا رشوت دے کر کبھی کبھی ٹیکس سے بری ہو جاتے تھے اور ان کا بار بھی غریبوں ہی پر پڑتا تھا، کسان یہ بھی دیکھتے تھے کہ جو کثیر رقم ان سے بجبر وصول کی جاتی ہے، اس سے خود انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے عہدہ داروں کی جیبیں پر ہوتی ہیں مثلاً باب عالی میں ایک شعبہ نظاراتِ نافعہ (پبلک ورکس) کا تھا جس کے سپرد سڑکوں اور نہروں کی تعمیر تھی لیکن یہ چیزیں بہت کم تعمیر ہوتی تھیں حالاں کہ ان کے لیے ٹیکس ہر سال ادا کیا جاتا تھا، ایک وزارت پولیس کی تھی لیکن جان و مال کے تحفظ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، وزارتِ عدل بھی تھی لیکن عدل و انصاف نہ تھا اور وزارتِ حرب کے باوجود فوجیں بھوکوں مر رہی تھی۔

تاہم ان تمام شکایتوں کے باوجود ترک کسانوں کو جو عقیدت سلطان کی ذات سے تھی وہ کبھی بغاوت کی اجازت نہ دیتی، اگر عبدالحمید کے وزرا نے فوج کی زبوں حالی کا کچھ بھی خیال کیا ہوتا، فوج کا بڑا حصہ انہی کسانوں کے لڑکوں پر مشتمل تھا اور علاوہ البانی اور بعض دوسرے دستوں کے جو سلطان کی ذات کے تحفظ اور دارالسلطنت کو خوفزدہ رکھنے کے لیے قسطنطنیہ میں مقیم تھے اور جن کی نگہداشت عبدالحمید خود کرتا تھا، بقیہ تمام فوج کا انتظام حقیقتاً مقربین سلطانی کے ہاتھوں میں تھا جو سپاہیوں کی تکلیف و احتیاج سے قطعاً بے پروا ہو کر دولت کے ڈھیر لگا رہے تھے، غریب سپاہی ہر سختی کو پوری وفاداری اور صبر

کے ساتھ برداشت کررہے تھے لیکن ایک چیز سے ان کے صبر کا پیمانہ بھی آخرکار چھلک ہی گیا عثمانی فوج کا دستور تھا کہ سپاہیوں کو چار سال تک اپنے دستہ میں رہنا پڑتا تھا اس کے بعد وہ گھر واپس آجاتے تھے اور پھر وقتاً فوقتاً میعاد معینہ پر فوجی تربیت کے لیے بلائے جاتے تھے، عبدالحمید کے زمانہ میں یہ قاعدہ ہوگیا کہ چار سال کی مقررہ مدت کے بعد بھی سپاہی کئی سال تک روک لیے جاتے تھے اور جن کو گھر واپس جانے کی اجازت بھی ملتی تھی وہ بھی جب چند دنوں کے بعد ٹریننگ کے لیے بلائے جاتے تو اکثر ان کو سلطنت کے دور دراز مقامات میں بھیج دیا جاتا، جہاں انھیں غیر معین مدت تک فوجی خدمت انجام دینی پڑتی، جو دستے یمن یا حجاز بھیجے جاتے ان کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی، ذرائع حمل ونقل کی کمی سے رسد کی فراہمی کافی طور پر نہ ہوسکتی اور ان فوجوں کو خوراک اور لباس کی تکلیف کے علاوہ اکثر اسلحہ کی کمی کی شکایت بھی رہتی، ان حالات میں عربوں کی بغاوت کو فرو کرنا آسان نہ تھا، ترکی دستوں کو اکثر شکستیں ہوتیں اور محض بابِ عالی کی بدنظمی کی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں سپاہی قتل ہوجاتے۔

مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ''ترکی میں فوجی خدمت کا بار تمام تر مسلمان آبادی پر ہے عیسائی اس وقت تک اس سے بالکل بری ہیں''، اس کے عوض وہ صرف ایک خفیف ٹیکس دیتے ہیں، ترک سپاہی اپنی جفاکشی اور شجاعت کے لحاظ سے دنیا کے بہترین سپاہیوں میں ہے، وہ بڑی بڑی سختیوں کو بغیر شکایت کے برداشت کرلے گا، تاہم اس کی برداشت کی بھی ایک حد ہے، سابق دورِ حکومت میں ان اعلیٰ درجہ کی فوجوں کو جو قابل رحم حالت میں تھے قلعوں اور فوجی چوکیوں میں دیکھی اس کے بیان میں مبالغہ مشکل سے ہوسکتا ہے، ان فوجوں کو پورا راشن کبھی نہیں ملتا تھا، بعض اوقات ان پر فاقے گذرتے تھے، بلقان کی شدید سردیوں کے زمانہ میں بھی جب وہ سرحد کی حفاظت پر تعینات رہتیں انھیں کافی لباس میسر نہ تھا، اکثر ان کی وردیاں پرانی ہوکر چیتھڑے چیتھڑے ہوجاتی تھیں اور جو ملکی لباس بھی مل سکتا وہ اسی کو پہن کر بسر کرلیتیں، ان کی قلیل تنخواہ ہمیشہ بقائے میں پڑی رہتی،

وہ فوجی تربیت اور تنظیم سے بھی محروم تھیں یعنی یورپ کا بہترین فوجی جوہر افسوس ناک طریقہ پر ضایع ہورہا تھا، خود افسروں کی تنخواہ بھی باقاعدہ نہ ملتی تھی، انھیں اتنی استطاعت نہ تھی کہ صاف ستھری زندگی کا سامان فراہم کرسکتے، نفرت انگیز نظامِ جاسوسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے بھی کشیدہ رہتے تھے، ان حالات میں وہ اپنے سپاہیوں کے اندر وہ بلند فوجی روح نہیں پیدا کرسکتے تھے جو پہلے ترکی فوج کا طرۂ امتیاز تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب لڑائی کا موقع آتا تھا تو یہ لوگ یاد رکھتے تھے کہ ہم ترک سپاہی ہیں اور خوب لڑتے تھے۔(۱)

عام بیزاری: مذکورہ بالا حالات نے سلطنت کے ہر حصہ میں بیزاری پھیلا رکھی تھی اور انقلاب کے جذبات رعایا کے ہر طبقہ میں پرورش پا رہے تھے، ان جذبات کو دبانے اور فنا کرنے کے لیے عبدالحمید نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے الٹی ثابت ہوئیں، چوں کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ترک ہمیشہ جاسوسوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کے لیے ایک دوسرے سے آزادی کے ساتھ ملنا خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لیے وہ اپنی زندگی کی بے لطفی دور کرنے کی غرض سے زیادہ تر فلسفہ، تاریخ، قانون اور دوسرے مضامین کی کتابیں جو مغربی ممالک سے پوشیدہ طور پر ترکی میں لائی جاتی تھیں پڑھتے رہتے تھے، یہ کتابیں ترک جلاوطن بہت خفیہ طور پر اپنے دوستوں اور ہم خیالوں کو بھیجا کرتے تھے، شروع میں اس ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تعداد بہت قلیل تھی، اکثر ایک ہی کتاب یکے بعد دیگرے سیکڑوں اشخاص تک منتقل ہوتی رہتی، بعض پرجوش نوجوان موٹی موٹی کتابوں کو اپنے ہاتھ سے نقل کرڈالتے، سلطان نے آزاد خیالی کی روک تھام کے لیے ہزاروں آدمیوں کو قسطنطنیہ سے جلاوطن کرکے سلطنت کے مختلف صوبوں میں نظربند کردیا تھا مگر اس کی یہ تدبیر بھی غلط ثابت ہوئی، ان لوگوں نے صوبوں میں پہنچ کر روشن خیالی، حریت پسندی اور سیاسی بے اطمینانی پھیلانی شروع کی، جو لوگ غیر ملکوں میں جلاوطن

---

(۱) نائٹ ص ۵۵

کیے گئے تھے اور پیرس یا یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں رہتے تھے وہ براہِ راست جدید خیالات کے زیر اثر آتے گئے اور یہی خیالات انھوں نے ترکی میں اپنے دوستوں کو پہنچانے شروع کیے، ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری سلطنت میں سلطان کی حکومت کے خلاف ایک عام ناراضی پھیل گئی اور زمین روز بروز انقلاب کے لیے تیار ہوتی گئی۔

انجمن اتحاد و ترقی: مدحت پاشا کے قتل کے بعد دستوری حکومت کا از سر نو قایم کیا جانا ایک امر محال معلوم ہوتا تھا لیکن بہت سے محبّ وطن ترک جو یوروپین ممالک میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس مقصد سے غافل نہ تھے، خصوصاً پیرس میں نوجوان ترکوں کی ایک سرگرم جماعت سلطنت عثمانیہ میں دستوری حکومت کی تحریک کو ترقی دینے کے لیے منظّم کوشش کر رہی تھی، ۱۸۷۸ء سے لے کر جب کہ سلطان عبدالحمید نے دستور اساسی کو معطل کر دیا تھا، ۱۸۹۱ء تک ترکوں کی کسی انجمن کا پتہ نہیں چلتا، اگر چہ ایسے اشخاص کی تعداد جو حکومت کے استبداد سے آزادی حاصل کرنی چاہتے تھے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، سب سے پہلے ۱۸۹۱ء میں جنیوا (Geneva) میں جو صدیوں سے کلیسا اور حکومت کے باغیوں کا مامن بنا ہوا تھا، ترک جلاوطنوں اور پناہ گزینوں کی ایک جماعت نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جو بعد میں 'عثمانی انجمنِ اتحاد و ترقی' کے نام سے مشہور ہوئی، اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت اور سلطان پر دباؤ ڈال کر ملک میں اصلاحات جاری کرانے کی سعی کی جائے، شروع میں انجمن اپنے کو اتنا طاقت ور نہیں محسوس کرتی تھی کہ اگر سلطان اپنی ضد پر قایم رہتا تو اسے تخت سے اتارنے کی تدبیریں اختیار کرتی، کچھ دنوں کے بعد انجمن کا صدر دفتر جنیوا سے پیرس کو منتقل کر دیا گیا اور اس کی شاخیں لندن اور دوسرے یوروپین دارالحکومتوں میں قایم کر دی گئیں، سلطان نوجوان ترکوں کی ان سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھا، عثمانی سفیر مقیم پیرس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انجمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور قسطنطنیہ سے جاسوس روانہ کیے گئے کہ انجمن کے متعلق جو معلومات بھی فراہم کر سکیں ان سے براہِ راست قصر یلدیز کو مطلع کریں، خود ترکی میں

جاسوسی کا نظام اور بھی سخت کر دیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ملک کے بہترین اشخاص بھاگ بھاگ کر پیرس پہنچنے لگے اور نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہوتے گئے، انجمن ایک اخبار 'مشورت' اور متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے پیرس سے شایع کرتی تھی، جنیوا سے اس کا دوسرا اخبار 'ہلال' نکلتا تھا، ان اخباروں اور رسالوں میں دور حمیدی کے مظالم کا ذکر ہوتا اور سلطان کو معزول کرنے کی تجویز پیش کی جاتی، نظام جاسوسی کی شدت کے باوجود یہ اخبارات اور رسالے خفیہ طور پر ترکی میں لائے جاتے اور کثرت سے لوگ ان کو پڑھتے، قسطنطنیہ میں انجمن کے ایجنٹ انقلابی اپیلیں رات کی تاریکی میں دیواروں پر چسپاں کر دیتے اور باغیانہ پوسٹر جن میں سلطان کی جان کی دھمکی ہوتی خود قصر یلدیز کی دیواروں پر چسپاں کر دئے جاتے۔

غیر اسلامی انجمنوں سے مفاہمت: نوجوان ترک اپنے ممتاز پیش رو مدحت پاشا کی طرح یہ خوب سمجھتے تھے کہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تمام قوموں اور مذہبی فرقوں کو یکساں حقوق دے دئے جائیں، چنانچہ انھوں نے آرمینی، بلغاری اور دوسری غیر مسلم انقلابی انجمنوں سے جو پیرس میں تھیں اتحادِ عمل پیدا کرنے کی کوشش شروع کی، سب سے پہلے آرمینی کمیٹیوں نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور فریقین کے درمیان ۱۹۰۳ء میں جو معاہدہ پیرس میں ہوا وہ آخر تک قایم رہا، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ''نوجوان ترکوں اور آرمینی انقلابیوں کے درمیان مفاہمت کی راہ میں سیاسی دشواریاں بہت کم تھیں، یہ مسئلہ ایسا نہ تھا جیسا کہ مقدونیا میں یونانیوں اور سلافیوں کا مسئلہ جن کی ہم قوم خود مختار حکومتیں سرحد پر موجود تھیں جن کی مدد وہ حاصل کر سکتے تھے اور جن سے حمایت اور اگر اتفاق نے مساعدت کی تو الحاق کی امید بھی کر سکتے تھے، کیوں کہ آرمینیا اب صرف ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور قدیم آرمینیا، ترکی، روس اور ایران کے درمیان تقسیم ہو چکا ہے، ترکی آرمینیا میں آرمنوں سے بہت زیادہ مسلمانوں کی تعداد ہے اور ایک خود مختار آرمینی علاقہ پیدا کرنا جیسا کہ انقلابیوں کی

ایک جماعت کی خواہش تھی ظاہر ہے کہ ایک ناقابل عمل اسکیم تھی، چنانچہ ارمنوں میں جولوگ زیادہ سمجھ دار تھے انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ترکی حکومت کا واحد بدل روسی حکومت ہوسکتی ہے اور سرحد پاران کے بھائیوں کے تجربہ نے یہ ثابت کردیا تھا کہ ان دونوں میں ترکی حکومت قابل ترجیح ہے، کیوں کہ اس کے ماتحت ان کو ایک حد تک نسلی خودمختاری اور مختلف رعایتیں حاصل تھیں، یہ سچ ہے کہ عبدالحمید کے استبداد سے یہ رعایتیں بہت محدود ہوگئی تھیں، لیکن حکومت روس جو ہمیشہ اپنی ماتحت قوموں کو روسی بنانے پر تلی رہتی تھی، ہرگز یہ مراعات انھیں نہ دیتی۔‘‘(۱)

اس کے بعد نوجوان ترک دوسری غیر اسلامی انقلابی کمیٹیوں کی طرف متوجہ ہوئے، ارمنوں کی طرح یہودیوں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی انھیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی، کیوں کہ یہود کا بھی کوئی خاص وطن نہ تھا اور قومی اور وطنی آزادی کا مسئلہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، لیکن مقدونیا کے بلغاریوں، سرویوں اور یونانیوں کے ساتھ مفاہمت کرنے میں سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ قومیں بیرونی حکومتوں کی مدد پر اعتماد کرتی تھیں، نوجوان ترکوں نے انھیں سمجھایا کہ دولِ عظمٰی جو ایک دوسرے کو حسد کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اگر مقدونیا میں مداخلت پر آمادہ بھی ہوں تو بھی اس کی امید نہیں کہ وہاں کے عیسائیوں کے سیاسی حوصلے پورے ہوسکیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ مقدونیا کے خلفشار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ سلطنت آسٹریا ہنگری اپنے اندر شامل کرلے گی، ایسی صورت میں مقدونیا کے عیسائیوں کے لیے مفید یہی ہے کہ سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کا خیال ترک کرکے نوجوان ترکوں کا ساتھ دیں جن کا مقصد سلطنت میں اتحاد پیدا کرنا اور ان کی تمام قوموں کو مساوی حقوق دینا ہے، چار سال کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر ۱۹۰۷ء میں مقدونیا کی انقلابی کمیٹیوں نے پیرس میں ایک پروگرام مرتب کیا، جو سب کے لیے قابلِ قبول تھا، اس وقت تک نوجوان ترکوں نے مقدونیا میں اپنی خفیہ

(۱) بیداری ترکی ص ۸۸

سوسائٹی قایم کرلی تھی اور ترکی فوج کے بڑے حصہ کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔

پیرس کی انقلابی کانگریس: دسمبر ۱۹۰۷ء میں سلطنت عثمانیہ کے انقلابیوں کی ایک کانگریس احمد رضا بے کے زیر صدارت جو پیرس کی مرکزی انجمن کا صدر تھا پیرس میں منعقد ہوئی جس میں عثمانی انجمن اتحاد و ترقی، ارمینی، بلغاری، یہودی، عرب، البانی اور دوسری کمیٹیاں شرک ہوئیں اور تمام مندوبین نے مندرجہ ذیل امور کے قبول کرنے پر اتفاق کیا

(۱) سلطان عبدالحمید معزول کردئے جائیں۔

(۲) سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے۔

(۳) قانون کی نگاہ میں تمام نسلوں اور مذہبوں کو کامل مساوات حاصل ہو۔

(۴) مدحت پاشا کے بنائے ہوئے دستور اساسی کی بنیاد پر دستوری حکومت قایم کردی جائے۔

مقدونیا کا انتخاب: اس کانگریس سے ایک سال قبل 'انجمن اتحاد و ترقی' نے اپنا صدر دفتر مقدونیا میں منتقل کردیا تھا، مقدونیا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے مختلف اسباب تھے، اول یہ کہ وہیں وہ قوتیں کام کررہی تھیں جن سے سلطنت عثمانیہ کے جلد ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا اندیشہ تھا، سیاسی ڈاکوؤں کے خون آشام جتھے جن کو ترکی کے دشمنوں سے برابر مدد مل رہی تھی، اس علاقہ کو بری طرح تباہ و برباد کررہے تھے، اس کی وجہ سے مقدونیا کے داخلی معاملات میں دولِ عظمیٰ کو مداخلت کا موقع ہاتھ آگیا تھا اور یہ چیز ہر محب وطن ترک کے لیے نہایت شرم ناک تھی، چنانچہ مقدونیا کے ملکی انتظامات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی مالیاتی کمیشن کا تقرر اور ایک بین الاقوامی فوجی پولیس کی تشکیل جس کی تربیت اور کمان یوروپین افسروں کے ہاتھ میں تھی، دولِ عظمیٰ نے سلطان پر فوجی طاقت کا دباؤ ڈال کر منظور کرالی تھی، نوجوان ترک اس مداخلت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی وجہ سے حمیدی نظامِ حکومت کے خلاف ان کی بیزاری اور بھی شدید ہوگئی تھی، اس مداخلت کا ایک پہلو ترکوں کو خاص طور پر ناگوار تھا اور وہ 'مرزنگ پروگرام' تھا جس کے رو

سے دولِ عظمیٰ نے آسٹریا اور روس کو جو دولتِ علیہ کی شدید ترین دشمن سلطنتیں تھیں مقدونیا میں اپنا اصلاحی پروگرام جاری کرنے کا اختیار دے دیا تھا، اس پروگرام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونیا کی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی اور یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ جب تک نظامِ حکومت میں بنیادی اصلاح نہ کی جائے گی غیر ملکوں کی گرفت اور بھی سخت ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ ایک روز اپنی آزادی بالکل کھو بیٹھے گی، چنانچہ تمام مقدونیا میں موجودہ حالات کے خلاف جو شدید بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اس نے نوجوان ترکوں کی خفیہ سرگرمیوں کے لیے زمین تیار کر دی تھی۔

اس سلسلہ میں پہلا کام فوج کو اپنا ہم خیال بنانا تھا، مقدونیا کی فوجیں سلطنت کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت بغاوت کے لیے زیادہ آمادہ تھیں، ان فوجوں کو نہ اچھا کپڑا ملتا تھا نہ اچھا کھانا، تنخواہیں بھی شاذ و نادر ہی ملتیں، سالہا سال سے یہ فوجیں عیسائی باغی جتھوں سے بے قاعدہ لڑائیوں میں مصروف تھیں، جو ایک قسم کا پولیس کا کام تھا اور فوجی سپاہیوں کو مرغوبِ خاطر نہ تھا، ان کی بے اطمینانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ دیکھتی تھیں کہ ان ہی کے بھائی جو بین الاقوامی پولیس میں تھے ان کی حالت کتنی بہتر تھی، ان کی فوجی تربیت بھی بہتر تھی، عمدہ کھانا اور عمدہ کپڑا بھی ملتا تھا اور ان کی تنخواہیں بھی باقاعدہ برابر ملتی تھیں، ان کو دیکھ کر مقدونیا کی فوج کے ا[illegible]روں اور سپاہیوں دونوں کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار قصر یلدیز ہے۔

نظامِ جاسوسی کی شدت بھی سلطنت کے اور حصوں کی بہ نسبت مقدونیا میں زیادہ تھی، جس سے وہاں کے نوجوان فوجی افسر جن کی تعلیم و تربیت یوروپین اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی سخت بیزار تھے، انھیں قدرۃً نوجوان ترکوں کی تحریک سے ہمدردی پیدا ہوگئی، ان کی بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ سے قصر یلدیز کے متوسلین جن میں مطلق فوجی قابلیت نہیں ہوتی تھی مقدونیا میں بھیجے جاتے تھے اور انھیں ان

افسروں کے اوپر کمان دی جاتی تھی جو مدارسِ حربیہ کے تعلیم یافتہ تھے، جنھوں نے سلطنت کی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جو سالوں سے مقدونیا کے پہاڑوں میں باغی جتھوں سے لڑتے آئے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ ترقی کا مدار حسنِ خدمت پر نہیں بلکہ قصر سلطانی کی سفارش گردیوں پر تھا۔

مذکورہ بالا حالات میں نوجوان ترکوں کو اپنی تحریک کے پھیلانے میں بڑی مدد ملی، انجمن کی غیر معمولی سرگرمیوں کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں انقلابی خیالات مقدونیا کی پوری فوج میں پھیل گئے، انجمن کے ارکان درویشوں اور سوداگروں کے بھیس میں فوجی دستوں میں جاتے اور بڑی ہوشیاری اور خاموشی کے ساتھ تحریک آزادی کی تبلیغ کرتے، سپاہیوں اور افسروں کو حکومت کی طرف سے جو شکایتیں تھیں ان کی وجہ سے یہ خفیہ کوششیں کامیاب ہوتی گئیں، اس کے بعد دوسری فوجوں میں بھی کام شروع کیا گیا، چوں کہ دارالسلطنت کی فوج سب سے زیادہ طاقتور اور وفادار تھی، اس لیے انجمن نے مقدونیا میں اپنی کامیابی کے بعد سب سے زیادہ کوشش اسی فوج کی ہمدردی حاصل کرنے میں کی، دسمبر ۱۹۰۷ء تک مقدونیا کی تقریباً پوری فوج نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا تھا، ادرنہ اور قسطنطنیہ کی فوجوں نے بھی اس تحریک سے ہمدردی ظاہر کردی تھی اس کے علاوہ ڈاکٹر ناظم بے کی کوششوں سے اناطولیہ کی فوج کا بڑا حصہ بھی نوجوان ترکوں کا طرفدار ہوگیا تھا۔

مقدونیا میں 'انجمن اتحاد و ترقی' نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا صدر دفتر سالونیکا میں قایم کیا، یہ شہر خفیہ سوسائٹیوں کے لیے خاص طور پر موزوں تھا، اس میں بہت سی نسلوں اور قوموں کے لوگ آباد تھے، جو مختلف زبانیں بولتے تھے، اس کی گھنی آبادی میں بھیس بدل کر جاسوسوں کی نظر سے بچتے رہنا آسان تھا، برخلاف اس کے جاسوسوں کے لیے سازشوں اور خفیہ سوسائٹیوں کا پتہ چلانا بہ نسبت اور شہروں کے یہاں زیادہ مشکل تھا، یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی خفیہ سوسائٹی سے پہلے بھی وہاں اس قسم کی کئی سوسائٹیاں قایم تھیں،

چنانچہ بلغاری داخلی انجمن کا صدر دفتر وہاں ۱۸۹۵ء سے موجود تھا۔

انجمن کی احتیاطی تدبیر: جیسا کہ اوپر بیان ہوا قصر یلدیز 'انجمن اتحاد و ترقی' کی سرگرمیوں سے باخبر تھا اور سلطان کے جاسوس اس کے ممبروں کا سراغ لگانے میں پوری طرح کوشاں تھے، یہی وجہ تھی کہ ممبروں کا داخلہ بڑی چھان بین اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا، جن لوگوں نے انجمن کے قواعد وضوابط مرتب کیے تھے انھوں نے اطالوی خفیہ سوسائٹیوں کا طریقہ اختیار کیا تھا، جس میں ایک ممبر کا تعارف سوسائٹی کے صرف دو یا تین ممبروں سے کرایا جاتا تھا تاکہ اگر وہ کبھی غدار بھی ثابت ہو تو اس تعداد سے زیادہ کے نام نہ بتا سکے، تین ممبروں کی ایک خفیہ کاؤنسل پیرس میں تھی اور دس ممبروں کی سالونیکا میں، یہ کونسلیں مجلسِ عاملہ کا کام کرتی تھیں، ان دونوں کاؤنسلوں کے ممبروں کا انتخاب مخفی طریقہ کے ووٹ سے ہوتا تھا اور وہ اکثر تبدیل ہوتے رہتے تھے، مقدونیا میں 'انجمن اتحاد و ترقی' کے ارکان کی تعداد پندرہ ہزار اور تمام ترکی میں اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، یہ لوگ ڈیڑھ ڈیڑھ سو آدمیوں کی جماعتوں میں تقسیم تھے، ان جماعتوں کی نقل وحرکت کی نگرانی ورہنمائی دو ایجنٹوں کے سپرد تھی جن میں سے ایک کا تعلق سالونیکا کی دس ممبروں والی خفیہ کونسل سے تھا اور دوسرا پہلے کی نگرانی کے لیے مقرر تھا، پھر یہ جماعتیں پانچ پانچ آدمیوں کی ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھیں اور کوئی ممبر اپنی ٹولی کے چار آدمیوں کے سوا کسی دوسرے ممبر سے واقف نہ تھا، اس احتیاط کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی ممبر غداری بھی کرے تو چار آدمیوں سے زیادہ کے نام حکومت کو نہ بتا سکے، انجمن کے ممبروں میں ترکوں کے علاوہ عیسائیوں اور یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جس کی وجہ سے غداری کے اکثر مواقع پیش آئے ہوں گے، لیکن یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ کسی ممبر نے بھی دھوکا نہیں دیا، بکستن لکھتا ہے کہ ''وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آتی رہتی تھیں، اس کے بعد قید اور قتل کی سزائیں دی جاتیں، شدید ایذاؤں کے ذریعہ ایسی شہادتیں حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی جن سے ممبروں کا سراغ لگ سکے لیکن کسی ایک

ممبر کی غداری کا ثبوت بھی نہیں ملتا۔"(۱)

عورتوں کی خدمات: تحریکِ انقلاب کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترک عورتوں نے بھی بہت کچھ حصہ لیا، ان کے سپرد زیادہ تر پیغام رسانی اور کاغذات کو ایک ممبر کے پاس سے دوسرے ممبر کے پاس لے جانے کی خدمت تھی، انجمن کے ممبروں کی بیویاں ایک دوسرے سے مل کر یہ خدمت آسانی کے ساتھ انجام دیتی تھیں، ترکی میں عورتوں کو جو عزت واحترام حاصل تھا، اس کے لحاظ سے وہ تلاشی سے محفوظ و مامون تھیں اور کوئی غیر شخص خواہ وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو بلا اجازت حرم میں داخل نہیں ہوسکتا تھا، کسی پولیس افسر کی مجال نہ تھی کہ بغیر کسی نہایت ہی اہم سبب کے وہ اس مقبولِ عام دستور کی خلاف ورزی کر سکے۔(۲)

خفیہ جلسے اور نئے ممبروں کا داخلہ: عورتیں جلسوں کے انعقاد میں بھی مدد دیتی تھیں، ممبروں کو زبانی پیغامات کے ذریعہ اطلاع دی جاتی تھی، یہ جلسے نہایت خفیہ طور پر منعقد کیے جاتے تھے اور افشائے راز کے خوف سے اکثر جنگلوں میں ہوتے تھے، شریک ہونے والے نقاب پوش آتے، جب کوئی نیا ممبر انجمن میں داخل کیا جاتا تو پہلے اس سے قسم لی جاتی کہ وہ کسی حالت میں انجمن کا راز ظاہر نہ کرے گا، خواہ آیندہ وہ اپنی رائے بدل کر انجمن کی رکنیت سے علاحدہ بھی ہو جائے، اس کے بعد ایک شخص جس سے وہ ناواقف ہوتا اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک مقام پر اسے لے جاتا اور وہاں اس کے سامنے انجمن کے اغراض اور ترکی کو موجودہ مظالم سے آزاد کرانے کے طریقے بیان کیے جاتے پھر اسے قرآن شریف (۳) کو ہاتھ میں لے کر اخفائے راز اور وفاداری کی قسم کھانی پڑتی، قسم کے بعد وہ عارضی طور پر انجمن کا ممبر مقرر کیا جاتا اور ایک مدت تک اس کی وفاداری کا امتحان مختلف طریقوں سے لیا جاتا، اس کے پاس پراسرار ذرائع سے ہدایتیں پہنچتی رہتیں،

---

(۱) ترکی حالت انقلاب میں ص ۴۸ (۲) بیداری ترکی از نائٹ ص ۱۲۳ (۳) عیسائیوں اور یہودیوں کو انجیل و تورات ہاتھ میں لے کر قسم کھانی پڑتی تھی۔

جن کی تعمیل اسے بے چون و چرا کرنی پڑتی، اگر ان امتحانات میں وہ پورا اترتا تو دوبارہ اسے ایک مخفی مقام پر لے جاتے اور وہاں وہ باقاعدہ طور پر چار ممبروں کی ایک ٹولی میں داخل کر دیا جاتا، لیکن اس کے بعد بھی اس کے ساتھیوں کی شخصیت اس پر ظاہر نہ کی جاتی، حلف دینے کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن مجید پر ایک ریوالوار اور ایک تلوار رکھ کر ممبر کو متنبہ کر دیا جاتا کہ اس نے اپنا جسم و جان انجمن کے حوالہ کر دیا ہے اور اگر انجمن حکم دے تو اسے اپنے حقیقی بھائی کو بھی قتل کر دینا پڑے گا، اس کے بعد ممبر یہ حلف لیتا ''میں خدا اور حضرت محمد ﷺ کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی رہے گا میں قومیت، آزادی اور صداقت کے لیے جنگ کرتا رہوں گا''، حلف لینے کے بعد ممبر اپنی رکنیت کا ٹیکس ادا کرتا جس کی مقدار اس کی آمدنی کا دو فیصدی حصہ تھی، وہ ایک بندوق رکھنے کا عہد کرتا، نیز اس بات کا عہد کرتا کہ جس وقت اسے انجمن کے مقصد کے لیے لڑنے کی خاطر طلب کیا جائے گا، وہ فوراً اپنے بال بچوں، کاروبار اور دوستوں کو چھوڑ کر تیار ہو جائے گا، ممبروں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا وہ اور دوسرے عطیے اور رقمیں جو انجمن کو حاصل ہوتیں اسلحہ اور سامانِ جنگ کے خریدنے میں صرف کی جاتیں، اس کے بعد جو رقم بچتی وہ ان لوگوں کے اہل و عیال کی مدد کے لیے وقف کر دی جاتی جو دورانِ انقلاب میں مارے جائیں۔(۱)

سالونیکا کمیٹی: سالونیکا میں صدر دفتر کے منتقل ہونے کے بعد انجمن کی شاخیں مقدونیا اور البانیا کے تقریباً ہر گاؤں میں قایم کر دی گئیں، انقلاب کے برپا ہونے سے پیشتر اس کی شاخیں ایشیائی ترکی کے تمام اہم شہروں میں قایم ہو چکی تھیں، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں کہ ''سالونیکا کمیٹی'' کے ممبروں میں سے بہتوں سے میں نے ملاقات کی ہے، وہ سب اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگ تھے، فوج کے نوجوان افسر تھے، جنھوں نے مدارسِ حربیہ میں تعلیم

---

(۱) ''مسائل مشرق وسطیٰ'' از انیکس ہملٹن مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء ص ۳۰-۳۱

Problems of the middle east by Angs Hamilton

پائی تھی اور بیرن فان ڈرگولٹز (Fonder Goltz) کے اعلیٰ نظام کے تربیت یافتہ تھے، وکلا تھے، ڈاکٹر تھے اور چند علما تھے، اونچے درجہ کے افسروں اور ملازمتِ دیوانی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے کوئی بھی اس کمیٹی کا ممبر نہ تھا، یہ تمام اشخاص جن میں سے اکثر متوسط عمر سے کم کے تھے جو خفیہ کمیٹی کے ممبر بنے تھے، اپنی شدید اور بے لوث وطن دوستی کے لیے ممتاز تھے، یہ ایسے لوگ تھے کہ جس غیر ملکی شخص کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کا احترام اور تعریف وتوصیف کرنے پر مجبور ہوا، یہ انقلاب نیچے سے نہیں شروع ہوا یعنی ذلیل شہری مخلوق یا جاہل کسانوں سے بلکہ اوپر سے آیا جو ترکی کا بہترین حصہ تھا۔‘‘(۱)

تحقیقاتی کمیشن: دسمبر ۱۹۰۷ء کی ’’پیرس کانگریس‘‘ کے برخاست ہونے کے بعد جب نوجوان ترک پارٹی کے اخبارات مشورت اور ہلال نے ’’انجمن اتحاد وترقی‘‘ کی کامیابی کا ذکر کیا جو اسے اپنی تحریک کے پھیلانے میں حاصل ہوئی تھی تو سلطان نے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر کے انسدادی تدبیریں فوراً اختیار کیں، چنانچہ مارچ ۱۹۰۸ء میں خفیہ پولیس نے مقدونیا اور ادرنہ کے فوجی دستوں کے بعض افسروں پر چھاپے مارے اور تفتیش کے لیے ایک خاص کمیشن قسطنطنیہ سے سالونیکا بھیجا گیا، اس کمیشن کی رپورٹ جب سلطان کے پاس پہنچی تو اسے اور زیادہ خطرہ ہوا اور فوراً ہی اس نے ایک دوسرا کمیشن سالونیکا بھیجا، ان کمیشنوں کی رپورٹ پر بہت سے فوجی افسر گرفتار کر لیے گئے۔

انقلاب میں عجلت: ’’انجمن اتحاد وترقی‘‘ ابھی انقلاب کے اعلان کے لیے پوری طرح تیار نہ تھی، اس کا خیال تھا کہ انقلاب ۳۱/جولائی ۱۹۰۹ء کو شروع کیا جائے، جو سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کی سال گرہ کا دن تھا، لیکن ایک طرف تو قصر یلدیز کی انسدادی سرگرمیاں روز بروز زیادہ شدید ہوتی جاتی تھیں اور دوسری طرف مقدونیا کی بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی کے باعث بیرونی طاقتوں خصوصاً برطانیہ اور روس کی مداخلت کا خطرہ ہر لحظہ ترقی کر رہا تھا، ریوال میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور زار روس کی ملاقات کے بعد

بیداری ترکی ص ۱۴-۱۳

سالونیکا کمیٹی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ برطانیہ اور روس مل کر مقدونیا میں اصلاحات کی ایک اسکیم جاری کرنی چاہتے ہیں جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہاں کے تمام جتھے خواہ کسی نسل و قوم کے ہوں توڑ دیئے جائیں، برطانیہ اور روس کا تعاون کمیٹی کی نظر میں دولت عثمانیہ کی شکست و ریخت کا مقدمہ تھا، علاوہ بریں وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مقدونیا میں اجنبی تسلط کے قایم ہو جانے سے اسے اپنی تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا، انہی دنوں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ منیر پاشا ترکی سفیر متعینہ پیرس کے دوبارا ایتھنز جانے کی غرض یہ تھی کہ بلغاریا کے خلاف یونان سے اتحاد کر کے مقدونیا کے بعض حصے یونان کے حوالہ کر دیئے جائیں، اس افواہ سے نوجوان ترکوں میں سخت برہمی پھیلی۔

اعلانِ انقلاب: مذکورہ بالا وجوہ سے کمیٹی نے اعلانِ انقلاب میں مزید تاخیر اپنے مقصد کے لیے خطرناک سمجھی، چنانچہ اس کی ہدایت کے بموجب ۵رجولائی ۱۹۰۸ء کو میجر نیازی بے نے دو سو آدمیوں کو ساتھ لے کر رسنا کی پہاڑیوں پر سلطان عبدالحمید کے استبداد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ انقلاب کے شعلے ہر طرف پھیلنے لگے، جس وقت اس کی اطلاع قسطنطنیہ پہنچی سلطان نے فوراً شمسی پاشا کے نام جو مناستر کے فوجی دستہ کا کمانڈر تھا، حکم بھیجا کہ اس فتنہ کو جلد سے جلد فرو کر دیا جائے، شمسی پاشا باغیوں کے مقابلہ میں روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ۷رجولائی کو مقدونیا کی فوج کے ایک افسر نے جو ''انجمن اتحاد و ترقی'' کا ممبر تھا اس پر گولی چلائی اور پاشا اپنی گاڑی کے اندر ہی ٹھنڈا ہو گیا، ۸رجولائی کو ناظم بے نے سالونیکا کے اڑتالیس فوجی افسروں کو جن کے متعلق معلوم تھا کہ تحریکِ انقلاب کے حامی ہیں گرفتار کر لیا، دو ہی روز بعد انجمن کے ایک رکن نے اس کا جواب یوں دیا کہ حقی بے کو جو ناظم بے کا دستِ راست تھا گولی مار کر ختم کر دیا، ۱۱رجولائی کو خود ناظم بے پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ صرف زخمی ہو کر بچ گیا۔

انقلاب کی رفتار جس قدر تیز ہوتی جاتی تھی اسی قدر اسے فرو کرنے میں

حکومت کی طرف سے سختی بھی بڑھتی جاتی تھی، یہ دیکھ کر ''سالونیکی کمیٹی'' نے اپنے خفیہ اجلاسوں میں قصر یلدیز کے ان آلہ کاروں کے قتل کے احکام صادر کرنا شروع کیے جو تحریکِ انقلاب کے لیے نہایت خطرناک نظر آتے تھے، ان میں وہ تمام لوگ شامل تھے جو جاسوسی کی خدمت انجام دیتے تھے، مقدونیا کی فوج کے بعض سینیر افسر بھی تھے جن کا قتل کمیٹی کو ضروری معلوم ہوا، اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں لوگ بڑی سے بڑی تنخواہ پر بھی جاسوسی کا کام کرنے پر تیار نہ ہوتے، ہر جاسوس اپنے کو بندوق کا نشانہ سمجھتا تھا، یہ قتل علی الاعلان دن کی روشنی میں گنجان سڑکوں پر فوجی افسروں کے ہاتھوں سے ہوتے اور کوئی شخص بھی ان قاتلوں سے مزاحم نہ ہوتا، سلطان کے نہایت قابل اعتماد افسر جب اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجے جاتے تو وہ اپنے سپاہیوں سے باغیوں پر گولیاں چلوانے سے قاصر رہتے اور بعض اوقات خود بھی قتل کر دیے جاتے، بقول مسٹر نائٹ ''تاریخ میں پہلی بار بادشاہ کا نام اطاعت شعار عثمانی سپاہیوں کے دلوں میں احترام و اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔''(۱)

الطافِ خسروانہ کا فریب: مقدونیا میں حکومت کا اقتدار اس حد تک زائل ہو چکا تھا کہ ''باب عالی'' کے کمشنروں کے لیے ان اشخاص کی گرفتاری دشوار ہوگئی جو بغاوت کے جرم میں نامزد کیے گئے تھے، چنانچہ اب فریب سے کام لینے کی کوشش کی گئی، انور بے اور دوسرے نوجوان افسروں کو جو مقدونیا کے اندرونی علاقوں میں تحریکِ انقلاب کو پھیلا رہے تھے، خوشامدانہ خطوط لکھ کر قصر یلدیز آنے کی دعوت دی گئی اور ان سے نہ صرف معافی بلکہ انعام و اکرام اور عہدے کی ترقی کا وعدہ کیا گیا، انور بے اس وقت ولایاتِ مقدونیا کے انسپکٹر جنرل کے اسٹاف کے ایک افسر تھے، سلطان ان کی اہم حیثیت سے واقف تھا، اس لیے انھیں خاص طور پر الطافِ خسروانہ کا لالچ دیا گیا اور سلطان کی طرف سے یہ دعوت پیش کی گئی کہ اگر وہ باغیوں کا ساتھ چھوڑ کر فوراً قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں

(۱) بیداری ترکی ص ۱۳۹

تو بلا تاخیر جنرل کے عہدہ پر مامور کردیے جائیں گے، انور بے عبدالحمید کی چالوں سے خوب واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں قسطنطنیہ جانے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، بہت سے محبان وطن ترقی اور انعام و اکرام کے وعدوں پر اس سے پہلے بھی قصر یلدیز میں بلائے گئے تھے مگر پھر دنیا کو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کہاں اور کیوں کر غایب ہوگئے، وہ دیکھ چکے تھے کہ مدحت پاشا کے وقت سے الطافِ خسروانہ کا یہ طریقہ دستوری حکومت کے حامیوں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے، چنانچہ انھوں نے بجائے قسطنطنیہ کے پہاڑوں کی راہ لی اور وہاں لوگوں کو علانیہ بغاوت کے لیے ابھارنا شروع کیا۔

''انجمن اتحاد و ترقی'' اب کھل کر میدان میں آگئی تھی، اس کی کوششوں سے مقدونیا اور ادرنہ کی فوجوں کا بڑا حصہ بغاوت میں شریک ہوگیا، یہ دیکھ کر باب عالی نے طے کیا کہ اناطولیہ کی قابلِ اعتماد فوج سے اڑتالیس دستے مقدونیا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیے جائیں، چنانچہ ستائیس دستے سمرنا سے سمندر کی راہ سے سالونیکا بھیجے گئے، جہاں وہ ۱۶ر جولائی کو اترے، ڈاکٹر ناظم بے اور ان کے ساتھیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے یہ دستے ایشیائے کوچک سے روانہ ہونے کے قبل ہی انقلابی خیالات سے بڑی حد تک متاثر ہوچکے تھے، سمرنا میں آنے کے بعد انجمن کے ایجنٹوں نے فوراً ہی ان میں پہنچ کر اپنا کام شروع کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دستوں نے سالونیکا پہنچ کر مناستر جانے سے انکار کردیا، بقیہ دستے مناستر روانہ کردیے گئے، ان کے ساتھ وہ افسر جو سالونیکا کی خفیہ کمیٹی کے کارکن تھے شربت بیچنے والوں اور ملاؤں کے لباس میں مناستر گئے اور وہاں اپنی کوششوں سے تحریکِ انقلاب کے حامیوں کی تعداد روز بروز بڑھانے لگے، چنانچہ یہ بات جلد واضح ہوگئی کہ اناطولیہ کی فوج کے اکثر افسر اور سپاہی مقدونیا کے فوجی دستوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان پر گولی چلانے کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہوں گے، نہ صرف یہ بلکہ اناطولیہ کے دستوں نے مناستر پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد ''انجمن اتحاد و ترقی'' کی

وفاداری کا حلف بھی لے لیا۔

جولائی کے تیسرے ہفتہ کی حالت یہ تھی کہ مقدونیا میں سلطان کی فرماں روائی اب بھی برائے نام قایم تھی لیکن حکومت کا اقتدار کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا، خاص فوجی مرکز مناستر میں فوج کی کمان مارشل عثمان فیضی پاشا کے ہاتھ میں تھی جو شمسی پاشا کے قتل کے بعد اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن وہ اپنے سپاہیوں کا رنگ دیکھ کر کوئی فیصلہ کن قدم بڑھانے میں تامل کرتے تھے، مقدونیا اور ادرنہ کے فوجی دستے نیز وہ دستے جو اناطولیہ سے لائے گئے تھے یا تو انجمن کے طرفدار تھے یا حکومت کی وفاداری میں متزلزل، اس کی توقع نہ تھی کہ سپاہیوں کا بڑا حصہ قصر یلدیز کا اقتدار قایم رکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں پر گولی چلائے گا، بلغاری کسان جن کو انجمن نے اسلحہ دے دئے تھے عام بغاوت میں حصہ لینے کے لیے صرف حکم کے منتظر تھے اور دس ہزار البانی جنگجو استبداد کے حامیوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھے۔

مناستر پر قبضہ: سلطان نے دیکھا کہ سختی سے کام نہیں چلتا تو اب نرمی کا اظہار شروع کیا، چنانچہ ایک بڑی رقم قرض لے کر سالونیکا بھیجی گئی کہ فوج کی تنخواہ جو مدت سے ادا نہیں کی گئی تھی فوراً دے دی جائے اور مقدونیا کے وہ اڑتالیس فوجی افسر جو ۸/ جولائی کو گرفتار کیے گئے تھے رہا کر دئے گئے، لیکن یہ تدبیر بھی بے اثر ثابت ہوئی، ۲۲/ جولائی کو نیازی بے نے ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت سے مناستر پر رات کی تاریکی میں دفعۃً قبضہ کر لیا اور عثمان پاشا کو گرفتار کر کے اوکریدا میں نظر بند کر دیا، اس کے بعد سالونیکا کمیٹی نے عثمان پاشا کی طرف سے مندرجہ ذیل تار سلطان کی خدمت میں روانہ کیا:

> ''میں فوج کے ہاتھ میں ہوں جس نے قسم کھائی ہے کہ اگر دستور فوراً عطا نہ کیا گیا تو وہ قسطنطنیہ پر حملہ کر دے گی اور میں ادب کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ میرا مقصد فوج کی قیادت کرنے کا ہے۔''

اسی روز ایک لاکھ البانیوں نے فیریزووچ (Feerezorvich) کے مقام پر

جلسہ کر کے نوجوان ترکوں کی تحریک آزادی میں شریک ہونے کو باقاعدہ اعلان کیا اور اسکوب سے براہ راست سلطان کے پاس یہ اطلاع بھیجی گئی کہ البانیوں نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا ہے۔(۱)

یلدیز کی سراسیمگی: ان خبروں کے پے در پے پہنچنے سے قصر یلدیز میں سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے، ۲۲ر جولائی کو سلطان نے فرید پاشا کو معزول کر کے اس کی جگہ کوچک سعید پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، اسی روز رات کو مجلسِ وزرا کا اجلاس ہوا جس میں بغاوتِ مقدونیا پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی، لیکن وزرا سلطان کے مزاج سے واقف ہونے کی وجہ سے اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے گریز کرتے تھے، آخر دربار کا پرانا عرب نجومی ابوالہدیٰ جو بہت ضعیف اور بیمار تھا پالکی میں لایا گیا، اس نے وہی کہا جسے زبان پر لاتے ہوئے وزرا ڈر رہے تھے یعنی تخت کو محفوظ رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بلا تاخیر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے، سلطان دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا تمام باتیں سن رہا تھا لیکن اب بھی خاموش تھا، ۲۳ر جولائی کو علی الصباح مجلس برخاست ہوئی مگر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

دستوری حکومت کا اعلان: اسی روز ''انجمن اتحاد و ترقی'' نے حلمی پاشا کو جو ولایاتِ مقدونیا کے انسپکٹر جنرل تھے یہ الٹی میٹم دیا کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کر دیا گیا تو وہ قتل کر دیے جائیں گے، ساتھ ہی انجمن کی طرف سے بذریعہ تار سلطان کو بھی اطلاع دی گئی کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کیا گیا تو انقلابی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جائیں گی، ان اطلاعات کے پہنچنے پر معاملہ کی پوری اہمیت سلطان کے سامنے آ گئی، اسے یقین ہو گیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں اور اگر انجمن کا مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو خانہ جنگی شروع ہو جائے گی، جس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا، چنانچہ ۲۳ر جولائی کو رات کے وقت جب مجلس وزرا کا اجلاس

(۱) ''مسائل مشرق وسطیٰ'' از اینگس ہملٹن ص ۳۱-۳۰

پھر منعقد ہوا اور اس میں دستوری حکومت کے اعلان پر سب نے اتفاق کیا تو سعید پاشا یہ عرض داشت لے کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ سلطان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اور مجلس وزرا کی عرض داشت پیش کرتے وقت اپنی جان کے لیے ڈر رہا تھا، لیکن سلطان اب واقعات کی منطق سے قائل ہو چکا تھا، اس نے بلا تامل اس درخواست پر اپنی منظوری تحریر کر دی۔

۲۴ر جولائی کو علی الصباح بذریعہ تار "انجمن اتحاد و ترقی" کو اطلاع دی گئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور فرمالیا، تھوڑی دیر میں پوری سلطنت میں یہ خبر پھیل گئی اور ہر طرف شادیانے بجنے لگے، خصوصاً مقدونیا میں مسرت کا ایک سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا، انور بے نے اعلان کیا کہ "استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آج سے ہم سب بھائی بھائی ہیں، اب نہ کوئی بلغاری ہے نہ یونانی، نہ رومانی ہے نہ یہودی، نہ ترک اس نیل گوں آسمان کے نیچے ہم سب برابر ہیں اور صرف عثمانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔"

دستوری حکومت کا اعلان ترکوں کے لیے خاص طور پر باعثِ مسرت تھا، سلطان عبدالحمید کے استبداد کی سختیاں زیادہ تر انہی کو جھیلنی پڑتی تھیں، عیسائی اور دوسری مسلمان قومیں نسبتاً آزاد تھیں، ترکوں پر ہر وقت ایک خوف طاری رہتا تھا، جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی، بکسٹن لکھتا ہے: "بڑے سے بڑا ترک بھی جاسوسی کی زد سے محفوظ نہ تھا اور چھوٹے سے چھوٹا سخت گیری سے، تعلیم یافتہ طبقوں میں مشکل سے کوئی گھر ایسا تھا جہاں کسی فرد خاندان کی مشتبہ موت کا ماتم یا اس کی ناگہانی جلاوطنی کی یاد تازہ نہ رہی ہو، اب یہ تمام باتیں رخصت ہو گئیں، لوگ آزادی سے سانس لینے لگے، تیس برس کے بعد پہلی مرتبہ وہ کھل کر باتیں کر سکتے تھے، پڑھ سکتے تھے، اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کر سکتے تھے، غیر ملکیوں سے مل جل سکتے تھے اور ادھر ادھر سفر کر سکتے تھے، ایک نوجوان ترک نے مجھ سے بیان کیا کہ "اب تک میں زندہ تھا ہی نہیں" (۱)

"ترکی حالت انقلاب میں" ص ۱۰۸

لیکن اس جوشِ مسرت میں بھی ترکوں نے اپنی خلقی سنجیدگی اور متانت برابر قایم رکھی، مسٹر نائٹ جو اس انقلاب کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں موجود تھے بیان کرتے ہیں: ''قسطنطنیہ نے اپنے انقلاب کی پذیرائی دانشمندانہ طریقہ پر کی، تمام پرانی بندشیں ٹوٹ چکی تھیں، لیکن آزادی نے مطلق العنانی کی صورت نہیں اختیار کی تھی، مطبوعات کا احتساب گو اب نہیں رہ گیا تھا، تاہم ترکی پریس اپنے لب ولہجہ میں باوقار اعتدال برت رہا تھا، دارالسلطنت میں بھیڑ کی بھیڑ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتی تھی لیکن نہ کوئی نقضِ امن تھا نہ پولیس یا فوج کی ضرورت تھی، علاوہ اس موقع کے جب یونانیوں نے انتخابات کے دوران میں مظاہرے کیے، یہ لوگ اس وقت تک خوش نہیں رہ سکتے جب تک کوئی حقیقی یا خیالی شکایت شور وغل مچانے کے لیے انھیں حاصل نہ ہو۔''(۱)

خط ہمایوں یکم اگست ۱۹۰۸ء: دستوری حکومت کے اعلان کے ایک ہفتہ بعد یکم اگست ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید نے ایک فرمان شایع کیا، جس میں مندرجہ ذیل امور کی تصریح کی گئی۔

(۱) تمام عثمانی رعایا کو بغیر کسی نسلی امتیاز کے ذاتی آزادی حاصل ہوگی اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے سب برابر ہوں گے۔

(۲) قانونی وجوہ کے بغیر کسی شخص سے نہ جواب طلب کیا جائے گا نہ اسے گرفتار یا قید کیا جائے گا نہ کسی طریقہ پر سزا دی جائے گی۔

(۳) غیر معمولی عدالتیں بند کردی جائیں گی اور عدالتِ مجاز کے شعبہ سے باہر کوئی شخص قانوناً طلب نہ کیا جائے گا۔

(۴) قانونی صورت کے علاوہ کسی شخص کے مکان میں داخل ہونے یا اس کے مکان کی نگرانی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) حکومت کے عہدہ دار بڑے ہوں یا چھوٹے کسی شخص کو قتل کی سزا نہ دیں

---

(۱) بیداری ترکی ص ۲۲۳

گے، بجز اس صورت کے جس کی تصریح قانون نے کردی ہو۔

(۶) سلطان کی تمام رعایا کو حق حاصل ہوگا کہ جہاں چاہے بودوباش اختیار کرے اور جس سے چاہے میل جول رکھے۔

(۷) پریس کا احتساب منسوخ کردیا جائے گا، خطوط واخبارات راستہ میں روکے نہ جائیں گے، پریس کے جرائم کی تفتیش معمولی عدالتوں میں ہوگی۔

(۸) تعلیم بلا معاوضہ ہوگی۔

(۹) حکومت کے عہدہ دار قانون کے ذمہ دار ہوں گے اور خلاف قانون احکام کی تعمیل پر مجبور نہ کیے جائیں گے۔

(۱۰) شیخ الاسلام، وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کے سوا تمام وزیروں کا انتخاب صدر اعظم کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ منظوری کے لیے ان کے نام سلطان کی خدمت میں پیش کرے گا، صدر اعظم ہی سفارت خانہ کے عہدہ داروں، والیوں اور کونسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کو بھی منتخب کرے گا اور اس انتخاب میں وزیر خارجہ، وزیر داخلہ اور پریزیڈنٹ کونسل آف اسٹیٹ کی منظوری حاصل کرے گا، جہاں تک کہ ان سے تعلق ہوگا۔

دفعات (۱۱و۱۲) میں وہ فرائض مذکور تھے جن کا تعلق صوبوں کے عہدہ داروں سے تھا

دفعہ (۱۳) میزانیہ (بجٹ) سے متعلق تھا اور اس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ بجٹ ہر سال کے شروع میں شایع کردیا جائے گا۔

(۱۴) وزارتوں اور ولایتوں سے متعلق مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے کے بعد موجودہ ضروریات کے لحاظ سے ان میں ترمیم کرنے کے لیے تجویزیں مرتب کی جائیں گی تاکہ جب عنقریب مجلس نائبین کا اجلاس ہو تو وہ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

(۱۵) فوج کو ترقی دی جائے اور اسلحہ میں اصلاحات جاری کی جائیں۔(۱)

ایک اعتراض: نوجوان ترکوں نے ''خط ہمایوں'' کی دفعہ (۱۰) پر یہ اعتراض کیا کہ

(۱) ''مسائل مشرق وسطیٰ''، ص۴۴-۴۲

شیخ الاسلام وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کا انتخاب سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا، حالاں کہ ۱۸۷۶ء کے دستور اساسی کے مطابق ان کا تقرر بھی صدر اعظم کے حقوق میں داخل تھا، چنانچہ اسی بنا پر شیخ الاسلام جمال الدین آفندی نے ۲/اگست کو اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا، اس کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں کا ایک وفد صدر اعظم سعید پاشا کے پاس آیا اور اسے دفعہ زیر بحث کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے بتایا کہ جنگ و بحریہ کے محکمے جن کے افسرانِ اعلیٰ کا تقرر سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اصلاح کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، اس الزام کے بعد سعید پاشا نے صدارت سے علاحدہ ہو جانا مناسب خیال کیا، اور ۵/اگست کو استعفا دے دیا، ساتھ ہی وزارت کے دوسرے ارکان بھی مستعفی ہو گئے، ۶/اگست کو سلطان نے کامل پاشا کو جو ایک معمر اور آزمودہ کار مدبر تھا اور اس سے قبل کئی بار صدر اعظم رہ چکا تھا، سعید پاشا کی جگہ مقرر کر کے ایک نئی وزارت قایم کرنے کا حکم دیا اور دوسرے وزیروں کی طرح وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کے انتخاب کا اختیار بھی صدر اعظم ہی کو دے دیا، کامل پاشا نے اپنی کابینہ میں ایک یونانی اور ایک آرمینی وزیر کو بھی داخل کیا۔

نئی وزارت: نئی وزارت نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کر دیا اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی، ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد رعایا کے دلوں میں قایم ہو گیا، ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے ارکان میں بہت کم ایسے تھے جن کو نظم و نسق، فن سفارت (ڈپلومیسی) یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف بھی تھے، چنانچہ اس پر نظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنی جگہ پر برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا، البتہ ان عہدہ داروں کو جو دشت خواری میں مشہور تھے برطرف کر دیا، جو لوگ برقرار رکھے گئے ان کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر وہ دستور اساسی کے خلاف کچھ بھی کرتے تو فوراً علاحدہ کر دئے جاتے تھے، چوں کہ یہ عہدہ دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ

تھے، اس لیے انجمن کو ان سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، اس درمیان میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دے کر حکومت کے مختلف محکموں کے لیے تیار کر رہی تھی، نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھا دیا، انھوں نے دولِ عظمیٰ کو لکھا کہ مقدونیا میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں، چنانچہ یوروپین افسر واپس بلا لیے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخاست کر دیا گیا۔

دستور اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیانی چار مہینوں میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' سلطنت کی حقیقی فرماں روا تھی، یہ جو احکام چاہتی سلطان سے صادر کراتی، فوجوں کی نقل و حرکت تمام تر اسی کے ہاتھ میں تھی، وزرا، صوبوں کے گورنر اور دوسرے اعلیٰ عہدہ دار اسی کے حکم سے مقرر یا معزول ہوتے تھے، مسٹر نائٹ لکھتے ہیں کہ ''انجمن کے ان ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام کو بروے کار لانے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے میں جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی ایسی دانشمندی، موقع شناسی، میانہ روی، فراست اور پیش بینی دکھائی کہ غیر ملکی اشخاص ان کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے امن و امان کو مضبوطی کے ساتھ قایم رکھا اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبط نفس اور حب وطن سے انھیں بڑی مدد ملی، اگر چہ وہ خود اور ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارت گری کا شکار رہ چکے تھے پھر بھی ان کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا، انھوں نے صرف ان لوگوں کو سزائیں دیں جن کے جرائم نہایت سخت تھے، انھی لوگوں کو برطرف کیا جنھوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دستور اساسی کے لیے خطرہ کا باعث ہیں، باقی سب کو صاف دلی سے معاف کر دیا، بیرونی طاقتوں سے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قایم کیے گئے، ان سے غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہوئیں۔''(۱)

(۱) بیداری ترکی ص ۲۴۴-۲۴۳

انجمن اتحاد پر یورپ کا پہلا وار: لیکن نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آز کو کم نہ کر سکی، جو دولت علیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں، دستوری اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر اس کے دو صوبے بوسنیا اور ہرزی گووینا جو تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے، حکومت آسٹریا ان صوبوں کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی، چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسنیا اور ہرزی گووینا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں تو آسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتی اور ''انجمن اتحاد و ترقی'' ایک طاقتور سلطنت سے الجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی، ۷/اکتوبر ۱۹۰۸ء کو دفعۃً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر نائٹ لکھتے ہیں: ''یہ وہی پرانا قصہ تھا یعنی ایک رفعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ ایک اصلاح شدہ ترکی کہیں ایک طاقتور ترکی نہ بن جائے، فریب کے ذریعہ سے اس کی راہِ ترقی میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی، آسٹریا کے اس فعل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظامِ حکومت کے از سر نو قایم کرنے کا آخری موقع بہم پہنچایا اور انھوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا''(۱) بوسنیا اور ہرزی گووینا کے الحاق سے دو ہی روز قبل مشرقی رومیلیا کے والی نے جو بلغاریا کا فرماں روا تھا، زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا تھا، پھر ۱۲/اکتوبر کو کریٹ نے بھی مملکت یونان سے اپنے الحاق کا اعلان کر دیا۔

انجمن کا سیاسی پروگرام: اس درمیان میں مجلس ملی (پارلیمنٹ) کے انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سلطنت کے ہر حصہ میں دستوری حکومت کے استقبال کے لیے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا تھا، انجمن اتحاد و ترقی نے ۲۳/ستمبر کو اپنا سیاسی پروگرام

(۱) بیداری ترکی ص ۲۶۱

شایع کیا جس کی پابندی انجمن کے امیدواروں پر جو منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں جائیں عاید کی گئی، اس پروگرام کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں:

(۱) کابینہ کو مجلس نائبین (Chamber of Deputies) کا جواب دہ ہونا چاہیے۔

(۲) ترکی زبان بدستور سلطنت کی سرکاری زبان رہے گی۔

(۳) تمام قوموں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

(۴) غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے ذمہ دار ہوں گے۔

(۵) فوجی خدمت کی میعاد میں تخفیف کردی جائے گی۔

(۶) جن کسانوں کے پاس زمینیں نہیں ہیں انھیں زمینوں کے حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی مگر اس طرح کہ موجودہ زمینداروں کو نقصان نہ پہنچے۔

(۷) تعلیم بلا معاوضہ اور جبری ہوگی۔(۱)

پارلیمنٹ کا افتتاح: ۱۰ ردسمبر ۱۹۰۸ء کو سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں دستور کے تحفظ کا وعدہ کیا، مجلس نائبین میں عیسائی اور دوسری محکوم قوموں کے نمایندے بہت کافی تعداد میں منتخب ہو کر آئے تھے، ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا، وہ انگلستان کے مدبروں کے لیے خلافِ توقع ثابت ہوئی، سلطنتِ عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہ تھے، ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کردیا۔

جوابی انقلاب: نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت کو کامیاب بنانے کی انتہائی کوشش کی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد رجعت پسندوں کی سازشیں رنگ لانے لگیں، انجمن اتحاد و ترقی نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جاسوسوں کی زبردست فوج کو جس پر بارہ لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتے تھے یک قلم برخاست کردیا جس سے ہزاروں آدمی دفعۃً بے روزگار ہوگئے، یہ لوگ قدرتی طور پر انجمن کی مخالفت میں کوشاں تھے، علاوہ بریں نئی وزارت

---

(۱) بیداری ترکی ص ۲۹۳-۲۹۲

نے مختلف شعبوں کی اصلاح کے سلسلہ میں سیکڑوں آدمیوں کو جو محض قصر یلدیز کے زیر اثر مقرر کر دیے گئے تھے اور حقیقتاً بے ضرورت اور بے کار تھے نکال دیا تھا، انھوں نے بھی انجمن کی مخالفت پر کمر باندھ لی، ان کو رجعت پسند ملاؤں کی تائید حاصل تھی، ''جمعیۃ محمدیہ'' کے نام سے ایک نئی انجمن چند دنوں سے قایم کر لی گئی تھی، جس کا اثر مسلمانوں میں روز بروز زیادہ پھیلتا جاتا تھا، یہ جمعیۃ اپنے کو دستوری حکومت کا حامی ظاہر کرتی تھی لیکن وہ تمام امور میں صرف شریعتِ اسلامی کا نفاذ چاہتی تھی اور اصولِ شریعت کے خلاف کسی قانون کو گوارا نہیں کرتی تھی، یہ انجمن اتحاد وترقی کی اس بنا پر مخالف تھی کہ اس کے نزدیک انجمن کے ممبر جن میں فوج کے نوجوان افسر بھی شامل تھے، احکامِ قرآنی کے پابند نہ تھے اور اپنے غیر مذہبی طریقوں سے عوام کے لیے ایک بری مثال قایم کر رہے تھے، ایک طاقتور جماعت لبرل یونین کی تھی، جس میں مسلمان، عیسائی اور دوسرے فرقوں کے لوگ شامل تھے، اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر فرقہ کو حکومت خود اختیاری کے حقوق دے دیے جائیں کہ وہ جس طرح چاہے اپنے معاملات کا انتظام کرے، نوجوان ترک جن کا اصلی نصب العین اتحاد تھا، لبرل یونین کے نظریہ کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، ''انجمن اتحاد وترقی'' کے مخالفوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا، جن کو حقیقتاً نہ مذہب سے سروکار تھا نہ ملکی فلاح و بہبود سے بلکہ وہ دستوری حکومت کے اس وجہ سے دشمن تھے کہ اس میں ان کو رشوت ستانی اور مفت خوری کے وہ مواقع حاصل نہ تھے جن سے دورِ استبداد میں وہ پورا فائدہ اٹھا رہے تھے، نئی وزارت نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ نہ صرف ان سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا، جو سلطان کے حکم سے قید کیے گئے تھے بلکہ دوسرے شدید جرائم کے مجرموں کو بھی چھوڑ دیا تھا، یہ جرائم پیشہ گروہ رجعت پسندوں کے لیے ایک اچھا آلۂ کار ثابت ہوا۔

غرض مخالف عناصر تیزی کے ساتھ جمع ہو رہے تھے، انجمن اتحاد وترقی کو فوج پر پورا اتحاد تھا مگر رجعت پسندوں کی خفیہ کوششوں سے وہ بھی قدیم نظامِ حکومت کی حامی بن چکی تھی، انجمن کو اس کا علم اس وقت ہوا جب ۱۳/اپریل ۱۹۰۹ء کو قسطنطنیہ کے فوجی دستوں

میں دفعۃً بغاوت برپا ہوگئی، باغیوں میں کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو خاص شہرت یا اثر رکھتا ہو، سلطان عبدالحمید نے اس شورش میں بظاہر کوئی حصہ نہ لیا، تاہم ابتدا میں باغی کامیاب رہے، وزیروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور انجمن اتحاد و ترقی کے دوسرے ممبروں کو اپنی جان کی خاطر قسطنطنیہ سے بھاگنا پڑا، فوج نے پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کرلیا اور اپنے متعدد افسروں کو جو انجمن کے ممبر تھے قتل کر دیا، وزیر عدالت بھی قتل کر دیا گیا، وزیر بحریہ پر بھی گولی چلی مگر وہ زخمی ہو کر بچ گیا، اس کے علاوہ نوجوان ترکوں کی ایک بڑی تعداد ماری گئی، انجمن کے دشمنوں نے اس بغاوت کو گہرا مذہبی رنگ دے دیا تھا، خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ ''یہ بڑی خونریز اور ناپاک شورش تھی، بہت سے نوجوان محض اس لیے قتل کر دیے گئے کہ وہ کالر لگاتے تھے، کالر مذہب کی شدید مخالفت سمجھا جاتا تھا۔''

بغاوت کا استیصال: بغاوت کی خبر جب سالونیکا پہنچی تو انجمن اتحاد و ترقی نے فوراً محمود شوکت پاشا کو جو افواجِ مقدونیا کے سپہ سالار تھے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا، سان اسٹیفانو کے مقام پر محمود شوکت کی ان وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقات ہوئی، جو قسطنطنیہ سے بھاگ کر آئے تھے، وہیں پارلیمنٹ کا اجلاس کیا گیا اور ممبروں نے متفقہ طور پر محمود شوکت پاشا کی یہ تجویزیں منظور کیں کہ فوجی قانون جاری کر دیا جائے، باغیوں کو سزائیں دی جائیں اور قسطنطنیہ کا فوجی دستہ توڑ دیا جائے، ۲۵ر اپریل کو محمود شوکت پاشا اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوئے، پانچ گھنٹے کی سخت لڑائی کے بعد جس میں توپیں بھی چلیں، باغی فوج مغلوب ہوئی، بغاوت کے بانیوں کو سخت سزائیں ملیں، ان کے چالیس بڑے بڑے لیڈروں کو منظر عام پر پھانسی دے دی گئی۔

سلطان کی معزولی: ۲۷ر اپریل کو مجلس ملی کا اجلاس منعقد ہوا اور سب سے پہلے اس کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ سلطان کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے، رائے عامہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس بغاوت میں در پردہ سلطان کی حمایت بھی شامل تھی، گو بظاہر اس نے باغیوں کو کسی طرح کی مدد نہیں دی تھی، شیخ الاسلام سے استفتا کیا گیا، اس نے معزولی کا فتویٰ دیا،

اس فتوے کے بعد مجلس ملی نے بالاتفاق سلطان کی معزولی کی تجویز منظور کر لی اور اپنے فیصلہ کی اطلاع دینے کے لیے ایک وفد قصر یلدیز کو روانہ کیا، جوابی انقلاب کی ناکامی کے بعد سلطان انجمن اتحاد وترقی کے رحم وکرم پر تھا، اس نے مجلس ملی کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور خاموشی کے ساتھ تخت سے علاحدہ ہو گیا، دوسرے روز وہ سالونیکا روانہ کر دیا گیا اور وہاں ۱۹۱۸ء میں اپنی وفات تک نظر بند رہا، مجلس ملی نے اس کے بھائی شہزادہ محمد رشاد کو جو تیس سال سے نظر بندی کی زندگی بسر کر رہا تھا محمد خامس کے نام سے تخت پر بٹھایا۔

نوجوان ترک

دستوری حکومت کے پہلے دو مہینے عثمانی تاریخ میں یادگار رہیں گے، یہ وہ دور تھا جب سلطنت عثمانیہ کی تمام قومیں صرف ایک نصب العین رکھتی تھیں اور ان کے دل اتحاد واخوت کے جذبات سے سرشار تھے، خالدہ ادیب خانم اپنے خطبات میں لکھتی ہیں:

''جس شخص نے ترکی کا وہ زمانہ دیکھا ہے اسے یاد کر کے بے چین ہو جاتا ہے، اس میں انقلابِ فرانس کی سرمستیاں موجود تھیں مگر وہ خونریزیاں نہ تھیں، لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے بجائے فرطِ محبت سے گلے ملتے تھے''(۱) لیکن اخوت ومحبت کا یہ جوش جلد ٹھنڈا ہو گیا اور جب نوجوان ترکوں نے مختلف قوموں کو باہم متحد کر کے ایک عثمانی قوم کی تشکیل کرنی چاہی تو افتراق کے آثار پھر نمایاں ہونے لگے۔

اندرونی مخالفتیں، عیسائی: مخالفت سب سے پہلے عیسائیوں کی طرف سے شروع ہوئی، جدید دستور نے انھیں شہریت کے وہ تمام حقوق دے دئے تھے جو ترکوں کو حاصل تھے اور وہ ان حقوق سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش یہ تھی کہ شہریت کے ساتھ جو فرائض وابستہ ہیں ان سے بچتے رہیں، چنانچہ حکومت کی طرف سے فوجی خدمت عیسائیوں پر بھی عاید کی گئی جو صدیوں سے اس سے مستثنیٰ تھے تو ارباب کلیسا نے صدائے احتجاج بلند کی، ایک متحدہ قومیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر انجمن اتحاد وترقی نے ابتدائی مدارس میں ترکی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی تھی، پادریوں نے

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۷۵

اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا کہ عیسائی بجبر ترک بنائے جا رہے ہیں، اصل یہ ہے کہ انقلاب کی سرمستیوں میں نوجوان ترک عیسائیوں کے حقیقی جذبات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے، وہ اس جوش سے متاثر ہو گئے جو دفعۃً انقلاب کے افسوں سے سلطنت کی تمام قوموں میں پھیل گیا تھا، انھوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ مقدونیا کی عیسائی رعایا میں قومیت کا جذبہ بڑی حد تک پیدا ہو چکا ہے اور یونانی، سروی، بلغاری ہر جماعت میں قومی حکومت قایم کرنے کا حوصلہ پوری طرح موجود ہے، مقدونیا کے سرحدی علاقے جو پہلے سلطنت عثمانیہ کے صوبے تھے اور بتدریج خودمختار ہوتے گئے تھے، ان قوموں کو دولت علیہ کے خلاف برابر ابھارتے رہتے تھے، نہ صرف یہ بلکہ یونان، سرویا اور بلغاریا میں سے ہر ایک مقدونیا کے ان حصوں کو جن میں اس کے ہم قوم آباد تھے اپنی مملکت میں شامل کر لینا چاہتا تھا، انقلاب سے پہلے مقدونیا کی ساری بدامنی انہی حکومتوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی، غرض دستوری حکومت کے قیام کے چند ہی ہفتوں بعد عیسائیوں نے ازسرنو شورش برپا کر دی اور بلقان کی خودمختار ریاستوں نے انھیں مدد پہنچانی شروع کی۔

غیر ترک مسلمان: عیسائیوں کے علاوہ غیر ترک مسلمان مثلاً عرب، البانی، کرد وغیرہ بھی انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت کے خلاف تھے، ان میں بھی اپنی انفرادی قومیت کا قوی احساس موجود تھا اور وہ متحدہ عثمانی قومیت میں ضم ہونے کے لیے تیار نہ تھے، علاوہ بریں چونکہ سلطان سے انھیں بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں اور وہ محصولوں اور فوجی خدمتوں سے بری تھے، اس لیے نئی حکومت کی پالیسی جو سلطنت کی تمام قوموں کو ایک سطح پر رکھنا چاہتی تھی اور حقوق و فرائض میں کوئی تفریق جائز نہیں رکھتی تھی، ان کو نہایت گراں تھی، مخصوص رعایتوں اور شاہانہ عطیوں کی وجہ سے ان کو جو وابستگی تھی وہ سلطان کی ذات سے تھی، چونکہ نئی حکومت نے سلطان کے اختیارات بہت محدود کر دیے تھے اس لیے یہ رعایتیں اور عطیے جاری نہیں رہ سکتے تھے، قدرتاً یہ لوگ حکومت کے مخالف ہو گئے، ذاتی اغراض کی سطح سے بلند ہو کر متحدہ قومیت کے مسئلہ پر نظر کرنے کی اہلیت ان میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

ترک: خود ترکوں میں بھی ایک بڑی تعداد نئی حکومت کی مخالف تھی، ان کا قدامت پسند طبقہ نوجوان ترکوں کی مغربی روش سے بیزار تھا، مذہبی جماعت کی ترجمانی جمعیۃ محمد کررہی تھی، جاسوسوں کا گروہ جو انقلاب کے بعد بے روزگاری اور ذلت میں مبتلا ہوگیا تھا، انجمن اتحاد وترقی کا دلی دشمن تھا اور یہ ہراس جماعت کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا جو انجمن کی مخالفت میں قایم کی جائے، یہی حال ان سیکڑوں عہدہ داروں کا تھا جو دستوری حکومت کے قیام کے بعد بے کار محض ہونے کی وجہ سے برطرف کردیے گئے تھے، جوابی انقلاب ان سب جماعتوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا، محمود شوکت پاشا نے باغیوں کو سزائیں دے کر اس شورش کو فرو کردیا تھا لیکن مخالفت کے عناصر اب بھی موجود تھے اور نئی حکومت کو گوناگوں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔

بیرونی دشمن: اندرونی مخالفتوں اور سرحدی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں کے علاوہ انجمن اتحاد وترقی کو دولِ عظمیٰ کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا، ان میں انگلستان کا طرزِ عمل سب سے زیادہ معاندانہ تھا، انگلستان کے اخباروں نے نئی حکومت کے خلاف زبردست پروپگنڈا شروع کردیا، حالاں کہ انقلاب سے پہلے تمام مغربی پریس عبدالحمید کی مخالفت اور دستوری حکومت کی تائید میں یک زبان تھا، خالدہ ادیب خانم نے آبرے ہربرٹ کی یہ رائے نقل کی ہے کہ انگلستان کی حریت پسند جماعت اصلاحات کو پسند کرتی ہے مگر اسے انقلاب سے نفرت ہے، وہ لکھتا ہے: ''نوجوان ترکوں کی مخالفت میں اتنی قوتیں جمع ہوگئی تھیں کہ اگر ان کے لیڈران بلند اصولوں پر جن کے وہ مدعی تھے استقلال کے ساتھ عمل بھی کرتے، تب بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ترکی کی تجدید کی کوشش میں کامیاب ہوں گے، یورپ ترکی کو اپنے دست نگر کی حیثیت سے پسند کرتا تھا، مدمقابل کی حیثیت سے نہیں۔''(۱)

روس اور آسٹریا کی اسکیم: مغربی حکومتوں کی روش سے آبرے ہربرٹ کی رائے کی

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۸۰

تصدیق پوری طرح ہوتی ہے، نوجوان ترکوں کے جوشِ عمل سے ان حکومتوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں کہیں اتنی قوت پھر نہ پیدا ہو جائے کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے یوں ہی رہ جائیں، چنانچہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو روس اور آسٹریا کے وزرائے خارجہ نے مل کر ایک اسکیم مرتب کی جس کے رو سے دردانیال اور آبنائے باسفورس روسی منطقہ میں رکھے گئے اور بلغاریا روسی حلقۂ اثر میں داخل کیا گیا، مقدونیا آسٹریا کے منطقہ میں رکھا گیا اور سرویا آسٹریا کے حلقۂ اثر میں داخل کیا گیا، البانیا اطالوی منطقہ میں رکھا گیا اور یونان اطالوی حلقۂ اثر میں داخل کیا گیا (۱)، اس اسکیم کا عملی نتیجہ چند ہی دنوں کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ ۵ر اکتوبر کو پرنس فرڈینینڈ نے جو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت اپنے ملک کا حکمراں تھا کامل خودمختاری کا اعلان کر کے زار بلغاریا کا قدیم لقب اختیار کر لیا، اس کے دو روز بعد ۷ر اکتوبر کو آسٹریا ہنگری نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے پھر ۱۲ر اکتوبر کو کریٹ کی مجلس ملی نے یونان سے الحاق کی قرارداد منظور کر کے اس کا اعلان کر دیا۔

بلغاریا: معاہدۂ برلن کے رو سے بلغاریا دولت عثمانیہ کی ایک باج گذار مملکت تھی اور اس کے حکمرانوں کا تقرر سلطان کی نامزدگی سے عمل میں آتا تھا لیکن حقیقتاً بلغاریا کی خودمختاری ایک امر واقعہ بن چکی تھی اور ارباب اتحاد و ترقی کو امید نہ تھی کہ وہ اسے دوبارہ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں لا سکیں گے، انھوں نے حالات کا اندازہ کر کے یہی مناسب خیال کیا کہ معاوضہ لے کر حقوقِ سیادت سے دست بردار ہو جائیں، باب عالی کی طرف سے جس رقم کا مطالبہ کیا گیا بلغاریا اسے دینے پر راضی نہ تھا، لیکن روس نے جو بلغاریا کو اپنے سایہ عاطفت میں لے چکا تھا، اپنے مطالبہ کی رقم سے جو اس کے نزدیک بطور سابق تاوانِ جنگ سلطنت عثمانیہ کے ذمہ واجب الادا تھی، وہ رقم محسوب کر دی جس پر آ کر معاملہ رک گیا تھا اور فریقین میں صلح کرا دی، چنانچہ اپریل ۱۹۰۹ء میں باب عالی اور

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، چودھواں اڈیشن ج ۲۲ ص ۶۱۲

بلغاریا کے درمیان صلح نامہ پر دستخط ہو گئے اور سلطان نے بلغاریا کے کامل حقوقِ فرماں روائی تسلیم کر لیے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا: بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے برلن میں آسٹریا ہنگری کے سپرد کیے گئے تھے، لیکن انھیں سلطنت میں شامل کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی، تیس برس سے عملاً وہ آسٹریا ہنگری کے زیر حکومت تھے جب تک عنانِ حکومت سلطان عبدالحمید کے ہاتھ میں رہی، یورپ کی تمام وزارتیں اس کی سیاسی چالوں سے خائف رہتی تھیں، چنانچہ اتنے طویل قبضہ کے بعد بھی آسٹریا ہنگری نے ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی جرأت نہیں کی، لیکن جب نوجوان ترک برسرِ اقتدار ہوئے اور خود ترکی کے اندر مخالفتوں کا زور شروع ہوا تو آسٹریا ہنگری نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر دونوں صوبوں کو بے تکلف اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، بابِ عالی نے سخت احتجاج کیا لیکن چونکہ فوجی قوت کافی نہ تھی، اس لیے بالآخر صلح کر لینی پڑی، آسٹریا ہنگری نے بائیس لاکھ پونڈ نقد معاوضہ کے علاوہ نووی بازار کا علاقہ ترکوں کے حق میں واگذار کر دیا، جس پر ۱۸۷۸ء کے بعد سے اب تک اس کا فوجی قبضہ چلا آتا تھا۔

طرابلس: ان دست درازیوں کا سلسلہ یہیں تک ختم نہ ہوا، انیسویں صدی کا زمانہ یورپ کے صنعتی انقلاب کا زمانہ تھا اور صنعت و حرفت کی ترقی نے ملکی مصنوعات کے لیے نئے بازاروں کی ضرورت پیدا کر دی تھی، افریقہ کی ساحلی حکومتیں جو پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھیں لیکن بعد میں سلطنت کی کمزوری سے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتی گئیں، اس مقصد کے لیے مغربی حکومتوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں، چنانچہ فرانس نے الجزائر اور تونس پر قبضہ کر لیا اور انگلستان نے مصر میں اپنا تسلط قائم کیا، ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ انگلستان مصر پر بلا شرکت غیرے قابض رہے گا اور اس کے معاوضہ میں فرانس کو مراکش کی مملکت پر جو اس وقت تک آزاد تھی قبضہ کرنے میں مدد دے گا، اب افریقہ کی ساحلی حکومتوں میں صرف طرابلس

رہ گیا تھا جو مغربی طاقت کے پنجہ میں نہیں آیا تھا، اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ طرابلس ایک ریگستانی علاقہ تھا، جس میں کہیں کہیں نخلستان نظر آجاتے تھے، اس کے ساحل پر کوئی بندرگاہ نہ تھی اور اس پر حکومت کرنے میں جو مصارف برداشت کرنے پڑتے ان کے معاوضہ کی کچھ زیادہ توقع نہ تھی یہی سبب تھا کہ فرانس اور انگلستان نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں کی، لیکن اٹلی جو نو آبادیات کے میدان میں ان دونوں سلطنتوں سے بہت پیچھے تھا اور ۱۸۸۱ء میں تونس پر فرانس کو قبضہ کرتے ہوئے دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا، اس کی نظر میں طرابلس ہی غنیمت معلوم ہوا، چنانچہ اطالوی وزارتِ خارجہ نے سلطان عبدالحمید کے عہد ہی میں یورپین حکومتوں سے یہ تسلیم کرالیا تھا کہ جب سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات تقسیم ہونے لگیں گے تو طرابلس اٹلی کو دے دیا جائے گا، اس باب میں اٹلی نے متعدد معاہدوں کی بنا پر اپنا حق یہاں تک تسلیم کرالیا تھا کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب عثمانی کے وقت تمام یوروپین طاقتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسے جس وقت موقع ملے گا وہ فوراً طرابلس پر قبضہ کرلے گا اور یورپ کی کوئی حکومت اعتراض نہ کرے گی۔ (۱)

بیسویں صدی کے آغاز میں طرابلس سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا اور براہِ راست باب عالی کے زیر حکومت تھا، اس کو حکومت خود اختیاری کے حقوق کبھی حاصل نہ تھے جیسا کہ افریقہ کے دوسرے صوبوں نے حاصل کرلیے تھے، اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل تھی، شہر طرابلس اور دوسرے ساحلی مقامات پر ترک اور مور آباد تھے اور اندرونی علاقوں میں نیم آزاد عرب قبائل تھے، یہاں کے باشندوں نے حکومت کی تبدیلی کی کبھی خواہش نہیں کی اور اٹلی کو ان کی طرف سے کسی شکایت کا موقع نہیں ملا، لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے ترکوں کی حمایت میں ایک لفظ بھی مشکل سے نکلتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ ''طرابلس پر اٹلی کا حملہ تمام تر ایک جارحانہ فعل تھا، جس کی تحریک اس وجہ سے ہوئی کہ فرانس نے تونس پر قبضہ کرلیا تھا، جس پر جغرافیائی اور معاشیاتی دونوں

(۱) شیویل ص ۴۶۸

حیثیتوں سے اٹلی کا حق زیادہ مضبوط تھا، لیکن جمہوریہ فرانس اور برطانیہ عظمیٰ اٹلی کے اس فعل سے متفق ہوگئیں اور (یورپ کی) دونوں مرکزی سلطنتیں بھی اس وقت تک اٹلی کی حلیف تھیں۔''(۱)

جنگ طرابلس: ۱۹۱۰ء کے اختتام تک حکومت اٹلی برابر یہ اعلان کرتی آئی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کے کسی حصہ کی خواہش مند نہیں ہے، جب یہ افواہ پھیلی کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے وزیر خارجہ نے ۲؍دسمبر ۱۹۱۰ء کو اطالوی پارلیمنٹ میں اس کی پرزور تردید کی اور کہا کہ ''ہم سلطنت عثمانیہ کی بقاوسلامتی کے خواہش مند ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ طرابلس ہمیشہ ترکوں کے قبضہ میں رہے۔'' لیکن اس اعلان پر دس مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ حکومت اٹلی نے دفعۃً باب عالی کو الٹی میٹم دے دیا حالانکہ اس درمیان میں فریقین کے تعلقات میں مطلق کشیدگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور جواب کا انتظار کیے بغیر پچاس ہزار فوج طرابلس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کردی، اس کے جنگی جہازوں نے پریویسا کے شہر پر گولہ باری شروع کردی جو بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر ترکوں کا مقبوضہ تھا اور بحر ایجین کے متعدد جزیروں پر قبضہ کرلیا، ترکی جہازوں نے دردانیال میں پناہ لی''، اٹلی کے مقابلہ میں ترکی جہازوں کی حیرت انگیز شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد حکومت میں بحریہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی اور چونکہ ۱۸۷۶ء کے بعد سے کسی بحری طاقت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے مدت سے ترکی جہاز شاخ زریں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے، اگر عبدالحمید نے بحریہ کی طرف کچھ بھی توجہ کی ہوتی تو اٹلی کا طرابلس پر قابض ہوجانا قطعاً ناممکن تھا، کیوں کہ سلطان عبدالعزیز نے عثمانی بیڑے کو اتنا طاقتور بنادیا تھا کہ وہ اُس زمانہ میں یورپ میں تیسرے نمبر پر شمار ہوتا تھا، طرابلس کے فوجی دستہ کی تعداد صرف بیس ہزار تھی، چونکہ سمندر پر اطالوی جہازوں کا قبضہ تھا، اس لیے جنگ شروع ہوجانے کے بعد بحری راستہ سے فوجی کمک بھی نہیں

(۱) ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے ص ۳۵۵

پہنچائی جاسکتی تھی، بری راستہ مصر کا تھا جو اس وقت تک سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت اور اس کا باج گذار تھا، لیکن مصر پر انگریزی تسلط قایم ہو چکا تھا اور حکومتِ برطانیہ نے ان سابق معاہدوں کی بنا پر جو طرابلس کی نسبت اٹلی سے ہو چکے تھے، مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے اس کی راہ سے ترکی فوجوں کو طرابلس جانے سے روک دیا، ان تمام مشکلات کے باوجود نوجوان ترکوں نے ایسی شجاعت سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا کہ وہ سراسیمہ ہوگئے، عرب قبائل جس جاں فروشی کے ساتھ وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لیے آخر تک لڑتے رہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی، اگرچہ بیرونی امداد کی تمام راہیں مسدود تھیں، تاہم اعلانِ جنگ کے چند ہی دنوں بعد انور بے کسی طرح پوشیدہ طور پر طرابلس پہنچ گئے تھے اور انھوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا تھا، الہلال کلکتہ نے ان کے عجیب وغریب کارناموں کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج ہے۔

انور بے: انور بے نے طرابلس میں قدم رکھنے کے بعد اطراف و جوانب کے قبائل میں دعوتِ جہاد شروع کر دی اور چند دنوں کے بعد جنود الٰہی کی عظیم الشان صفیں اس کے یمین و یسار نیزے بلند کیے ہوئے چلی آرہی تھیں، وہی تنِ تنہا فرد مقدس دشمن کے بے شمار لشکر کے سامنے حریفانہ ومساویانہ آکر کھڑا ہو گیا اور پھر پورے نو مہینوں کے اندر ایک دن بھی شکست و ہزیمت اس کے دامنِ عزت پر دھبہ نہ لگا سکی، تمام اہل عرب جن کو عثمانی خلافت کا قدیمی مخالف سمجھا جاتا تھا اوامر سلطانی کے آگے پوری اطاعت وفرماں برداری کے ساتھ جھک گئے اور آج عثمانی فوج کے مفہوم میں بلا کسی اختلاف وشبہ کے عربی افواج داخل ہیں، عربی فوج کے مرتب کرنے میں جو مشکلیں اجتماع کے بعد پیش آئیں وہ ابتدائی مشکلات سے کم نہ تھیں، سب سے پہلی مشکل مختلف قبائل کی عربی عصبیت اوران کی باہمی بغض ومخالفت تھی، جو نسلاً بعد نسلٍ قدیم سے چلی آتی ہے، انور بے نے تمام قبیلوں کو مختلف موثر اور دل میں اتر جانے والے طریقہ سے سمجھا کر (جو اس اعجاز آفریں سحر بیان کا

وصف مخصوص ہے) ان میں باہم رشتہ داریاں قایم کرادیں اور اس طرح اس دعوتِ جہاد کی بدولت صدیوں کی عداوت اور دشمنیاں عہد اخوت ومودت سے بدل گئیں، دوسری مشکل قبائل کی بے نظمی اور اصولِ جنگ سے ناواقفیت تھی، غازی انور بے نے بغیر اس کے کہ ایک لمحہ بھی فکروتردد میں ضایع کرتے فوراً تمام قبائل کو چند پلٹنوں میں تقسیم کردیا اور ہر پلٹن کی تعلیم کے لیے ایک افسر مقرر کرکے شب و روز قواعد کرانی شروع کرادی، خود عربوں نے جب معلوم کرلیا کہ بغیر ان قواعد کے سیکھے ہم دشمنوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکیں گے اور ان کی ابتدائی دست برد کا انتقام نہیں لیا جاسکے گا تو خود ان کے اندر جوش و غیرت نے ایک ایسی خارقِ عادت ذہانت اور قوتِ اخذ وتحصیل پیدا کردی کہ مہینوں کی مشق ایک چوبیس گھنٹے کے اندر حاصل کرنے لگے، قبائل کی باہمی رقابت سے بھی اس موقع پر بڑی مدد ملی، انور بے نے اعلان کردیا کہ جو قبیلہ پہلے قواعد جنگ کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوگا، اس کو عزت و ناموری کے نشان کے طور پر ایک طلا کار اطلس کا علم دیا جائے گا، یہ سنتے ہی ہر قبیلہ مسابقت کی کوشش کرنے لگا اور شب و روز پورا وقت فوجی نقل وحرکت اور قواعد کے سیکھنے اور مشق میں صرف ہونے لگا، اسی اثنا میں جب اطالویوں کی براتوں نے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور بم کے گولے بکثرت آنے لگے تو قبیلہ حسا نے ایک دم ہجوم کرکے ہلہ کردیا اور سیکڑوں اطالویوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر بقیۃ السیف کو کوسوں دور بھگا دیا، انور بے نے اس کارنامہ کی بڑی قدر کی اور اس قبیلہ کو اپنا وضع کردہ نشان عزت (اطلسی علم) عطا فرمایا، دوسرے قبائل نے جب قبیلہ حسا کے خیموں پر اس طلا کار علم کو لہراتے دیکھا تو انور بے کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم کو بھی موقع دیا جائے کہ اس علم کے لینے کا استحقاق ثابت کریں، رات کے وقت جب اٹالین کیمپ طرابلس پر قابض ہونے کی خوشی میں بکثرت شراب پی کر بدمست پڑا تھا یکایک عرب قبائل کے صحرائی نعروں کی گونج سے ایک زلزلۂ عظیم محسوس ہوا چند لمحوں کے اندر بے تحاشا بھاگ گئے اور پورا اٹالین کیمپ خالی ہوگیا، اطالویوں کے

جبن ونامردی نے اہل عرب کو ان کے اولین حملہ ہی میں فتح ونصرت کی ایسی چاٹ لگادی کہ اب میدانِ قتال ان کے لیے بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا، بغیر کسی نقصان کے انھوں نے کھیلتے کودتے ایک پوری اٹالین پلٹن برباد کردی اور بکثرت مالِ غنیمت ساتھ لیے ہوئے اور وطنی گیت گاتے ہوئے عثمانی کیمپ میں واپس آکر اپنی فتوحات ڈھیر کردیں، اس مالِ غنیمت میں آٹھ سو سے زیادہ تو بندوقیں تھیں اور اور قسم کی اشیا اس کے علاوہ، ان بندوقوں کی لوٹ سے انور بے بہت خوش ہوئے، کیوں کہ عمدہ اسلحہ کی کیمپ میں بہت کمی تھی، انور بے نے حکومت کے نام سے فوراً ان کا نیلام کردیا اور وہ دو دو عثمانی گنی پر فروخت کردی گئیں، اس خدمت کے صلہ میں ان کی آرزوے دلی کے مطابق طلا کار اطلسی علم ان کو عطا کیا گیا، اس کے بعد تو ہر قبیلہ اس علم کے لیے اٹھنے لگا اور دشمن پر برقِ ہلاکت بن کر گرنے لگا، ہر قبیلہ کی کوشش ہوتی کہ دوسروں سے زیادہ تعداد میں دشمنوں کو قتل کریں اور سب سے زیادہ مالِ غنیمت انور بے کے سامنے انبار کرسکیں، تاکہ شجاعت و وطن پرستی کا اعلیٰ سے اعلیٰ نشان اور تمغہ صرف ہمیں کو حاصل ہو، یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر عثمانی کیمپ میں پندرہ ہزار سے زیادہ قیمتی اور جدید ایجاد کی بندوقیں جمع ہوگئیں۔" (۱)

صلح نامہ لوزان: اطالوی اس صورتِ حال سے بدحواس ہوگئے، انھوں نے شجاعت کا جواب درندگی سے دینا شروع کیا اور ایسے مظالم کیے کہ خود یوروپین نامہ نگاروں نے جو اٹالین فوج کے ساتھ طرابلس میں تھے ان کے خلاف صداے احتجاج بلند کی، لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو وہ زیادہ زور بحری جنگ پر دینے لگے، چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء میں روڈس اور بعض دوسرے جزائر ایجین پر قبضہ کرلیا، انھیں توقع تھی کہ ترک اب آسانی کے ساتھ صلح کے لیے راضی ہوجائیں گے، لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے قطعی طور پر انکار کردیا، وہ اس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا عزم کرچکے تھے جب تک دشمنوں کو شکست دے کر بھگا نہ دیں، لیکن بدقسمتی سے اس درمیان میں البانیا میں بغاوت برپا ہوگئی

(۱) الہلال کلکتہ

اور پھر بلقان کے افق سے ایک متحدہ اور خوفناک جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے، ان حالات کے پیشِ نظر باب عالی نے بادلِ ناخواستہ صلح کی گفتگو شروع کی اور ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صلح نامۂ لوزان پر محاربین کے دستخط ہو گئے، طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا، اٹلی نے وعدہ کیا کہ بحرِ ایجین کے مفتوحہ جزائر دولت علیہ کو واپس کر دے گا لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندہ ایفا نہ ہوا۔

بلقانی ریاستوں کا اتحاد: جس خطرہ کو محسوس کر کے ترکوں نے اٹلی سے صلح کی تھی وہ بہت جلد سامنے آ گیا، ریاستہائے بلقان نے تاریخ میں پہلی بار متحدہ ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا، ''جنگ بلقان'' بقول خالدہ ادیب خانم ''گویا جنگ عظیم کی ایک مشق تھی، دونوں کی تیاری اور تحریک میں روس کے وزیر خارجہ اسوولسکی کی عقل شیطانی کارفرما تھی۔''

بلقان کی مسیحی ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش ''صلح نامہ برلن'' کے بعد کئی بار کی جا چکی تھی، لیکن ان کی باہمی رقابتوں نے کبھی اسے کامیاب نہ ہونے دیا، ۱۸۸۵ء میں بلغاریا کی توسیع مملکت پر سرویا کی آتشِ حسد اور بھی مشتعل ہو گئی تھی، جو میدانِ جنگ میں شکست کھانے کے بعد بدستور قایم رہی، ۱۸۹۱ء میں یونانی وزیر اعظم ٹریکوپیس نے بلغراد اور صوفیا جا کر دونوں ریاستوں میں اتحاد کی پھر کوشش کی اور سرویا میں اس کی تجویز پسند کی گئی لیکن بلغاریا کا وزیر اعظم اسٹامبولوف باب عالی سے لڑنے پر آمادہ نہ ہوا جس کی وجہ سے یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی، ریاستہائے بلقان کے اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ان رقیبانہ اغراض سے پیدا ہو گئی تھی، جن کا تعلق مقدونیا سے تھا، مقدونیا میں بلغاری، سروی اور یونانی عیسائی کثرت سے آباد تھے، یہ ریاستیں مقدونیا کے ان حصوں پر قبضہ کر لینا چاہتی تھیں، جہاں کے باشندے ان کے ہم قوم تھے، بلغاریا چاہتا تھا کہ مقدونیا میں حکومت خود اختیاری قایم کر دی جائے، اسے امید تھی کہ ایسا ہو جانے سے بالآخر مقدونیا کا بڑا حصہ اس کی مملکت میں شامل کیا جا سکے گا، سرویا اور یونان مقدونیا کی تقسیم کے

خواہاں تھے کیوں کہ بلغاریا کے مقابلہ میں ان کو مقدونیا کے کسی بڑے حصہ کے ملنے کی توقع نہ تھی۔(۱)

نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت قایم کرنے کے بعد سلطنت کی تمام قوموں کو مساوی حقوق دے دئے تھے، انھوں نے ترک وعرب، یونانی و بلغاری، سروی والبانی مسلمان وعیسائی کی تفریق مٹا دینی چاہی اوران سب کے بجاے ایک متحدہ عثمانی قومیت پیدا کرنے کی کوشش کی، انقلاب سے پہلے انجمن اتحاد وترقی کا یہ نصب العین عیسائی رعایا کی نگاہوں کو بھی خیرہ کررہا تھا اور سلطان عبدالحمید کے استبداد کو ختم کر کے جب دستوری حکومت کا اعلان کیا گیا تو عیسائیوں نے ترکوں سے بھی زیادہ جوش ومسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ظاہر ہوگیا کہ ان کی اصلی غرض و غایت کیا ہے، وہ حقوق کے لینے کے لیے تو سب سے پہلے بڑھے مگر جب فرائض کی انجام دہی کا وقت آیا جو حقوق کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ تھے تو گریز کرنے لگے، چنانچہ نئی حکومت نے فوجی خدمت جب عیسائیوں پر بھی عاید کی جس سے اب تک وہ بری تھے تو انھوں نے اسے جبر وتشدد سے تعبیر کیا اور مسیحی طاقتوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔

روس کی سازشیں: سلطنت عثمانیہ کے خلاف ہر اقدام کے لیے روس ہمیشہ تیار رہتا تھا مقدونیا کی روش اور بلقانی ریاستوں کے حوصلوں نے اس کے۔ یہ ایک امید افزا موقع بہم پہنچایا، اس کا وزیر خارجہ اسوولسکی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ روس بلقان میں پیش قدمی کر کے آبناے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے مگر اس کے لیے برطانیہ اور فرانس کی رضامندی ضروری تھی، چنانچہ برطانیہ کو راضی کرنے کے لیے اس نے ۱۹۰۷ء میں جاپان سے صلح کر لی، اسی سال افغانستان، تبت اور ایران کے بارے میں بھی روس اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جس میں یہ طے پایا کہ افغانستان اور تبت سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور ایران کو دو دائروں میں تقسیم کر کے ایک میں روس اور دوسرے میں برطانیہ کا

(۱) میریٹ ص ۴۴۲

اثر تسلیم کرلیا گیا، اس کے علاوہ روس اس بات پر بھی راضی ہوگیا کہ برطانیہ کی دوستی کی خاطر جرمنی کو ہر طرف سے گھیر لے گا لیکن ان سب کے باوجود وہ آبنائے باسفورس کے قبضہ پر برطانیہ کو راضی نہ کرسکا، ادھر سے مایوس ہوکر اسودلسکی نے آسٹریا کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی اور ۱۹۰۸ء میں آسٹریا کے وزیر خارجہ کاونٹ اریناتھال سے ملاقات کرکے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آسٹریا روس کو آبنائے باسفورس پر قبضہ کرلینے دیں تو روس آسٹریا کا قبضہ بوسنیا اور نووی بازاری پر تسلیم کرلے گا، آرینتھال نے یہ تجویز اس شرط پر منظور کرلی کہ بلغاریا اور رومانیا کو بھی باسفورس میں حقوق دیئے جائیں، اٹلی سے طرابلس پر سودا ہوگیا، اسودلسکی کی یہ تجویزیں ابھی یوروپین وزارتوں میں زیر غور تھیں کہ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگووینا پر اور اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا، اس کے معنی یہ تھے کہ یہ حکومتیں آبنائے باسفورس پر روسی قبضہ کی مخالفت نہ کریں گی لیکن چونکہ برطانیہ اور فرانس کی منظوری کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا اور یہ دونوں کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے، اس لیے اسودلسکی نے اب یہ تدبیر سوچی کہ بلقانی ریاستوں کو متحد کرکے ترکوں کو بلقان سے نکال دے اور پھر خود آبنائے باسفورس اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے (۱) چنانچہ اسی کی کوشش سے مارچ ۱۹۱۲ء میں سرویا اور بلغاریا میں ترکی کے خلاف ایک معاہدہ ہوا، اسودلسکی نے اس معاہدہ کی اطلاع فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوانکارے کو دی اور لکھا کہ ابھی یہ کسی پر ظاہر نہ کیا جائے، بلغاریا کو اٹھارہ کرور فرانک سامانِ جنگ فراہم کرنے کے لیے قرض دیا گیا (۲) اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ کے رو سے یہ طے پایا کہ اگر مقدونیا کا کوئی حصہ فتح ہوجائے تو جو علاقے ان دونوں ریاستوں سے متصل واقع ہیں وہ ان میں شامل کردیئے جائیں اور درمیانی عمارتوں کی تقسیم روس کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے (۳) روس ہی کی وساطت سے مئی ۱۹۱۲ء میں یونان اور بلغاریا کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوگیا، یہ سرویا اور بلغاریا کے معاہدہ سے ایک خاص امر میں مختلف تھا یعنی اس میں مقدونیا

---

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۸۲ (۲) ایضاً ص ۸۳ (۳) ایورسلے ص ۳۵۷

کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا(۱) پھر ستمبر ۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نگرو کے درمیان بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ فریقین ترکی سے علاحدہ علاحدہ جنگ کریں اور کسی ترکی شہر یا گاؤں پر سرویا اور مونٹی نگرو کی فوجیں متحدہ طور پر قابض نہ ہوں۔

البانیا کی بغاوت: ان معاہدوں کے بعد اتحادی چاہتے تھے کہ جنگ جلد از جلد شروع کر دیں، طرابلس کی جنگ جاری تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، دوسری طرف البانیا کی بغاوت سے مقدونیا کی تقسیم کا مسئلہ جو اس اتحاد کی اصلی غرض و غایت تھی بہت مشکل ہوتا نظر آ رہا تھا، البانیا کا مطالبہ حکومت خود اختیاری تھا، وہ سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتوں کو متحد کر کے دولت علیہ کے زیر سیادت ایک خود مختار مملکت قایم کرنا چاہتا تھا، ابتدا میں انجمن اتحاد و ترقی نے البانیا کی بغاوت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن جب سلطنت کی فوج نے بھی جو البانیا میں تھی باغیوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور جون ۱۹۱۲ء میں مناستر کے فوجی دستہ نے علانیہ بغاوت کر دی اور موجودہ وزارت کے توڑ دینے کا مطالبہ کیا تو البانیا کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ حکومت کے سامنے آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی میں محمود شوکت پاشا نے استعفا دے دیا اور ان کی جگہ ناظم پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی کا شدید مخالف تھا وزیر جنگ مقرر ہوا، اگست میں حلمی پاشا صدر اعظم کو بھی استعفا دینا پڑا، باغیوں کی یہ کامیابی دیکھ کر بلقانی ریاستوں کو یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے البانیا ایک خود مختار مملکت تسلیم کر لی جائے اور سقوطری، یانینا، مناستر اور قوصوہ کی ولایتیں اس میں شامل کر دی جائیں، اگر ایسا ہوا تو ان ریاستوں میں سے ہر ایک کو اس علاقہ سے محروم ہونا پڑے گا جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ خواہش مند تھی، چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں یہ موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے انھوں نے عجلت کی اور ۸/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شاہ نکولس والی مونٹی نگرو نے باب عالی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

ترکی کی اندرونی حالت: ترکی کی اندرونی حالت اس وقت بہت نازک تھی، قدامت پسند

(۱) میریٹ ص ۴۴۷

گروہ نوجوان ترکوں کی انتہا پسندی کا مخالف تھا، خود حکمراں جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی، فوج کے اس حصہ کو جو قدامت پسند تھا غلبہ حاصل ہوگیا تھا، محمود شوکت پاشا کے استعفاد ینے کے بعد فوج کی تنظیم بوڑھے افسروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جو قابلیت میں نوجوان ترکوں سے بہت کم تھے، کامل پاشا صدر اعظم تھا اور اسے انگلستان کی حمایت پر اس قدر بھروسا تھا کہ وہ بلقان کے خطرہ کو زیادہ اہم نہیں خیال کرتا تھا، اسے یقین تھا کہ انگلستان بلقان پر حملہ نہ ہونے دے گا، اسی یقین کی بنا پر اس نے ۱۹۱۲ء میں ۶۷ ہزار تربیت یافتہ فوج کو جو بلقان کی سرحد پر جمع تھی منتشر کر دیا لیکن جب جنگ کے چھڑ جانے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تو یوروپین حکومتوں سے مداخلت کی درخواست کی گئی، چنانچہ ستمبر میں روس اور آسٹریا نے دولِ عظمیٰ کی طرف سے ایک احتجاجی نوٹ اتحادیوں کے پاس بھیجا، ظاہر ہے کہ اسوولسکی کی سازشوں کے بعد اس احتجاج کا اثر کیا ہوسکتا تھا، یہ دیکھ کر کہ دولت علیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہی ہے پہلے مونٹی نگرو اور پھر دوسری ریاستوں نے اعلانِ جنگ کر دیا، ترکی کے پاس ایک لاکھ فوج تھی اور وہ بھی زیادہ تر نئے رنگروٹوں کی، بلغاریا کی فوج ایک لاکھ اسی ہزار تھی، سرویا کی اسی ہزار، یونان کی پچاس ہزار(۱)، ان ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ سے علاحدہ ہونے کے بعد اپنی تنظیم یوروپین حکومتوں کے طرز پر کر لی تھی اور ان کی فوجیں یورپ کے فوجی نظام کے مطابق تربیت یافتہ تھیں، برخلاف اس کے نوجوان ترک ملک کی اصلاح کافی طور پر نہ کر سکے تھے، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انھیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے صرف چار ہی سال گذرے تھے اور دوسری بڑی وجہ قدامت پسند گروہ کی مخالفت تھی، نئے قانون کے مطابق ترکی فوج میں عیسائی اور یہودی بھی بھرتی کیے گئے تھے، ان کی فوجی خدمت جس سے وہ اب تک بالکل بری تھے نہایت شاق تھی، چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو انہی عیسائی اور یہودی سپاہیوں نے دھوکا دیا اور سب سے پہلے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے، ایک تو

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۵

عثمانی فوجوں کی تعداد اتحادیوں کے مقابلہ میں یوں ہی کم تھی، دوسرے عیسائیوں اور یہودیوں کی غداری سے اور زیادہ نقصان پہنچا۔

جنگ بلقان: اتحادیوں نے جنگ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کے عیسائی صوبوں کی اصلاحِ حال ظاہر کیا تھا مگر حقیقتاً ان کے پیشِ نظر ذاتی اغراض تھیں، چنانچہ یونان کریٹ اور بحر ایجین کے دوسرے جزیروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ خود برّ اعظم پر بھی اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہش مند تھا، بلغاریا کو اس بلغاریا عظمی کی آرزو تھی، جس کا نقشہ 'صلح نامہ سان اسٹیفانو' میں مرتب کیا گیا تھا، سرویا ان تمام علاقوں کو اپنے اندر شامل کر لینا چاہتا تھا جو اسٹیفن ڈوشن (Stephan Dushan) کے زمانہ میں اس کی قدیم سلطنت کے جزو تھے، وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود بحر ایجین اور بحر ایڈریاٹک کے ساحلوں تک پہنچ جائیں، مونٹی نگرو کی نظر البانیا کے ایک حصہ پر تھی۔(۱)

۸/اکتوبر کو مونٹی نگرو نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا، بقیہ ریاستوں نے بھی ۱۸/اکتوبر کو اعلان کر کے اسی روز اپنی فوجیں عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ کیں، حملہ کا سب سے زیادہ زور بلغاریا کی طرف سے تھا، جس کا مقصد خود قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا تھا، چنانچہ ۱۸/اکتوبر کو بلغاری فوجیں تھریس میں داخل ہوئیں اور ۲۲/اکتوبر کو قرق کلیسہ اور ۲۸/ کو لولو برگاس کے معرکوں میں ترکوں کو شکست دی، عثمانی فوج نے شتلجہ کے حصار میں پناہ لی جو قسطنطنیہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، بلغاریوں نے شتلجہ پر کئی حملے کیے مگر نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، وسط نومبر تک ادرنہ کے سوا تھریس کے اور تمام حصوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

اس درمیان میں سرویا، مونٹی نیگرو اور یونان نے بھی متعدد فتوحات حاصل کر لی تھیں، سرویا کی فوجیں سرحد کو عبور کر کے قدیم سرویا میں داخل ہوئیں، کمانووو (Koumanaovo) کے میدان میں ۲۳/اکتوبر کو ترکوں سے مقابلہ ہوا۔ دو روز تک

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۵۹

جنگ جاری رہی، آخر میں ترکوں کو شکست ہوئی، سروی فوجوں نے اسکوب پر قبضہ کرلیا جوان کی قرونِ وسطیٰ کی سلطنت کا پایہ تخت تھا، اس کے بعد وہ مقدونیا میں بڑھتی ہوئی مناستر تک پہنچ گئیں، دوسری طرف مونٹی نگرو کی فوجوں نے سقوطری کے زبردست قلعہ کا محاصرہ کرلیا، یونانیوں کی فتوحات کا بھی یہی حال تھا، وہ بھی قریب قریب ہر معرکہ میں کامیاب رہے، ۸رنومبر کو یونانی فوجوں نے سالونیکا پر قبضہ کرلیا، مگران کی بحری فتوحات زیادہ اہم تھیں، آخرنومبر تک بحر ایجین کے تقریباً تمام عثمانی جزائر پر یونان کا قبضہ ہوگیا تھا ترکی بحریہ کی کمزوری بری فوجوں کی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ثابت ہوئی۔

عثمانی شکست کے اسباب: ترکوں کی ان حیرت انگیز شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ ایورسلے لکھتا ہے:

> ''عثمانی فوجوں کی بدنظمی اور ابتری کے منجملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ سامانِ رسد کا انتظام مطلق نہ تھا، تین تین چار چار روز تک فوجوں کا بغیر غذا کے رہ جانا کوئی استثنائی واقعہ نہ تھا بلکہ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ یورپ کی اس جنگ میں عثمانی فوجوں میں بڑی تعداد دیہاتی عیسائیوں کی تھی جو پہلی بار جبری طور پر بھرتی کیے گئے تھے، ان کی ہمدردی تمام تر دشمن کے ساتھ تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ ترکی صفوں کے ٹوٹنے کے وقت فوج کا انتشار اور فرار زیادہ تر انہی کے بھاگنے کی وجہ سے ہوتا تھا جو لوگ باقی رہ جاتے تھے، وہ اپنے گھروں کو بھاگ جاتے تھے۔(۱)

خالدہ ادیب خانم اپنے سوانح میں لکھتی ہیں:

> ''بدنظمی کے لحاظ سے جنگ بلقان سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے، حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہ تھا اور خطوطِ مدافعت کے

(۱) ص ۳۶۳

پیچھے انتظامات کی ابتری نہایت افسوس ناک تھی، بھیڑیں گاڑیوں میں بھوکی مررہی تھیں اور آٹا گوداموں میں سڑ رہا تھا، لیکن نصف میل سے کم ہی فاصلہ پر لوگ فاقے سے جان دے رہے تھے، جب ترک پناہ گزیں قتل عام سے بھاگ کر سراسیمہ قسطنطنیہ پہنچے جب باہر سے آنے والوں اور فوج میں ہیضہ پھیلا، جب آبادی کی آبادی مسجدوں کے صحن میں سردی کی شدت سے دم توڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی تو قسطنطنیہ کی مصیبت کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ خیالی معلوم ہوتا تھا۔'' (۱)

یورپ کا پاسِ عہد: آغازِ جنگ میں دولِ عظمیٰ نے اعلان کیا تھا کہ خواہ کوئی فریق بھی کامیاب ہو بلقان کی موجودہ حالت برقرار رکھی جائے گی، اس اعلان کا سبب یہ تھا کہ انھیں ترکی کی کامیابی کا قوی اندیشہ تھا اور جس طرح ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک ایسے ہی اعلان سے یونان کی پشت پناہی کی تھی اور ترکوں کو یونانی فتوحات سے دست بردار ہونا پڑا تھا، اسی طرح ریاستہاے بلقان کا تحفظ بھی پہلے ہی سے کرلیا گیا تھا، لیکن جب خلافِ توقع عثمانی فوجوں کو تقریباً ہر معرکہ میں شکست ہوئی اور دشمن حیرت انگیز طور پر کامیاب ہونے لگے تو انہی زبانوں نے جو یہ اعلان کرچکی تھیں اب اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ کہا جانے لگا کہ بلقانیوں کو ان کی فتوحات سے محروم کردینا ہرگز قرین انصاف نہیں، مسٹر ایسکوئتھ، وزیراعظم برطانیہ نے دولِ عظمیٰ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: ''مشرقی یورپ کے نقشہ کو ازسرنو مرتب کرنا ضروری ہے اور فاتحین کو ان ثمرات سے محروم نہیں کرنا چاہیے جو اتنی گراں قیمت پر انھیں حاصل ہوئے ہیں'' (۲)، بقول خالدہ خانم: ''یورپ کے اخباروں نے بھی وہ لہجہ اختیار کیا گویا یہ قرونِ وسطی کی صلیبی جنگ تھی جس میں صلیب ہلال پر غالب آئی۔''

عارضی صلح: دولِ عظمیٰ کی تحریک پر ۳ر دسمبر کو ترکی اور بلغاریا اور سرویا کے درمیان ایک

---

(۱) سوانح خالدہ ادیب خانم (Memories of Khalida Edib) مطبوعہ لندن ص ۳۳۴ (۲) ملر ص ۵۰۴

عارضی صلح ہوگئی، یونان اور مونٹی نیگرو سے جنگ جاری رہی، اب تک جنگ کا نتیجہ یہ تھا کہ ترک مقدونیا اور تقریباً تمام تھریس اور اپائرس سے خارج ہو چکے تھے، قسطنطنیہ کے علاوہ یورپ میں صرف ادرنہ، یانینا اور سقوطری پر ان کا قبضہ باقی رہ گیا تھا، لیکن یہ تینوں شہر بھی دشمن کے محاصرہ میں تھے۔

صلح کانفرنس، لندن: ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو لندن میں ''صلح کانفرنس'' کا اجلاس شروع ہوا، ادرنہ کے مسئلہ پر سب سے زیادہ مشکل پیش آئی اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوا، بلغاریا نے مستقل صلح کے لیے ادرنہ کے حصول کو ایک لازمی شرط قرار دیا تھا، باب عالی اس پر راضی نہ تھا لیکن جب ۱۷ر جنوری ۱۹۱۳ء کو دولِ عظمیٰ کی طرف سے ایک نوٹ باب عالی میں بھیجا گیا اور اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ ادرنہ ریاستہائے بلقان کے حوالہ کردیا جائے اور جزائر ایجین کا مسئلہ دولِ عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تو صدر اعظم کامل پاشا نے جو انگلستان کا دوست تھا ترکی کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس مشورہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی، قریب تھا کہ مجلس وزرا کامل پاشا کی اس تحریک سے متفق ہوکر دولِ عظمیٰ کے نوٹ کا جواب روانہ کردے اور ترکی کے قتل نامہ پر خود اسی کی مہر ثبت کردی جائے کیوں کہ ادرنہ سے دست برداری حقیقتاً قسطنطنیہ کی دست برداری کا مقدمہ ہوتی لیکن عین وقت پر ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے مجلس وزرا کی یادداشت کو جو دولِ عظمیٰ کے پاس جانے کے لیے مرتب ہو چکی تھی ٹکڑے ٹکڑے کرکے خود موجودہ وزارت کا خاتمہ کردیا، اس کے بعد جو وزارت قایم ہوئی اس نے ادرنہ کو حوالہ کرنے سے قطعاً انکار کردیا جس کے بعد ہی صلح کانفرنس بھی برخاست ہوگئی۔

انقلاب وزارت: یہ انقلابِ وزارت اسی بطل حریت کا رہین منت تھا جس نے ۱۹۰۸ء میں ملک کو عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قایم کردی تھی، انور بے طرابلس کی مہم سے فارغ ہوکر قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے، اسی خاموشی اور جرأت کے ساتھ جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں اس درجہ کامیاب ثابت ہوئی تھی، وہ چند جاں فروشوں کو

لے کر دفعۃً ایوانِ وزارت میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر افسرانِ جنگ اور عام پبلک کے دستخط تھے اور اس میں تبدیل وزارت یا انکار صلح پر زور دیا گیا تھا، فوج کا جو حصہ وزارت کے ہاتھ میں تھا، اسے پہلے ہی کسی بہانہ سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا اور جس قدر فوج شہر میں تھی وہ سب قومی جماعت کے ساتھ تھی، جس کی سیادت انور بے کر رہے تھے، وزراان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور بے اندر داخل ہوئے، ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی اور پستول چلائی، معاً دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر وہیں ٹھنڈا ہو گیا، بہت جلد انور بے نے وزارت خانہ پر قبضہ کر لیا، کامل پاشا کو استعفا دینا پڑا، اس کی جگہ محمود شوکت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے۔

استقلال البانیا: لندن کانفرنس کے سامنے منجملہ اور اہم مسائل کے ایک مسئلہ استقلالِ البانیا کا بھی تھا، سرویا کو جو غیر معمولی کامیابی جنگ میں ہوئی تو اس نے بحر ایڈریاٹک کا رخ کرنا چاہا، کیوں کہ اب تک اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہ تھی لیکن بحر ایڈریاٹک تک پہنچنے کے لیے سرویا صرف ایک ہی راہ سے جا سکتا تھا یعنی البانیا کی طرف سے، چنانچہ نومبر ۱۹۱۲ء کے آخر میں سروی فوجوں نے الیسیو (Allesio) اور دورازو (Durrazzo) پر قبضہ کر لیا جو البانیا کے ساحل پر واقع تھے، دولِ عظمیٰ نے جس وقت یہ خبر سنی فوراً احتجاج کیا، سب سے زیادہ مخالفت اٹلی اور آسٹریا کی طرف سے ہوئی، کیوں کہ یہی دونوں حکومتیں اپنے کو بحر ایڈریاٹک کا تنہا مالک قرار دیتی تھیں، سرویا کو باضابطہ طور پر متنبہ کر دیا گیا کہ بحر ایڈریاٹک کی کسی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی لیکن سرویا دولِ عظمیٰ کی مخالفت کے باوجود بڑھتا چلا گیا، اسے امید تھی کہ دولِ عظمیٰ کا اتحاد قائم نہ رہے گا اور کم از کم روس بالآخر اس کا طرفدار ہو جائے گا (۱)، مغربی حکومتوں کے احتجاج کے علاوہ خود اہل البانیا میں سرویا کے اس اقدام کے خلاف سخت شورش برپا

(۱) شیویل ص ۴۷۳

ہوگئی، انھوں نے فوراً ولونا میں ایک مجلس منعقد کر کے سلطنت عثمانیہ سے اپنی کامل آزادی کا اعلان کر دیا، ان کو خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو البانیہ کا بھی وہی حشر ہوگا جو بلقان کے دوسرے عثمانی مقبوضات کا ہونے والا ہے، اس اعلان سے دولِ عظمٰی کے ہاتھ اور مضبوط ہوگئے اور انھوں نے لندن کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ سرویا کو مجبور کر کے البانی بندرگاہوں سے دست بردار کرایا بلکہ البانیا کا استقلال بھی باضابطہ طور پر تسلیم کرلیا، البانیا ایک خود مختار ریاست قرار دی گئی جس کے فرماں روا کا انتخاب دولِ عظمٰی کے فیصلہ پر رکھا گیا، اس فرماں روا کی مدد کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن کا تقرر طے ہوا، سرحدوں کی تعیین بھی ایک خاص کمیشن کے سپرد کی گئی، کانفرنس دراصل جس مقصد کے لیے منعقد کی گئی تھی وہ تو ریاستہائے بلقان کی فاتحانہ سرمستیوں اور نوجوان ترکوں کی غیرت قومی کے باعث پورا نہ ہوسکا لیکن اس میں اتنا ضرور ہوا کہ البانیا کا استقلال بین الاقوامی طور پر تسلیم کرلیا گیا اور دولت عثمانیہ کا ایک اور صوبہ اس کے قبضہ سے نکل کر دولِ عظمٰی کے سایۂ عاطفت میں آگیا۔

اعادۂ جنگ: ترکی انقلابِ وزارت کے بعد عارضی صلح کا خاتمہ ہوگیا اور جنگ ازسرنو شروع کر دی گئی، ۴؍فروری ۱۹۱۳ء کو بلغاری فوجوں نے ادرنہ پر پھر حملہ کیا، اب کی بار پچاس ہزار سروی فوج بھی ان کے ساتھ تھی، اسی روز بولیر کے قریب ترکوں اور بلغاریوں کا مقابلہ ہوا، جس میں ترکوں کو شکست ہوئی اور بولیر کا اہم قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، اس درمیان میں یونانیوں نے بھی لڑائی شروع کر دی تھی، انھوں نے ایک فوج اپائرس روانہ کی اور ۶؍مارچ کو یانینا کے قلعہ پر جو اب تک ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا قبضہ کرلیا، ۱۰؍مارچ کو جزیرۂ ساموس بھی یونانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

سقوطِ ادرنہ: ۲۶؍مارچ کو ادرنہ کے فوجی دستہ کو بھی تقریباً پانچ ماہ کے شدید محاصرہ کے بعد ہتھیار ڈال دینے پڑے، اس محاصرہ میں بلغاریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ بار بار حملہ آور ہوئے تھے لیکن ہر بار انھیں کشتوں کی ایک بڑی

تعداد چھوڑ کر پسپا ہونا پڑتا تھا، اب کی باران کی کامیابی محض سروی افواج کی مدد سے ہوئی مگر اس کامیابی نے بلغاریا کے لیے ایک نئی دقت پیدا کردی، جنگ بلقان میں رومانیا نے اب تک کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا تھا، بلغاریا کی فتوحات کو دیکھ کر اس کے دل میں رشک کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنی غیر جانبداری کے معاوضہ میں بلغاریا سے سلسٹریا کے قلعہ کا مطالبہ کیا تاکہ صلح نامہ برلن میں اس کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی تھی اس کی کچھ تلافی ہو جائے، یہ معاملہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ۱۹/اپریل ۱۹۱۳ء کو ترکوں اور بلغاریوں کے درمیان بولیر میں عارضی طور پر صلح ہوگئی۔

سقوطری: اس عارضی صلح میں مونٹی نیگرو شریک نہ تھا کیوں کہ شاہ نکولس دولِ عظمیٰ کی مخالفت کے باوجود سقوطری کے محاصرہ پر قایم تھا اور اسے فتح کرنے سے پہلے کسی صلح کے لیے آمادہ نہ تھا، دولِ عظمیٰ نے اسے متنبہ کردیا تھا کہ اگر اس نے قلعہ فتح بھی کرلیا تو بھی اس پر قابض نہ رہنے پائے گا، اس لیے کہ پہلے سے طے ہوچکا ہے کہ یہ شہر البانیا کی جدید خود مختار ریاست میں شامل کردیا جائے گا، تاہم نکولس نے کچھ پروانہ کی اور محاصرہ جاری رکھا، مجبور ہوکر روس کے علاوہ تمام دولِ عظمیٰ نے ایک متحدہ جنگی بیڑا مونٹی نیگرو کے ساحلی علاقہ کی ناکہ بندی کے لیے روانہ کیا، یہ بیڑا برطانوی امیر البحر برنی (Burney) کی سرکردگی میں ۴/اپریل کو انتی داری کے سامنے نمودار ہوا، پھر بھی نکولس نے محاصرہ بدستور جاری رکھا، بالآخر ۲۲/اپریل کو فاقہ کشی سے تنگ آکر محصورین نے ہتھیار ڈال دیے، اسد پاشا ترکی دستہ اور باقی ماندہ سامان جنگ کو لے کر شہر سے نکل گیا اور ۲۶/ اپریل کو مونٹی نگرو کا ولی عہد شہزادہ ڈانیلو (Danilo) فاتحانہ طور پر اس میں داخل ہوا لیکن مونٹی نگرو کی یہ فتح مندی چند روز ثابت ہوئی، دولِ عظمیٰ نے شاہ نکولس کو مجبور کیا کہ شہر ان کے حوالہ کردے، چنانچہ ۴/مئی کو نکولس نے سرایڈورڈ گرے وزیر خارجہ برطانیہ کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ میں بالکل مجبور ہوکر سقوطری سے دست بردار ہوتا ہوں اور اسے دولِ عظمیٰ کے ہاتھ میں دیتا ہوں، اس کے بعد بین الاقوامی فوجیں جنگی بیڑے سے اتر کر سقوطری

میں داخل ہو گئیں، سقوطری کے شہر اور اس کے چاروں طرف چھ میل کے فاصلہ تک ایک عارضی حکومت قایم کر دی گئی، جس کا صدر امیر البحر برنی مقرر ہوا۔

صلح نامہ لندن، ۳۰ رمئی ۱۹۱۳ء: بولیر کی عارضی صلح کے بعد لندن کانفرنس کے دوبارہ منعقد کرنے کی تحریک پھر شروع ہوئی، ریاستہائے بلقان نے دولِ عظمیٰ کے تمام شرائط وساطت منظور کر لیے مگر اپنے لیے یہ حق محفوظ رکھا کہ تھریس اور البانیا کی سرحدوں نیز جزائر ایجین کے مستقبل کے مسئلہ پر وہ کانفرنس میں بحث و مباحثہ کریں گی، دولِ عظمیٰ نے اپنی وساطت کے لیے یہ شرائط پیش کیے تھے (۱) یورپ میں ترکی کی جدید سرحد کے لیے اینوس (Ainos) جو بحر ایجین پر واقع ہے اور میڈیا (Midia) جو بحر اسود پر واقع ہے، ان دونوں کا درمیانی خط مستقیم بنیاد قرار دیا جائے۔ (۲) جزائر ایجین کا مسئلہ اور جدید البانیا کی سرحد کی تعیین دولِ عظمیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دی جائے۔ (۳) تمام مالی معاملات بشمول تاوانِ جنگ ایک بین الاقوامی مالی کمیشن کے سپرد کر دئے جائیں، چنانچہ یہ کمیشن ۹ رجون کو پیرس میں بیٹھا اور اس میں محاربین کے نمایندے شریک ہوئے۔ (۱)

۳۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو "صلح نامہ لندن" پر فریقین کے دستخط ہو گئے، اس کے رو سے یوروپین ترکی کے تمام علاقے بہ استثنائے البانیا جو خط اینوس و میڈیا کے مغرب میں واقع تھے، ریاستہائے بلقان کو دے دئے گئے، البانیا کی سرحدوں نیز اس کے متعلق تمام دوسرے مسائل کا فیصلہ دولِ عظمیٰ پر چھوڑ دیا گیا، کریٹ کے علاوہ اور تمام جزائر ایجین کی قسمت کا فیصلہ بھی دولِ عظمیٰ ہی پر چھوڑا گیا، باب عالی نے کریٹ کا الحاق یونان سے منظور کر لیا، مالی معاملات کا تصفیہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کر دیا گیا اور حکومتی اختیارات، قومیت اور تجارت کے مسائل کا مخصوص معاہدوں سے طے ہونا قرار پایا۔ (۲)

اتحاد میں افتراق: دولِ یورپ نے لندن کانفرنس کی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی، لیکن خود اتحادیوں کے اندر جو افتراق پیدا ہو رہا تھا، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی،

(۱) و (۲) ملرص ۹-۵۰۸

یہ افتراق مالِ غنیمت کی تقسیم پر ظاہر ہوا، کریٹ، جزائر ایجین، اپائرس، تھریس اور مقدونیا جو دولتِ عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے قبضہ میں آ چکے تھے، ان کی تقسیم کا مسئلہ نہایت دشوار تھا اور لندن کانفرنس کے اختتام سے قبل ہی باہمی جنگ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، اتحادی فتح کے نشہ میں سرشار تھے اور ان میں سے ہر ایک مالِ غنیمت کا سب سے زیادہ حقدار اپنے ہی کو سمجھتا تھا، جنگ سے پہلے سرویا اور بلغاریا کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کے رو سے مقدونیا کا ایک چھوٹا سا حصہ سرویا کو ملنا چاہیے تھا، لیکن جنگ میں سروی افواج نے جو خلافِ توقع فتوحات مقدونیا میں حاصل کیں، ان کے لحاظ سے سرویا معاہدۂ مذکورہ پر قانع رہنے کے لیے تیار نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ اتحادیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ ترکوں کے مقابلہ میں اس درجہ کامیاب رہیں گے، یہی سبب تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق انھوں نے جنگ سے پہلے کسی خاص معاہدہ کی ضرورت نہ سمجھی، لیکن تعجب یہ ہے کہ لندن کانفرنس میں بھی اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی گئی اور گویا اسے تلوار کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا، مقدونیا میں ترکوں سے جو لڑائیاں ہوئیں وہ زیادہ تر سرویا اور یونان کی فوجوں سے ہوئیں، بلغاری فوجیں تھریس میں لڑتی رہیں، چنانچہ مقدونیا کے بیشتر علاقوں پر سرویا اور یونان ہی کا قبضہ تھا، اس بنا پر ان دونوں ریاستوں کا دعویٰ یہ تھا کہ مقدونیا ان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے اور بلغاریہ اپنا حصہ تھریس میں پورا کر لے، بلغاریا اس پر راضی نہ تھا، وہ مقدونیا پر قبضہ رکھنے کے لیے اس وجہ سے مصر تھا کہ اس میں بلغاری آبادی کثرت سے تھی، علاوہ بریں وہ بیسیوں برس سے مقدونیا کے عیسائیوں میں بلغاری قومیت کا جذبہ ابھار رہا تھا، سرویا کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ چوں کہ دولِ عظمیٰ کے فیصلہ کے مطابق البانیا ایک خود مختار ریاست بنا دی گئی ہے، جس سے علاوہ اور نقصانات کے سب سے بڑا نقصان سرویا کو یہ پہنچا کہ اسے ساحل ایڈریاٹک پر کوئی بندرگاہ نہ مل سکی اور دورازو پر قبضہ پانے کے بعد بھی اس سے دست بردار ہونا پڑا، حالانکہ سرویا کا شریک جنگ ہونا دراصل اسی مقصد سے تھا کہ ایڈریاٹک کی کوئی بندرگاہ حاصل

ہو جائے، اس لیے اس کی تلافی صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ مقدونیا میں اسے زیادہ حصہ دیا جائے، علاوہ ان فتوحات کے جو سروی افواج نے مقدونیا میں حاصل کی تھیں، سرویا کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی تھی کہ تھریس پر جس میں ادرنہ بھی شامل تھا، بلغاریا کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے ریاستہائے بلقان کا توازنِ قوت درہم برہم ہو جائے گا، جس کا اثر زیادہ تر سرویا پر پڑے گا، اس لیے ضرورت ہے کہ توازن کو قایم رکھنے کے لیے سرویا کو بلغاریا سے زیادہ حصہ مقدونیا میں دیا جائے۔

بلغاریا اور یونان کا معاملہ بھی ایسا ہی پیچیدہ تھا، سالونیکا اور مقدونیا کے جنوبی نصف پر یونان کا قبضہ تھا، بلغاریا سالونیکا کو لینے کے لیے اڑا ہوا تھا، چنانچہ "صلح نامۂ لندن" کی تکمیل سے قبل ہی سالونیکا کے مسئلہ پر بلغاریوں اور یونانیوں میں تلواریں چل گئی تھیں، ۲۲ رمئی کو بلغاری فوجوں نے یونانی دستوں پر حملہ کر دیا تھا، نیز بلغاری توپچیوں نے ایک یونانی جہاز پر بھی گولہ باری کر دی تھی، لیکن چونکہ لندن کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا، اس لیے اس وقت یہ جنگ زیادہ نہیں بڑھی۔

ایک پیچیدگی رومانیا نے بھی پیدا کر دی تھی، رومانیا جنگ میں تو شریک نہ تھا اور اس لیے مالِ غنیمت کے کسی حصہ کا حق نہ رکھتا تھا، لیکن چونکہ اس کی غیر جانبداری سے اتحادیوں کو بالواسطہ سہولت پہنچی تھی اور انھوں نے بالخصوص بلغاریا نے حیرت انگیز فتوحات حاصل کر کے اپنی طاقت بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ بڑھالی تھی، اس لیے توازنِ قوت کو برقرار رکھنے کے لیے رومانیا کو بھی کچھ ملنا ضروری تھا، چنانچہ رومانیا نے بلغاریا سے یہ مطالبہ کیا کہ سلسٹریا کا قلعہ نیز علاقہ دوبروجا کا ایک حصہ جس پر بلغاریا کا قبضہ تھا، اسے دے دیا جائے، بلغاریا اس وقت دولت علیہ سے جنگ کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا، وہ رومانیا سے لڑائی مول لینے کے لیے تیار نہ تھا، لہٰذا مجبوراً اس نے رومانیا کے مطالبات منظور کرا لیے اور مئی ۱۹۱۳ء میں معاہدہ پر دستخط کر کے سلسٹریا اور دوبروجا کا وہ علاقہ رومانیا کے لیے نامزد کر دیا۔

آغاز جنگ، جون ۱۹۱۳ء: رومانیا سے یوں دب کر صلح کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بلغاریا، مقدونیا کے معاملہ میں زیادہ سخت ہوگیا، یونان سے جو مراسلت اس مسئلہ میں ہو رہی تھی وہ موقوف کر دی گئی اور سرویا کے ساتھ بھی معاملات کچھ زیادہ نہ بڑھے، بلغاریا کو اپنی قوت پر اتنا غرور تھا کہ اس نے حریفوں کی فوجی طاقت کی کچھ پروا نہ کی، اس کا وزیر اعظم گیشوف (M. Gueshoff) صلح کا خواہش مند تھا لیکن وزارت کا بڑا حصہ جنگ پر آمادہ تھا، چنانچہ گیشوف کو استعفاد ے کر علاحدہ ہو جانا پڑا، شاہ فرڈینڈ جو ایک نہایت عیار اور سازشی فرماں روا تھا، اس پارٹی کا طرفدار تھا جو جنگ چاہتی تھی، بلغاریا کے سابق حلیفوں کے ساتھ جو فریب اور غداری برتی گئی اس کا ذمہ دار زیادہ تر وہی تھا۔(۱)

بلغاریا کے طرز عمل سے یونان اور سرویا کو جب اس بات کا یقین ہوگیا کہ جنگ بالآخر چھڑ کر رہے گی تو ۲ رجون کو انھوں نے آپس میں ایک معاہدۂ اتحاد کر لیا، جس میں رومانیا بھی شریک ہوگیا، حالانکہ وہ اس سے قبل بلغاریا سے سلسٹریا اور دوبروجا کے متعلق صلح کر چکا تھا، چنانچہ جنگ بلقان کے اتحادیوں میں اب جو لڑائی چھڑی اس میں بلغاریا کے مقابل یونان، سرویا اور رومانیا کی ریاستیں تھیں، بعد میں مونٹی نگرو بھی اتحادیوں کے ساتھ ہوگیا۔

جنگِ تقسیم: ۲۹ رجون ۱۹۱۲ء کو آدھی رات کے وقت مقدونیا کی بلغاری فوج نے دفعۃً بغیر کسی اطلاع یا اعلان جنگ کے یونانی اور سروی دستوں پر حملہ کر دیا اور دوسرے روز ایک لاکھ بلغاری فوج اس سروی فوج کے مقابلہ میں جو اس سے قریب تر تھی آگے بڑھی، سروی فوج اس ناگہانی حملہ سے پہلے تو پسپا ہوئی، لیکن یکم جولائی کو مونٹی نگرو کی مدد سے اس نے جم کر مقابلہ کیا اور ۲ رجولائی کو بلغاری فوج کو شکست دے کر اس کی بہت سی توپیں چھین لیں، ۴ رجولائی کو پھر مقابلہ ہوا اور بلغاریا کو پھر شکست ہوئی، ۸ رجولائی کو سروی فوج نے اسٹیب (Istib) پر قبضہ کر لیا اور اب بلغاری پسپا ہو کر اپنی سرحد کی طرف روانہ

---

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۶۵

ہوئے، اس درمیان میں یونانی فوج بھی جس کا مرکز سالونیکا تھا، بلغاری فوج کے مقابلہ کے لیے بڑھی، کلتیش (Kiltich) کے میدان میں جنگ ہوئی اور بلغاری بری طرح ہارے، اس کے بعد متعدد لڑائیاں اور ہوئیں اور ہر ایک میں بلغاریوں کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا بلغاری فوجوں کے لیے اب صرف اپنی سرحد کی راہ کھلی رہ گئی تھی، واپسی میں انھوں نے مقدونیا کی یونانی آبادی پر ہولناک مظالم توڑے، یونانیوں نے بھی آگے بڑھ کر ویسا ہی انتقام لیا(۱) بلغاریوں کو صرف یونان اور سرویا کی فوجوں سے لڑنا نہیں پڑا، ۱۹؍جولائی کو رومانیا بھی جنگ میں شریک ہوگیا اور سلسٹر یا پر قبضہ کر کے صوفیا کی طرف بڑھا۔

فتح ادرنہ: بلغاریا کی اس نازک حالت سے ترکوں نے بھی فائدہ اٹھایا، ۱۵؍جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے اور ۲۰؍کو آسانی کے ساتھ ادرنہ پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد ڈیلوٹیکا اور قرق کلیسہ بھی انھوں نے دوبارہ فتح کر لیے۔

عارضی صلح: جنگ تقسیم صرف ایک ماہ تک جاری رہی لیکن اس قلیل مدت میں بلغاریا کی حالت نہایت نازک ہوگئی، اس کی فوجوں کو ہر معرکہ میں شکست ہوئی، دشمن کی فوجیں ہر طرف سے بڑھتی ہوئی آرہی تھیں، بالآخر اسے مجبور ہو کر دولِ عظمیٰ سے صلح کی درخواست کرنی پڑی، ۳۱؍جولائی کو فریقین ایک عارضی صلح پر راضی ہوئے اور یہ طے پایا کہ بخارسٹ میں ایک صلح کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ریاستہائے بلقان کے نمایندے شریک ہوں، لیکن دولِ عظمیٰ کے نمایندے شرکت نہ کریں۔

صلح نامۂ بخارسٹ: بخارسٹ میں صلح کانفرنس کا اجلاس فوراً شروع کردیا گیا اور اس سرعت کے ساتھ معاملات فیصل ہوئے کہ ۱۰؍اگست ۱۹۱۳ء کو محاربین نے صلح نامہ پر دستخط کردئے، سب سے زیادہ نقصان بلغاریا کو برداشت کرنا پڑا، جس پر جنگ تقسیم کی تمام تر ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اس نے یہ جنگ دراصل مقدونیا پر قبضہ کرنے کے لیے چھیڑی تھی، کانفرنس نے مقدونیا ہی سے اس کو تقریباً کلیۃً محروم کردیا، مقدونیا یونان اور سرویا

---

(۱) میریٹ ص ۴۲۴

کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، سرویا کو وسطی مقدونیا ملا، جس میں اوکریدا اور مناستر، قوصوہ اور نووی بازار کا نصف شرقی شامل تھا، اس کا نصف غربی مونٹی نگرو کو دیا گیا، یونان کے حصہ میں اپائرس، جنوبی مقدونیا، سالونیکا اور مشرق میں دریائے مستا (Mista) تک ساحلی علاقہ آیا جس میں کوالا بھی شامل تھا، رومانیا نے دوبروجا کا ایک بڑا حصہ مع قلعہ سلسٹریا کے پایا۔

دولت عثمانیہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ۲۹ ستمبر تک نہ ہوسکا، ۲۹ ستمبر کو بالآخر باب عالی اور بلغاریا کے درمیان بھی صلح ہوگئی، تھریس کا بڑا حصہ ترکوں کو واپس مل گیا، اس میں ادرنہ، دسیموٹیکا اور قرق کلیسہ کے اہم شہر شامل تھے، یورپ میں دولت علیہ کی کائنات بس اسی قدر اور رہ گئی، باقی سارا علاقہ ریاستہائے بلقان میں تقسیم ہوگیا، بلغاریوں نے اس جنگ میں جو نقصانات برداشت کیے تھے ان کے معاوضہ میں انھیں تھریس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہاتھ آیا جس کا ایک حصہ بحر انجین کے ساحل پر تو ضرور تھا لیکن اس میں کوئی اہم بندرگاہ نہ تھی، لارڈ ایورسلے اس موقع پر بلغاریا کے متعلق لکھتا ہے: ''کمینہ غداری اور حد سے زیادہ غرور کا اس سے زیادہ مہلک انتقام کبھی نہیں لیا گیا۔'' (۱)

جنگ کے نتائج: بلقان کی دونوں جنگوں میں اخراجات کا تخمینہ تقریباً (۲۴۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ کیا جاتا ہے اور کشتوں اور زخمیوں کی تعداد (۳۴۸۰۰۰) دونوں مدوں میں سب سے زیادہ نقصان بلغاریا کا ہوا، اس کے (۱۴۰۰۰۰) آدمی مارے گئے ور (۹۰۰۰۰۰۰۰) پونڈ صرف ہوئے، ترکوں کے مقتولوں اور زخمیوں کا شمار (۱۰۰۰۰۰) اور مصارف کا تخمینہ (۸۰۰۰۰۰۰۰) پونڈ تھا، سرویا کا (۷۰۰۰) آدمی اور (۵۰۰۰۰۰۰۰) پونڈ اور یونان جو نتیجے کے اعتبار سے سب سے زیادہ فائدہ میں رہا سب سے زیادہ سستا چھوٹا یعنی صرف (۳۰۰۰۰) آدمی اور (۲۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ۔

علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے نقصان صرف ترکی کا ہوا، جنگ سے پہلے اس کی یوروپین آبادی کا تخمینہ (۶۱۳۰۲۰۰) تھا اور اس کا رقبہ (۶۵۳۵۰) مربع میل تھا، جنگ

(۱) ص ۳۶۷

کے اختتام پر (۴۲۳۹۲۰۰) آبادی، اس کی حکومت سے نکل گئی اور اس کے قبضہ میں صرف (۱۰۸۸۲) مربع میل اور باقی رہ گئے، مالِ غنیمت میں سب سے بڑا حصہ یونان کے ہاتھ آیا، یونان کی آبادی پہلے (۲۶۶۶۰۰۰) تھی، اب بڑھ کر (۴۳۶۳۰۰۰) ہوگئی اور اس کا رقبہ (۲۵۰۰۱۴) مربع میل سے (۴۱۹۳۳) مربع میل تک پہنچ گیا، سرویا کی آبادی پہلے تیس لاکھ سے کسی قدر کم تھی، ''صلح نامۂ بخارسٹ'' کے رو سے پینتالیس لاکھ ہوگئی اور رقبہ (۱۸۶۵۰) سے بڑھ کر (۳۳۸۹۱) مربع میل ہوگیا، رومانیا نے اپنی آبادی میں جو پہلے بھی ریاستہائے بلقان میں سب سے زیادہ تھی (۲۸۶۰۰۰) کا اضافہ اور کیا اور اپنی مملکت میں (۲۶۸۷) مربع میل بلغاریا کے مقبوضات سے لے کر ملائے، بلغاریا کا نفع بقدر (۱۲۵۴۹۰۰) آبادی میں اور (۹۶۶۳) مربع میل توسیع مملکت میں رہا، مونٹی نگرو کی آبادی (۲۵۰۰۰۰) سے بڑھ کر (۴۸۰۰۰۰) تک پہنچ گئی اور اس کا رقبہ (۳۴۷۴) مربع میل سے (۵۶۰۳) مربع میل ہوگیا۔(۱)

خالدہ ادیب خانم نے اپنے خطبات میں جنگ بلقان کے نتائج اور اثرات پر حسب ذیل روشنی ڈالی ہے۔

(۱) ترکوں کی شکست سے مغربی حکومتوں کے خیالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہوا

(الف) روس ترکوں کے ہارنے سے خوش ہوا مگر ان کا اس بری طرح ہارنا اس کی مصلحتوں کے خلاف تھا، جنگ بلقان کے آغاز کے وقت اسوولسکی نے لکھا تھا: ''ترکوں کی کامل شکست سے اتحاد میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔'' وہ ترکی سلطنت کا خاتمہ بلقان کی ریاستوں کے ہاتھ سے نہیں بلکہ مغربی حکومتوں کے ہاتھ سے چاہتا تھا۔

(ب) بلغاریا والوں کی قابلیت اور منچلے پن سے بھی روس کو اندیشہ پیدا ہوگیا، اس کی اور فرانس کی نظر عنایت اب سرویا کی طرف زیادہ ہوگئی اور وہی آسٹریا کی سلطنت کا وارث قرار دیا گیا، بلغاریا کی طرف سے شبہ تھا کہ وہ آسٹریا سے ساز باز رکھتا ہے۔

(۱) میریٹ ص ۴۶۶

(ج) فرانس اور انگلستان کو ترکی کی تباہی کا یقین ہو گیا، اس کی اہمیت ان کی نظر میں فوجی قوت کی وجہ سے تھی، اب انھیں اس سے مدد ملنے کی امید نہیں رہی اور انھوں نے یہ خیال چھوڑ دیا کہ اس سے بین الاقوامی ریاست کے کھیل میں درے کا کام لیں۔

(۲) ترکوں پر اس شکست کے جو اثرات ہوئے وہ اس سے بھی زیادہ گہرے تھے۔

(الف) شکست کی بڑی وجوہ یہ تھیں، کامل پاشا کا ضعف جو بڑھاپے میں پیدا ہو گیا تھا، اس کی خود بینی، اس کا مغرب کی حکومتوں پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرنا جس کی وجہ سے اس نے اپنی آزمودہ کار فوج کو منتشر کر دیا، پرانے طرز کے افسروں کی عام نااہلی اور بے تدبیری، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پرانے لوگ سپاہی اور مدبر دونوں کی حیثیت سے بے وقعت ہو گئے۔

(ب) شکست کی مصیبت تو تھی ہی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ بلقانیوں نے مسلمانوں کی آبادی کو جو جنگ میں شریک نہ تھی اور جس میں زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے قتل کرنا شروع کیا اور یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ترکی میں پناہ لینے لگے، اسیرانِ جنگ کو قتل کرنا، ان کو فاقوں مارنا، ان کے ہاتھ پیر کاٹنا، عام باشندوں کو اذیت پہنچانا اور ان کا خون بہانا، ان سب چیزوں کی ابتدا زمانۂ حال کی لڑائی میں بلقانیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں کی۔

(ج) مغرب ان ہولناک مظالم کو چپ چاپ دیکھتا رہا مگر جب بلقان کی ریاستوں نے ایک دوسرے کی عیسائی رعایا کے ساتھ بھی یہی حرکتیں شروع کیں تو مغرب سے مخالفت کی آواز اٹھی، دوسری جنگ بلقان کے بعد کارنیگی نے ایک بین الاقوامی کمیشن تحقیقات کے لیے بھیجا۔

جب ترک عورتوں نے استنبول کے یونی ورسٹی ہال میں جمع ہو کر یورپ کی بادشاہ بیگموں سے اپیل کی تھی کہ انسانی ہمدردی کی خاطر بلقان کی مسلم آبادی کی حمایت کریں تو جواب تک نہیں ملا تھا، ترکوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی فریاد سے یہ بے اعتنائی

اور عیسائیوں کو اسی حال میں دیکھ کر یہ جوش وخروش تو ان پر بہت برا اثر ہوا، مقدونیا سے ہزار ہا مسلمان بھاگ کر اناطولیہ میں آتے تھے اور اپنی مظلومی کی داستان سناتے تھے اس کی وجہ سے اناطولیہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات جواب تک بہت اچھے تھے بہت خراب ہو گئے۔

دوم ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس مصیبت میں سلطنت کی مسلمان رعایا میں باہمی ہمدردی اور محبت بڑھ جاتی، مگر ایسا نہیں ہوا، دوسرے ملکوں کے مسلمان بھائیوں کے ہم بے حد احسان مند ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں نے ہر ممکن طریقہ سے مددی اور ہمدردی کا اظہار کیا مگر سلطنت کے اندر مسلمانوں میں تفریق کا رجحان اور بھی قوی ہو گیا۔

جنگ عظیم

جنگ بلقان کے بعد نوجوان ترکوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اب جہاں تک ممکن ہو ملک کو جنگ کے مصائب سے دور رکھیں، ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ہی سے ترکی پر حملے شروع ہو گئے تھے اور بوسنیا اور ہرزیگووینا کے نکل جانے کے علاوہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے اور جن قیمتی مقبوضات سے دست بردار ہو جانا پڑا ان کی تلافی کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا، نوجوان ترکوں نے ملک کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا اور اب وہ کسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ترکی کے سب سے بڑے اور سب سے قدیم دشمن روس سے بھی مصالحت کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۱۴ء میں اس غرض سے ایک مہم لیویڈیا میں زار کے پاس بھیجی، چنانچہ قسطنطنیہ میں ترکوں اور روسیوں کی ایک متحدہ انجمن بھی قایم ہوگئی اور ترکی اخباروں میں یہ بحث ہونے لگی کہ آبنائے باسفورس روسی جہازوں کے لیے کھول دیا جائے، اسی طرح فرانس اور انگلستان سے بھی دوستانہ تعلقات جو طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں کشیدہ ہو گئے تھے دوبارہ قایم کرنے کی کوشش کی گئی، نوجوان ترکوں نے یونان سے بھی مصالحت کرنی چاہی اور ان کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ''یونان کی مسلم ترکی رعایا کا مبادلہ ترکی کی یونانی رعایا سے کر لیا جائے تاکہ مقدونیا میں یونان اور ترکی کی مخالفت کا خاتمہ ہو جائے'' (۱) غرض جنگ بلقان کے بعد

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۹۷

نوجوان ترکوں نے وہ سب کچھ کیا جو دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنے کے لیے ضروری تھا اور اگر چند مہینوں کے بعد جنگ عظیم چھڑ نہ گئی ہوتی اور ترکی کو بھی بدرجہ مجبوری اس میں شامل نہ ہو جانا پڑتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ تمام توقعات پوری ہو جائیں جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے ساتھ قایم کر لی گئی تھیں۔

جنگ عظیم کی شرکت: اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی، سلطنت عثمانیہ اس میں کسی فریق کا ساتھ دینے کے لیے مطلق آمادہ نہ تھی لیکن بعض ناگزیر اسباب سے مجبور ہو کر اسے کچھ دنوں کے بعد شرکت کرنی پڑی، وہ اسباب حسب ذیل تھے:

(۱) سلطنت عثمانیہ ان پابندیوں سے تنگ آگئی تھی جو مراعاتِ خصوصی (Capitulations) کے پردہ میں یوروپین حکومتوں نے اس پر عاید کر رکھی تھیں، یہ مراعات گذشتہ صدیوں میں سلاطین نے یوروپین باشندوں کو عطا کی تھیں، جن کے رو سے ان باشندوں کو بعض مخصوص عدالتی اور تجارتی حقوق حاصل تھے مثلاً یوروپین باشندوں کو جو سلطنت عثمانیہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے، یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے مقدمات اپنے ہم قوم حکام کے سامنے لے جائیں اور اپنے وطنی قوانین کے مطابق ان کا فیصلہ کرائیں، بشرطیکہ فریقین مقدمہ ایک ہی قوم کے ہوں، ۱۵۳۵ء کے بعد سے یوروپین ممالک کے سفیروں کو اپنے ہم قوم افراد پر دیوانی کے معاملات میں مکمل اختیارات دے دئے گئے تھے، یہاں تک کہ غیر ملکی باشندے اپنی خواہش کے باوجود عثمانی عدالتوں میں اپنے معاملات پیش نہیں کر سکتے تھے، تجارتی مراعات کی وجہ سے ترکوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا تھا، بیرونی تاجر جہاں اور جس طرح چاہتے تھے اپنا کاروبار پھیلا دیتے تھے، وہ عثمانی قانون کے دائرہ سے باہر تھے، ان کے متعدد بنک بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں کھلے ہوئے تھے، ان مراعات کے لحاظ سے یوروپین حکومتوں کو اپنے خاص ڈاک خانے قایم کرنے کا بھی حق حاصل تھا اور ان کے ڈاک خانے تمام سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے، یہ ڈاک خانے چونکہ عثمانی حکام کی نگرانی سے بالکل آزاد تھے اس لیے ان

کے ذریعہ سے ممنوع اشیاء کی آمد و رفت بلا کسی روک ٹوک کے ہوتی رہتی تھی اور یہ عیسائی رعایا میں باغیانہ خیالات کے پھیلانے کا بھی ایک مستقل ذریعہ تھے، نوجوان ترکوں نے سلطان کی مطلق العنانی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مراعات کے پھندے کو بھی اپنے گلے سے نکال دینا چاہا اور جنگ عظیم کے اعلان کے بعد جب انگلستان اور فرانس کی طرف سے ترکی کے غیر جانبدار رہنے کی خواہش کی گئی تو اس کے معاوضہ میں اتحادیوں کے سامنے مراعات کی منسوخی کا مسئلہ پیش کیا، لیکن اتحادی اس کے لیے تیار نہ ہوئے، وہ ترکی کو اس کی غیر جانبداری کا یہ معاوضہ دینا نہیں چاہتے تھے، نوجوان ترکوں کا اعتدال پسند عنصر اور ملک کی رائے عامہ اتحادیوں کی طرف مائل تھی لیکن جنگ بلقان کے بعد اتحادی ترکی کی فوجی قوت کو حقیر سمجھنے لگے تھے اور باوجود اس کے کہ بلقان کی ریاستوں کو اپنا طرفدار بنانے کے لیے وہ انتہائی کوشش کر رہے تھے، انھوں نے ترکی کو ساتھ لینے کی مطلق پروانہ کی، ان کے اس طرز عمل کی وجہ بقول خالدہ خانم یہ بھی تھی کہ ''روس نے جو اتحادیوں میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا تھا لڑائی چھیڑی ہی اس غرض سے تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر لیے جائیں۔''

(۲) ترکی کو سب سے زیادہ خطرہ روس کی طرف سے تھا، روس کی نگاہیں مدت سے قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں اور نوجوان ترک جانتے تھے کہ روس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انگلستان بے تکلف قسطنطنیہ کو پیش کر دے گا، سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق اتحادیوں کی باہمی مفاہمت خواہ ۱۹۱۵ء میں ہوئی جیسا کہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے یا ۱۹۱۴ء میں جیسا کہ نوجوان ترک سمجھ رہے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ ترکی کی جانب سے اتحادیوں کی بے اعتنائی کا اصلی سبب یہی مسئلہ تھا، علاوہ بریں نوجوان ترک خوب سمجھتے تھے کہ اگر جنگ میں اتحادیوں کو فتح ہوئی تو روس سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے سے باز نہ رہے گا اور دولت علیہ کے استقلال کے وہ تمام دعوے طاق پر دھرے رہ جائیں گے جو غیر جانبداری کے معاوضہ میں اتحادیوں کی طرف سے کیے جا رہے تھے، اس بنا پر ترکی

کے لیے کوئی چارہ نہ تھا، بجز اس کے کہ اس فریق کا ساتھ دے جو روس کا مخالف ہو۔

(۳) سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت میں اتحادیوں نے ہمیشہ جس متعصّبانہ ذہنیت کا ثبوت دیا تھا اور جس طرح علانیہ وہ عیسائیوں کی اقتصادی اور سیاسی برتری کو مسلم اکثریت کے مقابلہ میں قایم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس نے بھی نوجوان ترکوں کو مخالف فریق کی جانب مائل ہونے پر مجبور کیا، برخلاف اس کے جرمنی سے انھیں اس قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، برطانیہ نے جنگ کریمیا کے وقت سے دولت عثمانیہ کے ساتھ جو دوستانہ تعلقات قایم کیے تھے، ۱۹۰۷ء میں ان پر ایک کاری ضرب پڑ چکی تھی اور اس سال برطانیہ اور روس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس نے اسلامی ممالک کو پہلے سے بھی زیادہ روس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا، ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں حکومت برطانیہ کا رویہ بہت ہی خشک رہا اور جنگ بلقان میں نہ صرف حکومت بلکہ برطانوی قوم بھی ترکوں کی مخالف رہی۔

(۴) نوجوان ترکوں کی ایک باا ثر جماعت جس میں زیادہ تر فوج کے افسر تھے، جرمنی سے اتحاد کرنے کی حامی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنی روس کا مخالف تھا اور روس سلطنت عثمانیہ کا قدیم دشمن تھا، جرمنی بھی ترکی کی حمایت کو اپنے لیے نہایت قیمتی خیال کرتا تھا اور سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ ہی سے باب عالی میں اپنا رسوخ واقتدار بڑھا رہا تھا، نوجوان ترکوں کے فوجی عنصر پر جرمن عسکریت کا اثر پوری طرح غالب تھا، خصوصاً انور پاشا جو فوجی پارٹی کے رکن اعظم تھے جرمنی کی حمایت میں سب سے زیادہ سرگرم تھے، یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ۲/اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان قسطنطنیہ میں ایک معاہدہ ہو گیا اور بیرون فان وانگن ہائم (Baronvon wangenhem) اور صدر اعظم سعید حلیم پاشا نے اپنی حکومتوں کی طرف سے اس پر دستخط کر دیے، اس معاہدہ سے ظاہر ہے کہ ترک صرف روس کے مقابلہ میں جرمنی کی حمایت چاہتے تھے اور فرانس اور انگلستان کے خلاف کسی مدد کے طالب نہ تھے کیوں کہ

انھوں نے اس وقت تک فرانس یا انگلستان سے جنگ کرنے کا قصد بھی نہیں کیا تھا، چنانچہ صدر اعظم نے جرمنی اور اتحادیوں سے جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ جہاں تک انگلستان اور فرانس کا تعلق ہے ترکی غیر جانبدار رہے گا (۱) لیکن یہ معاہدہ بھی خفیہ تھا اور اس کا علم صرف تین آدمیوں کو تھا یعنی انور پاشا (وزیر حرب) طلعت پاشا (وزیر داخلہ) اور سعید پاشا (صدر اعظم) کو، جب مجلس وزرا کو اس کی اطلاع دی گئی تو اعتدال پسند فریق نے اس کی مخالفت کی، یہاں تک کہ بعض نے استعفا دے دیا استعفا دینے والوں میں جاوید بے بھی تھے، جو انجمن اتحاد و ترقی کے ایک نہایت ممتاز رکن اور وزیر مال تھے، اس معاہدہ کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ فریقین آسٹریا ہنگری اور سرویا کی موجودہ لڑائی میں بالکل غیر جانبدار رہیں گے، لیکن چونکہ روس کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ سرویا کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا اور ایسی صورت میں جرمنی اپنے سابق معاہدہ کے رو سے مجبور ہوگا کہ آسٹریا ہنگری کی مدد کرے، اس لیے معاہدہ کی دوسری دفعہ یہ رکھی گئی کہ اگر روس نے مداخلت کی اور جرمنی کو آسٹریا ہنگری کا ساتھ دینا پڑا تو ترکی پر بھی یہ ذمہ داری عاید ہوگی، معاہدہ کی چوتھی دفعہ یہ تھی کہ اگر روس نے ترکی مقبوضات پر حملہ کیا تو جرمنی ان کی مدافعت میں مدد دے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو اپنی فوجوں سے کام لے گا، جوں ہی جرمنی نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اس معاہدہ کی دوسری دفعہ ترکی پر عاید ہوگئی اور اسے بھی جرمنی اور آسٹریا ہنگی کا ساتھ دینا پڑا۔

(۵) لیکن ابھی تک فرانس اور انگلستان کے معاملہ میں ترکی نے پوری غیر جانبداری کا ثبوت دیا تھا، اس غیر جانبداری کی شکست خود حکومت برطانیہ کے ہاتھ سے عمل میں آئی، ترکی کے دو جنگی جہاز انگلستان کے ایک کارخانہ میں تعمیر ہو رہے تھے اور جنگ شروع ہونے سے قبل یہ تیار بھی ہو گئے تھے، چنانچہ ترکی بحریہ کے افسر اور جہاز راں ان کو لانے کے لیے انگلستان پہنچ گئے تھے لیکن جب جرمنی نے جنگ کا اعلان کیا تو

(۱) 'ترک اور یورپ' از گاستون گیلارڈ (Gaston Gaillard) مطبوعہ لندن ص ۳۰-۲۹

حکومت برطانیہ نے ان جہازوں کو ضبط کر لیا، حالانکہ ان کی قیمت ادا کی جا چکی تھی اور اس وقت تک برطانیہ اور ترکی کے درمیان جنگ نہیں چھڑی تھی، چونکہ ان جہازوں کی قیمت زیادہ تر ترکوں کے چندوں سے فراہم کی گئی تھی، اس لیے ان کی ضبطی سے عوام میں برطانیہ کے خلاف ایک شورش پیدا ہوگئی، اس واقعہ کے بعد ہی جرمنی کے دو جنگی جہاز گوبن (Goeben) اور برسلا (Breslaw) دردانیال پہنچے اور ترکی نے ان دونوں کو فوراً خرید لیا مگر ان کی کمان ابھی تک جرمن بحری افسروں کے ہاتھ میں تھی، اتحادیوں نے باضابطہ طور پر اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ جہاز آبنائے باسفورس سے نکلے تو بلا خیال اس کے کہ ان پر جرمن نشان ہے یا نہیں یا ان کے جہاز راں ترک ہیں انھیں دشمن کا جہاز سمجھا جائے گا، چنانچہ یہی ہوا کہ جب گوبن اور برسلا بحر اسود میں داخل ہوئے تو روسی جہازوں نے ان پر گولہ باری کی، مجبوراً ادھر سے بھی جواب دیا گیا، اس پر ۴ رنومبر کو روس نے اور ۵ رنومبر کو انگلستان اور فرانس نے ترکی سے اعلانِ جنگ کر دیا، اسی روز برطانیہ نے جزیرۂ سائپرس کو جو ۱۸۷۸ء کے معاہدہ کے رو سے اس کے قبضہ میں تھا باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء کو برطانیہ نے مصر پر اپنا محمیہ (Protectorate) قایم کرنے کا بھی اعلان کیا اور خدیو عباس حلمی کے بجائے جو اس وقت قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور ترکوں کا ہمدرد ہونے کی وجہ سے تخت سے علاحدہ کیے جانے کا مستحق قرار دیا گیا، سابق خدیو اسماعیل پاشا کے ایک لڑکے شہزادہ حسین کامل کو سلطان مصر کے خطاب سے تخت پر بٹھایا، مصر پر محمیہ قایم کرنے کے لیے چونکہ فرانس اور روس کو راضی رکھنا ضروری تھا اس لیے باہم یہ مفاہمت ہوئی کہ جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ روس کو قسطنطنیہ آبنائے باسفورس اور دردانیال پر قبضہ کرنے دے گا اور فرانس کو شام پر۔(۱)

دردانیال کی مہم: جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت نے اتحادیوں (برطانیہ، فرانس، روس) کے لیے سخت دشواریاں پیدا کر دیں، جنگ بلقان کی شکستوں کے باوجود ترکوں کی فوجی

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۷۷

قابلیت اور جاں بازی کا تجربہ انھیں بار ہا ہو چکا تھا اور اب جرمنی سے اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ کی مدد پہنچنے سے ترکی فوجوں کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا، لیکن سب سے زیادہ جو چیز اتحادیوں کے لیے باعث تشویش ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ترکی نے آبنائے باسفورس اور دردانیال کو غنیم کے جہازوں کے لیے بند کر دیا، جس کی وجہ سے برطانیہ اور فرانس کا تعلق روس سے منقطع ہو گیا، روس ایک غیر صنعتی ملک تھا اور چند ہی دنوں میں یہ ظاہر ہو گیا کہ جب تک انگلستان اور فرانس کے کارخانوں سے کافی سامان جنگ اسے برابر فراہم نہ ہوتا رہے وہ زیادہ مدت تک جدید طرز کی جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتا (۱) صورتِ حال اب یہ تھی کہ یا تو اتحادی دردانیال اور آبنائے باسفورس کا بند توڑیں یا روس کو غنیم کے رحم و کرم پر چھوڑیں، چنانچہ ۱۹/فروری ۱۹۱۵ء کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے دردانیال کے بیرونی قلعوں پر گولہ باری شروع کی، تجویز یہ تھی کہ یہ جہاز دردانیال میں بجبر داخل ہو کر براہ راست قسطنطنیہ پہنچیں اور دارالسلطنت پر قبضہ کر کے ترکی کا خاتمہ کر دیں، یہ تجویز مسٹر ونسٹن چرچل برطانوی وزیر بحریہ کے دماغ کی اپج تھی، جس سے بقول لارڈ ایورسلے بحری جنگ کے بہترین ماہروں کو کبھی بھی پورا اتفاق نہ تھا (۲)، بہر حال اس مہم میں سخت ناکامی ہوئی اور حملہ آوروں کے متعدد جہاز غرق ہو گئے اس کے بعد ۵/ سے ۷/ مارچ تک دشمنوں کے متحدہ جنگی بیڑے نے دردانیال پر دوبارہ حملہ کیا، ترکوں نے دردانیال کے قلعوں کو اس طرح مستحکم کیا تھا کہ اتحادی بیڑے کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، اتنا ہی نہیں بلکہ ترکی قلعوں کے گولوں سے اتحادیوں کے تقریباً پچاس ہزار سپاہی ہلاک ہوئے اور ان کے جنگی جہازوں کی ایک بڑی تعداد غرق ہو گئی اور بہتیرے جہاز بری طرح زخمی ہوئے۔

معرکہ گیلی پولی: ان شکستوں کے بعد اور اتنا نقصان اٹھا کر اتحادیوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ مہم صرف جہازوں کے ذریعہ کامیاب نہیں ہو سکتی، چنانچہ اب برطانیہ اور فرانس کے

(۱) شیویل ص ۴۹۱ (۲) ایورسلے ص ۳۷۹

ماہرینِ حرب نے ایک دوسری تدبیر سوچی، وہ یہ کہ زیادہ زور بری حملہ پر دیا جائے اور بری فوجوں کی مدد سے یہ مہم سر کی جائے یعنی جزیرہ نمائے گیلی پولی کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر فوجیں اتار کر دردانیال کے قلعوں پر پشت کی جانب سے حملہ کیا جائے، اس کے لیے بڑی بڑی تیاریاں ہوئیں، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا اور ہندوستان کے بہترین سپاہی بلائے گئے، مئی ۱۹۱۵ء میں اٹلی بھی اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گیا اور اس کے فوجی دستے بھی اس مہم کی شرکت کے لیے پہنچے، معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کا فیصلہ اسی معرکہ پر مبنی ہے، ۲۵ر اپریل کو برطانیہ اور آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجیں ہزاروں جانیں تلف کر کے بمشکل تمام آبنائے گیلی پولی کے یوروپین ساحل پر اتریں اور اسی طرح شدید نقصان اٹھانے کے بعد ایک فرانسیسی فوج آبنائے کے ایشیائی ساحل پر اتری پھر بھی مئی کے آخر تک بجز اس کے کہ حملہ آوروں کے چالیس ہزار آدمی مارے گئے اور کچھ حاصل نہ ہوا(۱)، ایشیائی ساحل پر جو فوج اتری تھی اسے بہت جلد بھاگنا پڑا، اب سارا زور گیلی پولی کے مغربی ساحل پر تھا، گیلی پولی میں ترکی فوجوں کی کمان جرمن جنرل لیمان سانڈرس کے ہاتھ میں تھی، اتحادی فوجوں نے پوری قوت کے ساتھ چار زبردست حملے کیے، پہلا حملہ ار مئی سے ۴ر مئی تک قایم رہا، دوسرا ۶ر مئی سے ۸ر مئی تک، تیسرا ۴ر جون کو ہوا اور چوتھا ۲۸ر جولائی کو، اتحادی فوجیں اری برون کے مقام پر اتریں جو چناق بیر کی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اور وہاں سے چناق کی طرف بڑھنا شروع کیا، چناق بیر کی پہاڑی اس محاذ کی کنجی تھی، مصطفےٰ کمال اس وقت وادی میڈوس میں اپنے دستہ کے ساتھ خیمہ زن تھے، جس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اتحادی چناق بیر کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ فوراً پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچتے ہی آسٹریلین فوج کے دستہ پر جو بڑھتا ہوا چلا آ رہا تھا گولہ باری شروع کر دی، تمام دن دونوں طرف سے گولی باری ہوتی رہی اور اتحادی فوج پہاڑی کے دو تہائی حصہ تک پہنچ کر رک گئی،

---

(۱) میریٹ ص ۴۹۴

رات میں بھی مصطفےٰ کمال نے گولہ باری جاری رکھی، وہ چاہتے تھے کہ اتحادی فوج کو ہٹا کر ساحل تک بھگادیں لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، چناق بیر کی پہاڑی حقیقتاً دردانیال کی کنجی تھی اور دردانیال پر قبضہ کرنا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہو جانا تھا، جب فریقین میں سے کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو دونوں نے خندقیں کھود کھود کر حملہ وحفاظت کی تدبیریں شروع کیں، چند ہفتے اسی حالت میں گذر گئے اور دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پر قایم رہے، اب گرمی زیادہ پڑنے لگی تھی، پانی کا فراہم ہونا دشوار ہو رہا تھا، لاشیں پڑی سڑ رہی تھیں اور سپاہیوں میں ہیضہ پھیل رہا تھا، اخیر جولائی تک یہ بات واضح ہوگئی کہ اتحادی فوج ایک بڑے حملہ کی تیاری کر رہی ہے، اس حملہ کے لیے مصر سے تازہ دم فوجیں اور سامانِ حرب کی ایک کثیر مقدار لائی جارہی تھی، مقصد یہ تھا کہ خوجہ چمن کی چوٹی پر قبضہ کرلیا جائے، جو چناق بیر کے شمال میں واقع تھی اور مصطفےٰ کمال کی خندقوں کی زد سے باہر تھی، اس چوٹی پر قابض ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ ترکوں کے حملہ سے محفوظ ہوکر دردانیال پر قبضہ ہو جاتا، ایک ہفتہ سے روز رات کو اتحادی فوجیں آکر خندقوں میں چھپتی جارہی تھیں، آخر ۲/اگست کی تاریک رات میں حملہ شروع ہوا، یہ حملہ تمام سابق حملوں سے زیادہ شدید تھا، اس میں ''کچنر آرمی'' بھی شامل تھی جو اتحادیوں کی سب سے زیادہ مضبوط فوج سمجھی جاتی تھی، جنگی جہاز 'الزبتھ' اور دوسرے سینکڑوں بڑے بڑے جہاز دوسری طرف سے حملہ آور ہوئے، لیکن عین اس وقت جب اتحادی بیڑا فتح کی آخری منزل کے قریب تھا ترکی اور جرمن جہازوں نے الزبتھ اور دوسرے اتحادی جہازوں کی ایک بہت بڑی تعداد غرق کردی، البتہ کچنر آرمی آری برون کی چوٹی کی طرف بڑھنے میں کسی قدر کامیاب ہوئی، اتحادی جہازوں نے پھر گولہ باری شروع کی، ترکی فوجوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا لیکن آری برون پر قبضہ کرنا نہایت ضروری تھا، ورنہ اس کے بعد اتحادی الفنز اپر قابض ہو جاتے اور پھر گیلی پولی پر قبضہ کرلینا آسان تھا، اس نازک گھڑی میں ترکی فوجوں نے وطن کی مدافعت میں جیسی جانبازی دکھائی اس کی مثال خود ان کی

تاریخ میں بھی کم ملتی ہے، اتحادی سارا زور آری بردون کی چوٹی پر قبضہ کرنے کے لیے لگا رہے تھے، ترکی فوجوں کے سپہ سالار اعظم جنرل سانڈرس نے اس محاذ کی کمان مصطفےٰ کمال کو دے دی، لڑائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا، آخرکار اتحادی ہزاروں لاشیں میدان میں چھوڑ کر پسپا ہوئے، اتنی زبردست شکست انھیں اب تک پیش نہ آئی تھی، اس معرکہ میں مصطفےٰ کمال کی غیر معمولی فوجی قابلیت کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھ گیا، ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سر آین ہیملٹن (Sir Ian Hemilton) نے اتحادی فوجوں کی کمال سر سی سی منرو (Sir C. C. Munro) کو سپرد کی، لیکن یہ سپہ سالار بھی حالات کو بہتر بنانے میں ویسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا اس کا پیشرو ہو چکا تھا، اتحادی ماہرین حرب کو مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا کہ گیلی پولی کی مہم سر نہیں ہو سکتی، نومبر میں لارڈ کچنر گیلی پولی آئے مگر وہ بھی اس فیصلہ میں کوئی ترمیم نہ کر سکے، چنانچہ دسمبر کے آخری ہفتہ کی تاریک راتوں میں جبکہ موسم کی شدت اپنے شباب پر تھی اتحادی فوجوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ بھاگنا شروع کیا اور جنوری ۱۹۱۶ء کے پہلے ہفتہ تک تمام فوجیں نکل گئیں، اس مہم میں اتحادیوں کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار تھی (۱) ترکوں کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا، لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ یورپ کا ''مرد بیمار'' اپنے انتہائی ضعف کی حالت میں بھی کتنی حیرت انگیز طاقت کا مالک ہے۔

ایشیائے کوچک: دوسرے محاذوں پر ترکی فوجوں کو ایسی شاندار کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اعلان جنگ کے بعد فوراً ہی ترکی فوجیں بحر اسود میں روسی جہازوں پر حملہ آور ہوئیں اور اس کے بعد قارص اور تفلس کی طرف بڑھیں، لیکن روس نے ایشیائے کوچک میں ولایت آرمینیا پر حملہ کر کے بایزید، کوپری کوئی، اردہان اور ساری کمیشن پر قبضہ کر لیا، ترکوں نے دلیری سے مقابلہ کیا، لیکن آرمینیوں کی غداری کے باعث انھیں ۲۱ اور ۲۲/دسمبر ۱۹۱۴ء کو پسپا ہونا پڑا (۲)، ۱۹/مئی ۱۹۱۵ء کو وان پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو گیا، پھر دوسرے سال،

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۸۰ (۲) 'ترک اور یورپ' از گیلارڈ ص ۳۴

ارض روم، موش، بطلس، طرابزون اور ارزنجان بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے، اس طرح جولائی ۱۹۱۶ء تک ارضِ روم، وان، طرابزون اور بطلس کے صوبوں پر روسی فوجیں قابض ہو گئیں۔ ۱۹/ جنوری ۱۹۱۵ء کو ترکوں نے تبریز فتح کر لیا تھا، لیکن ان شکستوں کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک تبریز پر قابض نہ رہ سکے اور ایرانیوں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

عراق: عراق میں بھی ترکی فوجوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، ۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو انگریزی فوج ایک ہندوستانی پلٹن کے ساتھ شط العرب میں اتری اور ۱۷/ نومبر کو سلیمان کی لڑائی میں کامیاب ہونے کے بعد ۲۲/ نومبر کو بصرہ اور ۵/ دسمبر ۱۹۱۴ء کو کارنا پر قابض ہوگئی، جو دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع ہے، دوسرے سال ۲۹/ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اس نے قط العمارہ بھی فتح کر لیا، اس کے بعد انگریزوں نے بغداد کی طرف بڑھنے کا قصد کیا، لیکن اس درمیان میں تازہ ترکی دستے عراق پہنچ گئے تھے اور انگریزی سپہ سالار جنرل ٹاونسنڈ (Townsend) کو بہت زیادہ نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا، ترکی فوج نے تعاقب کیا اور جنرل ٹاونسنڈ نے قط العمارہ میں پناہ لی، ۵/ ستمبر ۱۹۱۵ء کو ترکوں نے قط العمارہ کا محاصرہ شروع کیا اور ساڑھے چار مہینے تک محاصرہ جاری رہا، آخر مجبور ہو کر ۲۹/ اپریل ۱۹۱۶ء کو جنرل ٹاونسنڈ نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ مع اپنی فوج کے قید کر لیا گیا، وہ قسطنطنیہ لے جا کر نظر بند کر دیا گیا، جہاں اسے ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، بجز اس کے کہ وہ حدودِ شہر کے باہر نہیں جا سکتا تھا، اس کی نظر بندی جنگ کے اختتام تک قایم رہی، قط العمارہ کی کامیابی نے عراق میں ترکوں کی سابق شکستوں کی ایک حد تک تلافی کر دی، لیکن اس کے بعد جنرل ماڈ (Maude) نے پھر حملہ کی تیاری شروع کی اور ۲۴/ فروری ۱۹۱۷ء کو انگریز دوبارہ قط العمارہ پر قابض ہو گئے، ترک لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے، دوسرا معرکہ بغداد میں پیش آیا اور ۱۱/ مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا، ۱۹/ مارچ کو انگریزی سپہ سالار نے عراق کے باشندوں کے نام ایک اعلان شایع کیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ انگریز ان پر حکومت کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ انھیں

آزاد کرنے کے لیے عراق میں آئے ہیں (۱) اہل عراق کو اس آزادی کا جو تجربہ ہوا اسے وہ کبھی نہ بھولیں گے۔

عرب کی بغاوت: ۔ انگریزوں نے ترکوں کے خلاف سازش کا ایک زبردست جال پھیلا رکھا تھا، بغداد کی شکست سے تقریباً ایک سال قبل ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو شریف حسین نے عرب میں ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ۱۴ر جون کو مکہ معظّمہ اور یکم جولائی کو جدہ پر قبضہ کرلیا، کرنل لارنس کی برسوں کی خفیہ کوششیں بارآور ہوئیں، حکومت برطانیہ نے عربوں کی سرپرستی فرمائی اور انھیں ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے میں پوری مدد دی، اکتوبر ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے اپنے شاہِ حجاز ہونے کا اعلان کیا اور ۱۶ر دسمبر کو حکومت برطانیہ نے اس کی مستقل بادشاہت کو باضابطہ طور پر تسلیم کرلیا، اس کا لڑکا امیر فیصل عربی فوجوں کو لے کر ترکوں کے مقابلہ میں شام کی طرف بڑھا، کرنل لارنس اور دوسرے انگریز افسر اس کے ساتھ تھے، شام میں ترکوں کی شکست کا ایک بڑا سبب عربوں کی بغاوت اور ان کا انگریزوں سے مل جانا تھا، برطانیہ نے شریف حسین کو اسلحہ اور روپیہ سے خوب مدد دی، ایسے نازک وقت میں عربوں کا یہ فعل نہ صرف فوجی حیثیت سے دولت عثمانیہ کے لیے مضر ثابت ہوا بلکہ اس کا اخلاقی اثر بھی برا پڑا، چنانچہ ''پان اسلامزم'' کی تحریک کو جسے دنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نوجوان ترکوں نے جنگ شروع کرنے کے بعد پھر جاری کر دیا تھا اس سے سخت نقصان پہنچا، ترکی کے ساتھ اسلامی دنیا کی ہمدردی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس کا سلطان حرمین شریفین کا خادم بھی تھا، اگرچہ خلافت کی بنیاد تمام تر اسی خدمت پر نہ تھی تاہم خلافت جب سے دولت عثمانیہ میں آئی حرمین کی خدمت کا شرف بھی برابر اسے حاصل رہا، اب چونکہ مکہ معظّمہ پر شریف حسین کا قبضہ تھا اور مدینہ منورہ بھی باغیوں سے گھرا ہوا تھا، اس لیے سلطان کی خلافت کا مسئلہ معرضِ بحث میں آگیا اور ''پان اسلامزم'' کی تحریک جو خلافت ہی پر قائم تھی کمزور ہوگئی۔

(۱) لارڈ ایور سلے ص ۳۸۸

مصر: مصر میں بھی ترکوں کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، فروری ۱۹۱۵ء میں جمال پاشا نے نہر سویز کو عبور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت تک انگریزوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے فوجی دستے بھی اس محاذ پر منگا لیے تھے، برطانوی اور فرانسیسی جنگی جہاز پہلے سے نہر کی حفاظت کے لیے موجود تھے، اگر ترکوں نے اعلانِ جنگ کے بعد ہی سویز کو عبور کرنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ آسانی سے کامیاب ہو جاتے، لیکن تین ماہ کی تاخیر نے انگریزوں کو مدافعت کا کافی موقع دے دیا اور جمال پاشا کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا، دوسرے سال جولائی میں ترکوں نے مصر پر حملہ کرنے کی پھر کوشش کی لیکن نہر سویز کے قریب رومانی کی جنگ میں انھیں شکست ہوئی، اس کے بعد امیر فیصل کی فوج انگریزی دستوں کے ساتھ شام کی طرف بڑھی، جس کی وجہ سے ترکوں کو مصر کا خیال ترک کر دینا پڑا۔

بالشویک انقلاب مارچ ۱۹۱۷ء: ۱۳/مارچ ۱۹۱۷ء کو روس میں ''بالشویک انقلاب'' برپا ہوا اور ۱۶/اپریل ۱۹۱۷ء کو امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کیا، روسی انقلاب سے اتحادیوں کی قوت کو جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی امریکہ نے کردی، لیکن یہ انقلاب ترکوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا، انھوں نے ان تمام علاقوں کو جن پر روسی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا واپس لے لیا اور اس کے بعد خود روسی علاقوں میں بڑھنے کی تیاری شروع کی، چنانچہ انور پاشا ایک فوج لے کر کوہ قاف کے محاذ پر پہنچ گئے۔

شام و فلسطین: یہ وہ زمانہ تھا جب اتحادی فوجیں شام اور فلسطین پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی تھیں، شام میں ترکی فوجوں کی کمان جمال پاشا کے ہاتھ میں تھی جو مصر کے محاذ سے واپس آ چکے تھے، مارچ اور اپریل ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوج پوری قوت کے ساتھ غزہ پر حملہ آور ہوئی، لیکن دو ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد بھی آگے نہ بڑھ سکی، اس کے بعد ہی انور پاشا ایک فوج کے ساتھ کوہِ قاف کی طرف روانہ ہو گئے، جس کی وجہ سے شام کے محاذ پر ترکوں کی قوت کمزور ہوگئی اور انگریزی فوج آگے بڑھنے لگی، چنانچہ

۳۱/اکتوبر ۱۹۱۷ء کو انگریزوں نے بیر شیبہ پر قبضہ کرلیا اور ایک ہی ہفتہ کے بعد ۷/نومبر کو غزہ بھی فتح ہوگیا، غزہ کی تسخیر نے شام کا راستہ صاف کردیا اور انگریزی فوج شام اور فلسطین کے تمام اہم مقامات پر یکے بعد دیگرے قابض ہوتی گئی، چنانچہ ۹/دسمبر ۱۹۱۷ء کو یروشلم نے ہتھیار ڈال دیے اور جنرل النبی ایک فاتح کی حیثیت سے بیت المقدس میں داخل ہوا، لیکن اس مقام کا اتنا احترام ملحوظ رکھا کہ پیدل داخل ہوا، بیت المقدس کی فتح سے تمام مسیحی یورپ میں مسرت وشادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی، صدیوں کی پیہم کوشش کے بعد صلیبی علم اس ارضِ پاک پر ایک بار پھر لہرانے لگا، ستمبر ۱۹۱۸ء میں جنرل النبی (Allenby) عکہ اور حیفہ پر قابض ہوگیا، اس کے بعد ۲۸/ستمبر کو عربی فوج انگریزی فوج سے آملی اور یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں داخل ہوئے، ۶/اکتوبر کو فرانسیسی بیڑہ بیروت کی بندرگاہ میں پہنچا اور دوسرے روز بیروت بھی اتحادیوں کے قبضہ میں آگیا، پھر ۱۳/اکتوبر کو طرابلس، ۱۵/کو حمص اور ۲۶/اکتوبر کو حلب کا آخری مورچہ بھی اتحادیوں نے فتح کرلیا یعنی اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آگئے۔

صلح نامۂ مدرس: شام ترکی فوجوں کا آخری محاذ تھا، حلب کے معرکہ کے بعد ترکوں کی قطعی شکست میں کوئی شبہ باقی نہ رہا، جنگ کے آغاز میں ترکی نے دس لاکھ سے زیادہ فوج میدان میں بھیجی تھی، چار سال کے اندر چار لاکھ ستائیس ہزار سپاہی مارے گئے، چار لاکھ زخمی ہوئے اور ایک لاکھ تیرہ ہزار قید کرلیے گئے یا مفقود الخبر پائے گئے(۱)، مال کا جو نقصان ہوا اس کا اندازہ بھی مشکل ہے، تاہم ترکی نے جو کچھ کر دکھایا، اس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، یورپ کو ترکوں کی فوجی قوت سے اتنی توقع نہ تھی، اتحادی سمجھ رہے تھے کہ چند مہینوں کے اندر ترکی کا خاتمہ کردیں گے اور اس کے حصے بخرے کرکے آپس میں تقسیم کرلیں گے، اسی وجہ سے انھوں نے دردانیال کے حملہ پر اپنی پوری قوت

(۱) لارڈ ایورسلے ص ۳۹۳

صرف کردی تھی اور یہی اس جنگ کا سب سے اہم مورچہ تھا، تاہم ترکوں نے جس حیرت انگیز سرفروشی کے ساتھ دردانیال کو دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، لیکن شام کی پیہم شکستوں کے بعد یہ ظاہر ہوگیا کہ ترک جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتے، حلب کی جنگ سے تقریباً ایک ماہ قبل ۳۰ ستمبر کو بلغاریا نے جو ترکی اور جرمنی کا حلیف تھا، اتحادیوں کے سامنے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دئے تھے اور خود جرمنی بھی میدانِ جنگ سے علاحدہ ہورہا تھا، ایسی صورت میں جبکہ اس کے حلیفوں کی قوت بھی بالکل ٹوٹ چکی تھی، ترکی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اتحادیوں سے صلح کی خواہش کرے، صلح کی گفتگو کے لیے رؤف بے وزیر بحریہ، رشاد حکمت بے نائب وزیر خارجہ اور سعد اللہ بے تھرڈ آرمی کے جنرل اسٹاف کے صدر روانہ کیے گئے، ۳۰/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں اور اتحادیوں کے درمیان مدرس کے مقام پر عارضی صلح کے شرائط طے ہوگئے اور صلح نامہ پر فریقین نے دستخط کردئے، اس درمیان میں انور پاشا، جمال پاشا اور طلعت پاشا نیز انجمن اتحاد وترقی کے بہت سے ممبر یہ دیکھ کر کہ وہ ملک کو اب کسی طرح بچا نہیں سکتے اور نہ ان شرائط پر راضی ہوسکتے جو اتحادیوں کی طرف سے عاید کی جائیں گی، ترکی سے باہر چلے گئے اور حکومت کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ گئے جو اس نازک وقت میں کسی طرح اس کے اہل نہ تھے، یوں ۱۹۱۸ء میں انجمن اتحاد وترقی کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے لیڈروں نے ملک سے روپوش ہوکر خود انجمن کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے مٹا ڈالا۔

عارضی صلح کے بعد اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ، ملیشیا اور چناق پر قبضہ کرلیا، ترکی فوجیں یہ سمجھ کر کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہوجائے گا منتشر ہونے لگیں، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد انھیں معلوم ہوگیا کہ وہ دھوکے میں ہیں، کیونکہ جب اتحادیوں نے یہ دیکھا کہ ترکی کی فوجی قوت ٹوٹ چکی ہے اور تمام ملک میں ابتری پھیلی ہوئی ہے تو ان خفیہ معاہدوں کی تکمیل کا حوصلہ پیدا ہوا جو باہم دورانِ جنگ میں کیے گئے تھے، پروفیسر ٹوائن بی (Toynbee) نے اپنی کتاب ''ترکی'' میں لکھا ہے

کہ ''جس طرح بھوکے بھیڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح اتحادی طاقتیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں کیوں کہ ترکی فطرتاً ایک زرخیز ملک ہے اور شہنشاہیت حریص واقع ہوئی ہے'' (۱)، وہ خفیہ معاہدے ذیل تھے:

خفیہ معاہدے: پہلا معاہدہ جو ''معاہدۂ قسطنطنیہ کے نام سے مشہور ہے ۱۸/ مارچ ۱۹۱۵ء کو برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا تھا، یہ خاص طور پر قسطنطنیہ، آبنائے باسفورس اور دردانیال سے متعلق تھا، طے یہ پایا تھا کہ روس، قسطنطنیہ، باسفورس کے دونوں ساحلوں اور بحیرہ مارمورا اور دردانیال کے مغربی ساحل پر قبضہ کر لے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ اتحادیوں کے تجارتی جہازوں کے لیے کھلی رہے، دوسری دفعہ یہ تھی کہ ایران کا نام نہاد ناقابل مداخلت خطہ (Neutral zone) جس کی تصریح ۱۹۰۷ء کے معاہدہ روس وانگلستان میں ہو چکی تھی اور جو تیل کے چشموں کی وجہ سے ایک نہایت قیمتی خطہ تھا برطانیہ کے حلقۂ اثر میں رکھا جائے، تیسری دفعہ کے مطابق یہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات دولت عثمانیہ سے نکال کر ایک خود مختار اسلامی حکومت کو دے دیے جائیں، آخری دفعہ میں روس نے وعدہ کیا کہ اگر ضرورت ہوگی تو دردانیال کے حملہ میں حکومت روس اتحادیوں کی مدد کرے گی۔

دوسرا معاہدہ ''لندن کا خفیہ معاہدہ'' تھا، جس پر ۲۶/ اپریل ۱۹۱۵ء کو اٹلی، فرانس، برطانیہ اور روس کے نمایندوں نے دستخط کیے تھے، یہ معاہدہ اٹلی کو جنگ میں شریک کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا اور اس میں ایشیائی ترکی کی تقسیم کے وقت اٹلی کو بعض خاص علاقے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، مثلاً عدالیہ کا صوبہ اور اس سے متصل بحر روم کے ساحلی علاقہ کا ایک ''معقول'' حصہ۔

تیسرا ''معاہدۂ سائیکس پیکو'' (Sykas Picot Agreement) جس پر ۱۶/ مئی ۱۹۱۶ء کو دستخط ہوئے تھے، برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان ہوا تھا اور اس میں

(۱) ترکی از آرنلڈ ٹوائن بی (Turkey by Arnold Toynbee) مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء ص ۶۸

سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویزیں مرتب کرلی گئی تھیں اس میں سب سے پہلے عربوں کو دولت علیہ سے باغی کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ عربوں کی ایک مستقل خود مختار حکومت یا عرب مملکتوں کی ایک وفاقی حکومت قایم کردی جائے پھر فرانس اور انگلستان کے حلقہ ہائے اثر طے کرلیے گئے تھے اور بعض علاقوں پر قابض ہونے کی اجازت روس کو دے دی گئی تھی، بندرگاہوں اور ریلوے کے متعلق بعض مخصوص حقوق بھی باہم طے کرلیے گئے تھے۔

چونکہ اٹلی اس وقت تک جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہوچکا تھا، اس لیے اس نے ''معاہدہ سائیکس پیکو'' کے متعلق فوائد میں بھی شریک ہونے کا مطالبہ کیا اور برطانیہ اور فرانس کو بادلِ ناخواستہ سلطنت عثمانیہ کی کاغذی تقسیم میں اسے بھی شریک کرنا پڑا، چنانچہ ۱۷/اپریل ۱۹۱۷ء کو انگلستان، فرانس اور اٹلی کے درمیان ''سین ژان مارین'' (St. gean de maurunno) کا معاہدہ طے ہوا، جس میں ایشیائے کوچک کے مغربی علاقوں پر اٹلی کا حلقۂ اثر تسلیم کیا گیا، اس خطہ میں سمرنا بھی شامل تھا، لیکن اس معاہدہ کے قطعی طور پر مکمل ہونے کے لیے روس کے دستخط بھی ضروری تھے اور چونکہ اسی زمانہ میں ''بالشویک انقلاب'' کے رونما ہوجانے سے روس کی شہنشاہی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے دستخط حاصل نہ ہوسکے، اس لیے یہ معاہدہ نامکمل رہ گیا اور قانوناً ناقابل نفاذ قرار پایا، ''صلح کانفرنس'' میں جب انگلستان اور فرانس نے مغربی ایشیائے کوچک اور سمرنا میں یونانیوں کو تسلط دینا چاہا اور اٹلی نے اس معاہدہ کو پیش کرکے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو معاہدہ کے نامکمل ہونے کا یہی قانونی عذر پیش کیا گیا تھا۔(۱)

اندرونی حالت: ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب دولِ متحدہ نے التوائے جنگ کا اعلان کیا تو ترکوں کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور وہ تقریباً ان تمام شرایط صلح کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے جو اتحادیوں کی طرف سے پیش کی جائیں، وجہ یہ تھی کہ ترکی کی اندرونی حالت

(۱) ترکی از ٹوائن بی ص ۷۰-۶۹

اس وقت نہایت درجہ نازک تھی، انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے، کوئی اور منظّم پارٹی موجود نہ تھی جو انجمن اتحاد کی جگہ لیتی، حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آ گئی تھی، اس نے موجودہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا مگر نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا، حکومت نام کے لیے تو سلطان کے ہاتھ میں تھی مگر اصلی فرماں روائی اتحادیوں کو حاصل تھی جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں، التوائے جنگ کے اصولی شرائط یہ تھے کہ دردانیال اور آبنائے باسفورس بالکل آزاد رہیں گے اور اصولِ قومیت اور خود اختیاری کا ہر طرح لحاظ رکھا جائے گا، دفعہ ۷ کے رو سے دولِ متحدہ کے حدود بھی مقرر کر دئے گئے تھے تاکہ جن صوبوں میں ترکی کی اکثریت ہے ان میں مداخلت نہ کی جائے، دفعہ ۲۷ کے لحاظ سے مذکورہ بالا صوبوں میں اتحادی اسی وقت مداخلت کرنے کے مجاز تھے، جب ترکوں کی طرف سے اتحادیوں کے حقوق پر ناجائز حملہ کیا جائے یا آرمینیا کے علاقہ میں فتنہ وفساد رفع کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے لیکن اتحادیوں نے ان شرایط کی خلاف ورزی کی اور بغیر کسی معقول عذر کے قسطنطنیہ، تھریس اور اناطولیہ کے ایک بڑے حصہ پر اپنا تسلط قایم کر لیا، ترکوں میں اس وقت صدائے احتجاج بلند کرنے کی بھی طاقت نہ تھی، اتحادیوں نے التوائے جنگ کے ان اصولی شرایط کی تو خلاف ورزی کی لیکن جو دفعات ان کے مفید مطلب اور ترکی کو بالکل بے دست و پا بنا دینے والی تھیں ان پر نہایت شدومد کے ساتھ عمل درآمد شروع کر دیا، مثلاً ترکی فوجوں کی تخفیف اور سامانِ حرب کا حوالہ کر دینا۔

ترک دس سال سے برابر میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے، جس کی وجہ سے بقول خالدہ خانم "ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا"، وہ ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار تھے لیکن انھیں دولِ متحدہ کے خفیہ معاہدوں کی خبر نہ تھی، جس سے اندازہ ہو جاتا کہ صلح کے لیے انھیں کتنی گراں قیمت ادا کرنی پڑے گی، تاہم عارضی صلح سے قبل ہی ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے اپنی ایک تقریر میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ علاقے جہاں ترکوں کی اکثریت ہے اور دارالسلطنت

قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا، اس کے یہ معنی تھے کہ ترکی کو اپنے دو تہائی مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑے گا، جنگ کے خاتمہ پر ترک اس کو بھی غنیمت سمجھتے تھے اور وہ یہ توقع کر رہے تھے کہ آیندہ غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل کر سکیں گے، لیکن لائڈ جارج کا یہ اعلان جس میں قسطنطنیہ کو ترکوں کے لیے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، ترکوں کے ساتھ ہمدردی پر مبنی نہ تھا، واقعہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ اور دردانیال و آبنائے باسفورس پر معاہدۂ لندن کے مطابق روس کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن جب ۱۹۱۷ء میں ''بالشویک انقلاب'' برپا ہوا اور حکومت روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو جہاں تک روس کے خفیہ معاہدہ کا تعلق تھا تو وہ معاہدہ کالعدم ہو گیا، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ، دردانیال اور آبنائے باسفورس کے علاقوں کا حقدار کون ہے، اس مسئلہ کے متعلق اتحادیوں میں اختلاف شروع ہوا، بالآخر انھوں نے یہ سوچا کہ اگر ان علاقوں کو ترکی کے نام نہاد تصرف میں رکھا جائے تو آپس کی نااتفاقی کا خطرہ دور ہو جائے گا، علاوہ بریں امریکہ نے جنگ میں شرکت اس شرط پر کی تھی کہ دورانِ جنگ کے تمام خفیہ معاہدات منسوخ کر دئے جائیں گے، چوں کہ انگلستان اور فرانس کو اس وقت امریکہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی، اس لیے اس شرط کو منظور کر لیا تھا، پریسڈنٹ ولسن نے کہا تھا کہ ''جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں ان کی نئی تقسیم مدعی ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جائے۔'' ایک اور موقع پر اس نے کہا تھا: ''ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا، اس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں، انصاف ایسا ہونا چاہئے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے، جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے''، خالدہ خانم اس پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں: ''پرانے مدبروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ نوعِ انسانی امن کی آرزومند ہے، ان الفاظ میں جو شکسپیر کا سا زورِ بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس احکام کی طرح پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ اصول بھی یادگار رہیں گے مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اس سے محروم تھا، وہ دنیا کی بزم شوریٰ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آنکلا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا، صلح کی شرطیں انھی پرانے طرز کے مدبروں نے طے کیں، یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حب وطن کے جو معنی سمجھے جاتے تھے ان کے لحاظ سے محبّ وطن بھی تھے مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آرہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے نافہم تھے کہ انھوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محبّ وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی امن وامان کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔(۱)

کیپٹن ہیرلڈ آرم اسٹرانگ جو عارضی صلح کے زمانہ میں برٹش ہائی کمشنر کے ساتھ قسطنطنیہ میں مقیم تھا، بیان کرتا ہے کہ اس وقت انگریز ترکوں کے سخت مخالف تھے اور ان کے خلاف بڑا شوروغل مچارہے تھے، ہر طرف سے یہی آواز اٹھ رہی تھی کہ قسطنطنیہ اور ایا صوفیہ پر مسیحی تسلط پھر قایم کردیا جائے اور ترکوں کو یورپ سے نکال دیا جائے، جو لوگ مذہبی جذبات سے متاثر نہ تھے ان میں بھی جنگ کی پیدا کردہ نفرت کا جذبہ غالب تھا، اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ ترکی کا خاتمہ کردیا جائے اور مسٹر لائڈ جارج اس خیال کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔(۲)

صلح کانفرنس کی بے پروائی: ۱۸؍جنوری ۱۹۱۹ء کو پیرس میں صلح کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا، لیکن اتحادی یوروپین مسائل کا تصفیہ کرنے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ انھیں ترکی کے معاملات کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہوئی، وہ سمجھ رہے تھے کہ ترکی

(۱) 'ترکی میں شرق ومغرب کی کشمکش' از خالدہ ادیب خانم ص ۱۵-۱۱۴ (۲) 'ترکی دروزہ میں' از ہیرلڈ آرم اسٹرونگ (Turkey in traval by Harlod armsrong) ص ۶۴

کے معاملات آسانی سے ملتوی کیے جا سکتے ہیں، چنانچہ وہ انہی گتھیوں کے سلجھانے میں الجھے رہے جو ان کے سابق خفیہ معاہدوں سے پیدا ہو گئی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کے مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور صلح کانفرنس کے لیے مزید دشواریاں پیش آنے لگیں۔

عدالیہ پر اٹلی کا قبضہ: سب سے پہلے ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب ۲۹ر مارچ ۱۹۱۹ء کو اطالوی فوجیں مشرقی اناطولیہ کے ساحل پر عدالیہ میں اتریں اور انگلستان اور فرانس کے احتجاج کے باوجود اس علاقہ پر تیزی کے ساتھ قابض ہونے لگیں، اس احتجاج کے جواب میں اٹلی نے معاہدہ سین ژان دی مارین کا حوالہ دیا، جس کے رو سے سمرنا اور عدالیہ کے علاقہ پر اس کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا، اٹلی نے عدالیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سمرنا کا مطالبہ کرنا شروع کیا، لیکن چونکہ معاہدۂ مذکورہ پر روس کے دستخط نہ ہو سکے تھے، اس لیے انگلستان اور فرانس نے اسے ناقابل نفاذ قرار دیا، اس پر اٹلی کا نمایندہ سائنر آرلینڈو (Signor orlando) ''صلح کانفرنس'' سے علاحدہ ہو گیا۔

سمرنا پر یونانی قبضہ: آرلینڈو کے یوں چلے جانے سے اتحادیوں اور خصوصاً یونان کو یہ اندیشہ ہوا کہ ممکن ہے اٹلی اتحادیوں کی اجازت کے بغیر ہی سمرنا پر قبضہ کر لے اور معاہدۂ ژان دی مارین کے ناقابل نفاذ ہونے کی پروا نہ کرے، صلح کانفرنس میں یونان نمایندہ کا وینزیلوس (وزیراعظم) تھا، جو لائڈ جارج پر غیر معمولی اثر رکھتا تھا، اس نے اس موقع پر سیکڑوں جھوٹے تار کانفرنس میں پیش کیے، جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سمرنا کے علاقہ میں ترک قتل عام برپا کیے ہوئے ہیں اور اس کے ماتحتوں نے غلط نقشے مرتب کر کے یہ ثابت کرنے کے لیے کانفرنس کے سامنے رکھے کہ سمرنا کے شہر اور علاقہ میں یونانی آبادی ترکوں سے بہت زیادہ ہے(۱)، اتحادیوں نے وینزیلوس کے بیانات کو باور کر لیا اور مسٹر لائڈ جارج، پریسڈنٹ ولسن اور کلیمنشو کے دستخط سے حکم نافذ ہوا کہ یونانی فوجیں سمرنا پر قبضہ کر لیں، مسٹر ٹوائن بی لکھتے ہیں کہ اتحادیوں کے اس فیصلہ کے اصلی مقصد

---

(۱) 'ترکی درونہ میں' از آرم اسٹرانگ ص ۸۳

دو تھے، اول یہ کہ یونان کو موقع دیا جائے کہ ایشیائے کوچک میں اپنی قدیم سلطنت کو دوبارہ قایم کرنے کا حوصلہ پورا کرے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ اطالوی ناجائز طور پر اس علاقہ پر قابض نہ ہو جائیں جس سے بین الاقوامی پیچیدگیوں کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، لیکن وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس علاقہ میں ترکوں کی طرف سے نقضِ امن ہو رہا ہے، جس کے باعث یونانی باشندے اور دوسری اقلیتیں سخت خطرے میں ہیں، لیکن سمرنا پر یونانی قبضہ کے متعلق اتحادیوں کا جو کمیشن تحقیقِ حالات کے لیے مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ نے اس بیان کی تکذیب کر دی، یہ رپورٹ ۱۲/اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیش کی گئی، اس کا ابتدائی حصہ حسب ذیل تھا۔

> ''تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ عارضی صلح کے بعد سے ولایت ایدین کے عیسائیوں کی حالت قابل اطمینان رہی ہے اور ان کی سلامتی خطرہ میں نہ تھی، اگر سمرنا پر قبضہ کا حکم صلح کانفرنس نے غلط اطلاع کی بنا پر دیا تو اس کی ذمہ داری سب سے پہلے ان اشخاص یا حکومتوں پر عاید ہوتی ہے، جنھوں نے بے پروائی کے ساتھ ایسی اطلاع بہم پہنچائی لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ اس قبضہ کے لیے مطلق کوئی وجہ جواز نہ تھی اور اس سے عارضی صلح کی ان شرایط کی خلاف ورزی واقع ہوئی جو دولِ متحدہ اور ترکی کے درمیان طے ہوئی تھیں۔'' (۱)

سمرنا کا قتل عام: بہر حال ۱۵/مئی ۱۹۱۹ء کو یونانی فوجیں برطانوی، فرانسیسی اور امریکن جنگی جہازوں کے ساتھ سمرنا پہنچیں اور شہر اور مضافات کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کرنے لگیں، آرم اسٹرانگ لکھتا ہے: ''انھوں نے ساحل پر اترنے کے بعد فوراً ہی قتلِ عام شروع کر دیا، بندرگاہ کے قریب جو برطانوی جنگی جہاز لنگر انداز تھا اس کے افسروں اور آدمیوں کو حکم تھا کہ بالکل خاموش رہیں، حالانکہ چند ہی گز کے فاصلہ پر یونانی فوجیں

(۱) ترکی از ٹوائن بی ص ۷۲

قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئی تھیں...... سمرنا کے بعد یونانی آگے بڑھے، مکانوں میں آگ لگاتے، لوٹ مار کرتے اور عورتوں کی عصمت دری کرتے ہوئے جیسا کہ بلقان کی قومیں جنگ کی حالت میں کرتی ہیں۔''(۱) ٹوائینی یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: ''۱۵ر مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی جیسے کوہِ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہوگیا، جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعۃً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہوگیا، محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لیے گئے، عقبی خطہ کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں، ایک فوجی دیوار کھڑی ہوگئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرونِ ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کردیا، لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سرنگیں مسمار کردی گئیں، ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لیے گئے یا جلاوطن کردیے گئے، غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔''

وطنی تحریک: ترکوں کا شیرازۂ ملت اس وقت بالکل منتشر ہو رہا تھا، لیکن خودداری اور وطنیت کا جذبہ ابھی فنا نہیں ہوا تھا، یونانیوں کے جواب میں ان کی طرف سے جو ردِ عمل ہوا اس کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ''اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا، جس میں کسان، پہاڑی لوگ اور عورتیں تک شامل تھیں،'' بہت سے فوجی افسر قسطنطنیہ سے بھاگ کر تھریس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا، یونانیوں کی فوج اس وقت اسی ہزار سے زیادہ پہنچ چکی تھیں، یہ فوج اب اسی علاقہ تک محدود نہ رہی، جہاں تک کانفرنس نے اجازت دی تھی بلکہ اس نے اور بھی آگے قدم بڑھانے شروع کیے، سمرنا باقاعدہ طور پر یونانی حکومت کا

(۱) 'ترکی دروزہ میں' از آرم اسٹرانگ ص ۸۴-۸۳

مرکز قرار دیا گیا، یونانی تسلط کی خبر سرعت کے ساتھ تمام ترکی علاقوں میں پھیل گئی، ہر طرف احتجاج کے جلسے کیے گئے اور سارے ملک میں دفعتہً ایک وطنی تحریک کی لہر دوڑ گئی، یہ تحریک عام طور پر مصطفےٰ کمال پاشا کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ وہی اس کے روح رواں تھے، لیکن یونانیوں کے قتل و غارت کا جو سیلاب سمرنا سے شروع ہو کر تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اس نے ہر ترک کے دل میں وطن کی حفاظت کا جذبہ مشتعل کر دیا تھا اور سرفروشوں کی جماعت اس سیلاب کو روکنے کے لیے ایک آہنی دیوار کی طرح قایم ہو گئی تھی۔

اسی تحریک سے ترکوں کی تاریخ کا جمہوری دور شروع ہوتا ہے، سلطنت نام کے لیے تو ۱۹۲۳ء تک قایم رہی لیکن حقیقتاً ۱۹۱۸ء میں اتحادی طاقتیں اس کا گلا گھونٹ چکی تھیں، ترکی سلطنت فنا ہو گئی، لیکن ترک قوم زندہ تھی، صلح نامہ مدرس کے بعد سے اعلان جمہوریہ تک اس نے وطن کو دشمنوں کی آہنی گرفت سے آزاد کرانے میں جیسے حیرت انگیز ثبات و عزم کی مثال پیش کی، وہ قوموں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، ان کارناموں کی تفصیل آیندہ جلد میں بیان کی گئی ہے۔

نظامِ حکومت

سلطنت عثمانیہ کے بانی جب اول اول ایشیاے کوچک میں آئے تو ان کی حیثیت ایک خانہ بدوش قوم سے زیادہ نہ تھی، لیکن وہ اپنے اندر شجاعت اور تنظیم کی قوت رکھتے تھے، جو خانہ بدوش قوموں میں فطرت کے تغیرات وحوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے خلقی طور پر پائی جاتی ہے، ایسی قوموں کی زندگی نہایت باقاعدہ اور منظم ہوتی ہے، ان کی تمام نقل وحرکت میں شدید فوجی ضبط پایا جاتا ہے، یہ قومیں جب زرعی اور تجارتی آبادیوں کی طرف بڑھتی ہیں تو اپنی اعلیٰ تنظیم کی وجہ سے ناقابل مزاحمت ہو جاتی ہیں اور اپنے سے زیادہ متمدن لیکن کم جفاکش قوموں کو شکست دے کر سلطنت قایم کر لیتی ہیں، باوجود اس کے کہ انھیں حکمرانی کا تجربہ پہلے سے نہیں ہوتا، وہ اپنی سابق زندگی کے تجربات سے اس نئی زندگی میں بھی کام لیتی ہیں، وہ اب بھی ''راعی'' ہوتی ہیں البتہ رعایا کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

یہی صورت حال عثمانی ترکوں کی تھی، انھوں نے ایشیاے کوچک میں داخل ہو کر ایک سلطنت کی بنیاد رکھی جو تین صدیوں کے اندر دنیا کی وسیع ترین اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت ہوگئی، اس کی رعایا میں کرد، البانی، یونانی، ایرانی، عرب، سلافی اور جرمن ہر قوم کے باشندے شامل تھے، لیکن جو چیز ان ترکوں کو دوسری خانہ بدوش قوموں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی سلطنت کی پائداری ہے، خانہ بدوش قوموں کی حکومت ڈیڑھ دو سو برس سے زیادہ نہیں چلتی، عثمانی ترکوں نے جس سلطنت کی بناڈالی، وہ

چھ سو سال سے زیادہ قایم رہی اور آج بھی ایک مختصر مگر طاقتور جمہوریہ کی شکل میں موجود ہے، سلطنت کے اتنی مدت تک قایم رہنے کا باعث محض عثمانیوں کی فطری جنگجوئی نہیں ہے کیوں کہ یہ جوہر تو بعض دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے بلکہ اس کا اصلی سبب ان کا حیرت انگیز نظامِ حکومت ہے، جو اپنے زمانہ میں دنیا کا بہترین نظام سمجھا جاتا تھا، اس کے متعلق پروفیسر لی بائر (Lybyer) اپنی محققانہ تالیف ''عثمانی نظامِ سلطنت در عہد سلیمان ذی شان'' میں لکھتے ہیں:

> ''دنیا میں عثمانی نظامِ حکومت سے زیادہ دلیرانہ تجربہ اتنے بڑے پیمانہ پر شاید نہیں کیا گیا ہے، جو نظریہ اس سے قریب ترین مشابہت رکھتا ہے وہ افلاطون کی جمہوریہ میں پایا جاتا ہے اور جو نظام عملاً اس کی نظیر ہے وہ مصر کا مملوکی نظام ہے، لیکن عثمانی نظام اول الذکر کی اشرافی یونانی حد بندیوں میں محدود نہ تھا اور آخر الذکر کو مغلوب کر کے یہ اس سے زیادہ عرصہ تک قایم رہا، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جو پہلے جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتے تھے اور پھر ترقی کر کے صدارت کی کرسی پر پہنچ گئے، لیکن انھوں نے یہ مرتبہ صرف اپنی کوشش سے حاصل کیا نہ کہ کسی ایسے نظام کے سلسلۂ مدارج کے ذریعہ جو انھیں ترقی دینے کے لیے باقاعدہ مرتب کیا گیا ہو، کلیسائے رومہ اب بھی ایک کسان کو تعلیم و تربیت دے کر پوپ بنا سکتا ہے، لیکن اس نے کبھی اپنے امیدواروں کو تقریباً بلا استثنا انہی خاندانوں سے منتخب نہیں کیا جو ایک مخالف مذہب کے پیرو ہوں، عثمانی نظام عمداً غلاموں کو لیتا تھا اور انھیں سلطنت کی وزارتوں پر مامور کر دیتا تھا، وہ بھیڑوں کی چراگاہوں اور کھیتی باڑی کے کام سے چھڑا کر لڑکوں کو لاتا تھا اور انھیں درباری امیر اور شہزادیوں کے شوہر بنا دیتا تھا، وہ ایسے نوجوان

کو لیتا تھا جن کے آبا و اجداد صدیوں سے عیسائی ہوتے اور انھیں سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے حکمراں اور نا قابل تسخیر فوجوں کے سپاہی اور جنرل بنا دیتا تھا، جن کی سب سے بڑی خوشی اس میں تھی کہ صلیب کو شکست دے کر ہلال کو سر بلند کریں، وہ اپنے نو آموزوں سے کبھی یہ سوال نہیں کرتا تھا کہ ''تمہارا باپ کون تھا''، یا تم کیا جانتے ہو''، یہ بھی نہیں کہ ''تم ہماری زبان بول سکتے ہو؟'' بلکہ وہ ان کے چہروں اور جسموں کو غور سے دیکھنے کے بعد ان سے کہتا تھا: ''تم ایک سپاہی بنو گے اور اگر لیاقت کا ثبوت دو گے تو ایک جنرل ہو جاؤ گے'' یا ''تم ایک عالم و فاضل اور معزز شخص ہو گے اور اگر تمہارے اندر قابلیت موجود ہے تو گورنر اور وزیر اعظم بھی بن جاؤ گے۔''(۱)

ادارۂ حکومت: نظامِ سلطنت دو بڑے اداروں پر مشتمل تھا، ایک ادارۂ حکومت اور دوسرا ادارۂ اسلامیہ، ادارۂ حکومت میں سلطان، اس کا خاندان، حکومت کے انتظامی افسر، مستقل سوار اور پیدل فوج اور نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد جو مستقل فوج، دربار اور حکومت کے لیے زیر تعلیم رہا کرتی تھی شامل تھی، انہی کے ہاتھوں میں تلوار، قلم اور حکومت کی باگ تھی، یہی پوری سلطنت کا انتظام کرتے تھے، البتہ وہ امور جو قانونِ شرع کے ماتحت تھے شرعی عدالتوں کے سپرد کر دئے گئے تھے اور وہ معاملات جو سلطنت کی غیر مسلم رعایا اور غیر ملکی باشندوں کے جماعتی نظام سے تعلق رکھتے تھے انہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے گئے تھے، اس ادارہ کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں کہ چند مستثنیات کے علاوہ اس کے ارکان وہی لوگ تھے جو عیسائی والدین کی اولاد تھے اور اس کا ہر رکن سلطان کے غلام کی حیثیت سے ادارہ میں داخل ہوتا تھا اور تمام عمر سلطان کا غلام رہتا تھا خواہ جاہ و

(1) The Government of the ottaman Empire in the time of Suleman the magnificent by A. H. Lybyer, P45

ثروت اور اقتدار وعظمت کے کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے۔

داخلہ کا طریقہ: جو لوگ اس ادارہ میں داخل کیے جاتے تھے وہ چار طریقوں سے آتے تھے، ۱- یا وہ جنگ میں گرفتار کیے جاتے تھے، ۲- یا خریدے جاتے تھے، ۳- یا بطور ہدیہ کے بھیجے جاتے تھے، ۴- یا خراج میں حاصل کیے جاتے تھے، پروفیسر لی بائر لکھتے ہیں کہ اس ادارہ میں داخل ہونے کے لیے غلامی کے دروازہ سے آنا ضروری تھا اور یہ دروازہ صرف دس سے بیس سال تک کے عیسائی لڑکوں کے لیے کھلا ہوا تھا، بعض مغربی مورخین کا یہ بیان صحیح نہیں کہ عموماً آٹھ سال کے لڑکے لیے جاتے تھے، تحقیق یہ ہے کہ جو چودہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکوں کو ترجیح دی جاتی تھی اور صرف غیر معمولی صورتوں میں بارہ سال سے کم یا بیس سال سے زیادہ کے لڑکے لیے جاتے تھے (۱)، یوروپین مورخین صرف خراجی لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن پروفیسر موصوف نے ثابت کیا ہے کہ سالانہ بھرتی میں خراجی لڑکوں کی تعداد نصف سے کم ہوتی تھی، سلیمان اعظم کے عہد میں جب یہ نظام مکمل ہو چکا تھا سالانہ بھرتی کا اوسط سات آٹھ ہزار تھا، جس میں خراجی لڑکوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

خراجی لڑکوں کی بھرتی کا طریقہ جسے ''دوشرمہ'' کہتے تھے، یہ تھا کہ عموماً ہر چار سال کے بعد اور اگر ضرورت ہوئی تو اس سے پہلے بھی عہدہ داروں کی ایک جماعت جو لڑکوں کے پرکھنے میں بہت مہارت رکھتی تھی، حکومت کی طرف سے ان علاقوں میں بھیجی جاتی تھی جہاں سے خراج آتا تھا، سلیمان اعظم کے زمانہ میں پورا جزیرہ نمائے بلقان، ہنگری ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل اور بحر اسود کے جنوبی اور مشرقی سواحل خراجی لڑکے فراہم کرتے تھے، مگر سب سے زیادہ مضبوط اور ہونہار نوجوان البانیا اور جنوب کی سلانی قوموں سے آتے تھے۔

(1) The Government of the ottaman Empire in the time of Suleman the magnificent by A. H. Lybyer, P 48

جو والدین اپنے لڑکوں کو دینا نہیں چاہتے تھے وہ بچپن ہی میں ان کی شادی کر دیتے تھے کیوں کہ ایسے لڑکے نہیں لیے جاتے تھے، دولت مند اشخاص بھرتی کرنے والے افسروں کو کچھ دے دلا کر بھی اپنے لڑکوں کو بچا لیتے تھے، برخلاف اس کے بہت سے والدین خوشی کے ساتھ اپنے لڑکوں کو بھیجنا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس طرح یہ لڑکے افلاس کی مصیبت سے نجات پا جائیں گے، اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کریں گے اور ترقی کر کے بڑی بڑی جگہوں پر پہنچ جائیں گے، پروفیسر لی بائر کا بیان ہے کہ بعض والدین اس طریقہ کو بجائے بار کے رعایت سمجھنے لگے تھے اور ترک ان پر رشک کرتے تھے، کیوں کہ مسلمانوں کے لڑکے اس ادارہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، اس قاعدہ کی پابندی سے بچنے کے لیے ترک بعض اوقات عیسائیوں کو روپیہ دے کر اس بات پر راضی کر لیتے تھے کہ وہ ان کے لڑکوں کو اپنا بنا کر بھرتی کرا دیں۔(۱)

ادارۂ حکومت کا تعلیمی نظام: اپنے وسیع ترین مفہوم میں ادارۂ حکومت ایک مدرسہ تھا جس میں طلبہ تمام عمر کے لیے داخل کیے جاتے تھے، اس مدرسہ میں ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور جسم و دماغ دونوں کی تربیت یکساں توجہ سے ہوتی تھی، البتہ یہ چیز خاص طور پر پیش نظر رہتی تھی کہ یہ مدرسہ دراصل فن جنگ اور فن حکومت کی تعلیم کا ہے، طلبہ سخت ضابطوں کے اندر رکھے جاتے تھے، انھیں بتدریج ترقی دی جاتی تھی اور حسب لیاقت انعامات اور اعزازات ملتے رہتے تھے، مدرسہ کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر سخت سزائیں بھی دی جاتی تھیں، دماغی تربیت اگرچہ ایک حد تک سب کو دی جاتی تھی لیکن جو طالب العلم استعداد کے لحاظ سے بہترین ہوتے انھیں مشرقی زبانوں اور اسلامی وعثمانی قوانین کا ایک مشکل نصاب جس میں اخلاقیات اور دینیات دونوں کی تعلیم شامل ہوتی پڑھایا جاتا تھا، پروفیسر لی بائر اس نظام تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

---

(۱) لی بائر ص ۵۴۔

''افلاطون سلطان کے وسیع خاندان کی تعلیم و تربیت دیکھ کر
خوش ہو جاتا، گو اس خاندان کی کم اصلی اس کی طبیعت کو متنفر کر دیتی،
اسے یہ بات پسند آتی کہ تعلیم عمر بھر جاری رہتی تھی، جسم و ذہن کی یکساں
احتیاط کے ساتھ تربیت ہوتی تھی، حکمرانوں اور سپاہیوں میں تفریق کی
جاتی تھی (اگرچہ یہ تفریق مکمل نہ تھی) یہ لوگ ایک حد تک گھر بار کی
پابندیوں سے آزاد رکھے جاتے تھے، فرد کی ساری زندگی اس نظام کے
شدید ضوابط کی پابند ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت
دانشمندوں کے ہاتھ میں تھی، یہ تو غالباً کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ عثمانی
نظام کے بانی افلاطون کے خیالات سے واقف تھے یا نہیں، لیکن اس
کے منصوبہ کو جہاں تک عملاً پورا کرنا ممکن تھا انھوں نے کر دکھایا، بعض
حیثیتوں سے انھوں نے افلاطون سے بہتر نظام قایم کیا، مثلاً یہ کہ
توارث کی بے اعتباریوں کو دور کیا، نظم و نسق کے لیے شخصی اقتدار بہم
پہنچایا، توازن قواء کے ذریعہ استقلال و پائیداری کا تحفظ کیا اور اپنے
اس نظام کو ایک وسیع سلطنت کے قابل بنا دیا۔''(۱)

وہ تمام لڑکے جو بھرتی کیے جاتے تھے خواہ مذکورۂ بالا طریقوں میں سے کسی طریقہ سے لائے گئے ہوں، پہلے امتحان کے لیے ماہر افسروں کے سامنے پیش ہوتے تھے جو انھیں استعداد کے لحاظ سے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دیتے، جسمانی حیثیت اور ذہنی قابلیت کے اعتبار سے جو معیار کے مطابق ثابت ہوتے وہ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کر لیے جاتے، باقی زیادہ تر جسمانی تربیت کے لیے علاحدہ رکھے جاتے۔

جو امیدوار اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، ان میں سے کچھ صوبوں کے گورنروں اور دارالسلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے پاس بھیج دئے جاتے تھے اور

(۱) لی بائر ص ۷۳۔

وہاں ان کی تربیت غالباً اسی طرح ہوتی تھی جس طرح ان امیدواروں کی جو سلطان کے ساتھ رہتے تھے، ان میں سے منتخب ترین جن کی سالانہ تعداد غالباً دو سو یا کل بارہ سے پندرہ سو تک ہوتی تھی اور نہ، غلطہ اور استنبول کے شاہی محلوں میں بھیج دئے جاتے تھے، انھیں تعلیم و تربیت کا ایک سخت نصاب پورا کرنا پڑتا تھا جو بارہ سال میں ختم ہوتا تھا، ان کو عربی فارسی کی ادبی تعلیم دی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ ورزش، فنونِ حرب، شہسواری اور کوئی دستکاری بھی سکھائی جاتی تھی، انہی میں سے حکومت کے انتظامی شعبہ کے لیے امیدوار چنے جاتے تھے اور عملی تعلیم کی غرض سے قصر سلطانی کی چھوٹی چھوٹی خدمتوں پر مقرر کردئے جاتے تھے، اپنی لیاقت کی وجہ سے جتنا قریب وہ سلطان کی ذات سے ہوتے جاتے تھے اتنی ہی بڑی جگہ انھیں مدتِ تعلیم پوری کرنے کے بعد ملتی تھی، یہ مدت عموماً پچیس سال کی عمر تک پوری ہوجاتی، اس وقت ہر امیدوار مدرسہ سے باہر نکل آتا اور حسب لیاقت اسے کوئی بڑا عہدہ دے دیا جاتا، یہی لوگ ترقی کرکے شہروں کے گورنر، صوبوں کے والی، فوجوں کے کمانڈر اور سلطنت کے وزیر بن جاتے تھے اور انہی میں سے بعض صدر اعظم کے عہدہ پر بھی فائز ہوتے تھے، سلیمان اعظم کا مشہور وزیر ابراہیم تقریباً براہِ راست صدر اعظم بنادیا گیا تھا، لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے ترقی کے قاعدہ کو توڑا اور اسی مثال سے آیندہ بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں، انتظامی شعبہ کے لیے انتخاب کرنے کے بعد ان فارغ التحصیل امیدواروں کی اکثریت باضابطہ سوار فوج میں جسے ''باب عالی کے سپاہی'' کہتے تھے داخل کردی جاتی تھی، ان کو رخصت کرنے کی ایک خاص تقریب ہوا کرتی تھی، ہر امیدوار کو بلاکر سلطان بہ نفس نفیس اس کی تعریف وتحسین کرتا اور اس کی نئی خدمت کے لیے حوصلہ افزائی فرماتا، وہ ہر ایک کو ایک زردوزی کا کوٹ اور اپنے خوبصورت گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا عطا کرتا، اکثر کچھ نقد بھی دیتا، یہ نوجوان ان تمام تحائف کو لے کر جو انھوں نے اپنے دورانِ قیام میں پائے تھے، ایک جلوس کے ساتھ محل کے بڑے پھاٹک تک جاتے اور وہاں گھوڑے پر سوار ہوکر ہمیشہ کے لیے اس مدرسہ سے

رخصت ہو جاتے۔(۱)

دوسری جماعت کے امیدواروں کی تربیت زیادہ تر جسمانی، صنعتی اور فوجی ہوتی تھی اور انھیں ترکی زبان اور اسلامی اصول زبانی سکھائے جاتے تھے، ان کا منتخب حصہ ینی چری بنایا جاتا تھا، پہلے ان کو اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا کہ ترکی زبان اور ترکی طرزِ معاشرت سے واقفیت حاصل کرلیں اور کھیتوں میں کام کرنے سے ان کے جسم خوب مضبوط ہو جائیں، دو تین سال کے بعد ان کے معائنہ کے لیے قسطنطنیہ سے افسر آتے تھے، اگر وہ ترکی زبان کافی سیکھ چکے ہوتے تھے اور ان کے جسم توانا ہو جاتے تھے تو انھیں ترقی دے کر قسطنطنیہ بھیج دیا جاتا تھا، وہاں سے کچھ جہازوں پر کام کرنے کے لیے روانہ کردئے جاتے، کچھ شاہی محلوں میں باغباں (بوستانجی) مقرر کردئے جاتے اور کچھ پبلک عمارتوں میں کام پر لگادئے جاتے، انھیں لکھنا پڑھنا سیکھنے کی اجازت تھی، لیکن وہ اس پر مجبور نہیں کیے جاتے، امیدواری کے اس دوسرے درجہ میں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد جیسے جیسے وہ تیار ہوتے جاتے انفرادی انتخاب سے ینی چری کے دستوں میں بغرض تعلیم بھیج دئے جاتے اور جب فن حرب میں انھیں مہارت حاصل ہو جاتی تو مکمل ینی چری کی حیثیت سے شامل کرلیے جاتے۔

بنیادی اصول: سلطنت عثمانیہ کی قوت اس کے ادارۂ حکومت کے زبردست نظام پر قایم تھی، اس نظام کے خاص اصول یہ تھے: امیدواروں کا عمدہ انتخاب، تعلیم وتربیت کی سخت نگرانی، شدید ضبط وتادیب اور پرجوش مقابلہ، ہر امیدوار اپنی کوشش سے ترقی کرکے اونچے درجہ پر پہنچ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک روز صدر اعظم بھی بن سکتا تھا، ترقی صرف قابلیت پر منحصر تھی، اس کلیہ میں واحد استثنا شاہی خاندان تھا، اسی ایک صورت میں نسل کا امتیاز تسلیم کیا جاتا تھا یعنی زمامِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے لیے عثمان کا جانشین ہونا کافی سمجھا جاتا تھا، جو لڑکے اس نظام میں داخل کیے جاتے تھے انھیں عیسائی مذہب ترک

(۱) لی بائر ص ۸۱۔

کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا لیکن اسلامی ماحول کے اثر سے وہ خود بخود برضا ورغبت مسلمان ہو جاتے تھے (۱)، اس پورے نظام کا مرکزی اصول یہ تھا کہ اس میں سلطان کی آزاد مسلمان رعایا جس کے والدین مسلمان تھے داخل نہیں ہو سکتی تھی اور ادارۂ حکومت صرف عیسائی غلاموں کے لیے مخصوص تھا، ان غلاموں کے لڑکے آزاد مسلمانوں کے طبقہ میں شامل ہو جاتے تھے اور ادارۂ حکومت سے خارج سمجھے جاتے تھے، اس اصول کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کے کام جن لوگوں کو سپرد کیے جائیں ان کا انتخاب محض قابلیت کی بنا پر ہو اور انھیں سخت ضوابط وقواعد کے ماتحت تعلیم دی جائے اور جب وہ اقتدار وحکومت کی ان بلند جگہوں پر پہنچ جائیں جو انھوں نے اپنی لیاقت سے حاصل کی ہوں تو اس وقت کوئی موروثی حکمراں طبقہ جو شاہی خاندان کی جگہ لے سکے قایم نہ کرسکیں، لیکن سلیمان کے بعد اس اصول کی بندش ڈھیلی ہوگئی، ارکانِ حکومت نے سلطان پر دباؤ ڈال کر یہ اجازت حاصل کرلی کہ ان کے لڑکوں کا تقرر ان کی جگہوں پر ہو سکتا ہے، اس کے بعد دوسرے مسلمانوں نے بھی جو سابق عیسائی غلاموں کی اولاد نہیں تھے، فوجی اور ملکی ملازمتوں میں اپنے مساوی حقوق تسلیم کرالیے، اسی وقت سے نظام حکومت میں زوال شروع ہوا اور سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ نہ وہ یوروپین طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل رہی اور نہ اپنی عیسائی رعایا پر قابو رکھ سکی۔

ارکان ادارہ کے حقوق: ادارۂ حکومت کا ہر فرد سلطان کا غلام تھا، خواہ وہ سلطنت کے اونچے سے اونچے عہدہ پر فائز ہو، قلی (غلام) کا لقب اعزاز وامتیاز کا نشان تھا اور سلطان قلی کا احترام ہر جگہ کیا جاتا تھا، تمام ارکان ادارہ کا چند مخصوص مراعات وحقوق حاصل تھے مثلاً وہ ہر قسم کے ٹیکس سے بری تھے اور سلطان کے علاوہ صرف اپنے افسروں اور اپنی عدالتوں کے جواب دہ تھے، سلطان انھیں ضروریات زندگی کی تمام فکروں سے آزاد کردیتا تھا اور ان میں سے اکثروں کو اتنا کچھ عطا کرتا تھا کہ وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے

(۱) لی بائر ص ۶۶۔

تھے، سب کو شاہی خزانہ سے تنخواہیں ملا کرتی تھیں، بعض اونچے عہدہ داروں کو بڑی بڑی جاگیریں بھی دی جاتی تھیں، مدت تک اس ادارہ کے ارکان معمولی اسلامی عدالتوں کے ماتحت رہے، لیکن چونکہ ان عدالتوں کے قاضی ادارۂ اسلامیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے سلطان کے رعایت یافتہ قلی ان کے سامنے اپنے مقدمات لے جانے میں تامل کرتے تھے اور اسے اپنے مرتبہ کے خلاف سمجھتے تھے، چنانچہ بایزید ثانی نے یہ حکم دیا کہ ان تمام لوگوں کے مقدمات جو ادارۂ حکومت سے وابستہ ہوں خود ان کے افسروں کی عدالتوں میں پیش ہوا کریں، اس وقت سے ان کے لیے جداگانہ عدالتیں قایم کر دی گئیں۔

سلطان: ادارۂ حکومت کا صدر اعلیٰ سلطان تھا، جہاں تک اس ادارہ کا تعلق تھا اس کے اختیارات کی کوئی حد نہ تھی، وہ اس کے تمام ارکان کی جان و مال کا مالک تھا، اس کے اقتدار کی یہ مطلقیت ادارہ کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھی، لیکن اسی میں ایک بڑے خطرہ کا امکان بھی مضمر تھا، چونکہ اس پورے نظام کا مرکز سلطان کی ذات تھی، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اسے عمدہ طریقہ پر چلانے کے لیے سلطان میں طاقت کے علاوہ عقل و فہم، تدبیر و سیاست، عدل و انصاف اور رعایا پروری کے اوصاف بھی اعلیٰ درجہ پر پائے جائیں اور ان سب سے زیادہ ضروری وصف ملکۂ حکمرانی کا تھا جو عثمان سے لے کر سلیمان اعظم تک تمام سلاطین میں بدرجۂ غایت پایا جاتا تھا، جب تک مضبوط اشخاص تخت پر آتے رہے نظامِ سلطنت کی کامیابی حیرت انگیز رہی، جب سے عنانِ حکومت کمزور آدمیوں کے ہاتھوں میں آنا شروع ہوئی اس نظام کا شیرازہ بھی منتشر ہونے لگا، سلیمان اعظم کے بعد جتنے سلاطین آئے وہ بہ استثنائے چند سب کے سب اس ملکۂ حکمرانی سے محروم تھے اور یہی اصلی سبب دولت عثمانیہ کے زوال کا تھا، ادارۂ حکومت کے تمام عہدے صرف قابلیت کی بنا پر دیے جاتے تھے لیکن اس ادارہ کا افسر اعلیٰ وراثت کے حق سے مقرر ہوتا تھا، سولہویں صدی عیسوی تک عثمانی شہزادے مختلف صوبوں کے گورنر بنا دیے جاتے تھے اور اس طرح وہ حکمرانی کی تربیت حاصل کرتے تھے، مگر جب سے سلیمان اعظم کی محبوب ملکہ

خرم سلطان نے شہزادوں کو محل میں بند رکھ کر تعلیم دینے کا طریقہ جاری کرایا، سلطنت کے آیندہ وارث اس ضروری تربیت سے محروم ہو گئے، ان کی زندگی اب زیادہ تر محل کی دلچسپیوں میں گذرنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں حکومت کا بار گراں اٹھانے کی اہلیت باقی نہ رہی، سلیم ثانی کے بعد جو آٹھ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں بھی شریک نہ ہوئے، حالانکہ اس سے پہلے سلاطین فوج کی کمان خود کرتے تھے۔

سلطان بظاہر ایک مطلق العنان فرماں روا تھا، لیکن اس کی مطلق العنانی ادارۂ حکومت تک محدود تھی، اس کے باہر شریعت، ملکی قوانین اور قومی رسم و رواج سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، سلطنت میں چار طرح کے قانون جاری تھے۔

۱-شریعت ۲-قانون یعنی عثمانی سلطانوں کے تحریری فرامین ۳-عادت یا قومی اور ملکی رواج جو قدیم سے چلا آتا تھا اور ۴-عرف یعنی موجودہ سلطان کا ''ادارہ'' یا فرمان، شریعت کے قوانین سلطان سے بالاتر تھے اور وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا، اپنے پیشروؤں کے بنائے ہوئے آئین و دستور کی پابندی اگرچہ اس کے لیے لازمی نہ تھی، تاہم وہ اتنے مفید اور کارآمد تھے کہ انھیں بالکل ترک نہیں کیا جا سکتا تھا، سلیمان اعظم ''قانونی'' کے لقب سے مشہور ہے، لیکن اس نے جتنے نئے قانون اور فرمان جاری کیے، ان سے زیادہ پرانے آئین و دستور کو مرتب اور منضبط کیا، قومی رسم و رواج کا لحاظ رکھنا بھی ضروری تھا، کیونکہ ترک اپنے قدیم رواجوں کے شدت سے پابند تھے اور ان میں کسی طرح کی مداخلت گوارا نہیں کرتے تھے۔

لارنپٹ اپنی تاریخ ترکی میں جو انیسویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، سلطان کی حیثیت کے متعلق بیان کرتا ہے:

''ترکی کا نظم و نسق اس شاہی حکومت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، جسے مونٹسکو (Montesquieu) ''حکومت شخصی بذریعہ

قوانین منضبط'' سے تعبیر کرتا ہے، بہ نسبت اس حکومت کے جو عام طور پر
مطلق العنانی سے مراد لی جاتی ہے یعنی ایسی حکومت جہاں ایک شخص
بغیر کسی قانون اور قاعدہ کے اپنی خود پسندی اور تلون مزاجی کے لحاظ سے
سب پر حکمرانی کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ ترکی میں قانون کا وجود پایا جاتا
ہے بلکہ قانون ہی وہاں سب سے بڑا اور تنہا حاکم ہے، بادشاہ اسی کے
ذریعہ اور اسی کے نام سے حکومت کرتا ہے اور اس کو جو اقتدار حاصل
ہے وہ اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے
بلکہ اس لیے کہ اہل ملک کے مفاد کا تحفظ کرے جن کا وہ سردار ہے،
چنانچہ ترکی میں بادشاہ محض قانون کا محافظ ہے اور وہ تمام لوازم جو اس
کے منصب سے متعلق ہیں صرف اس پر مشتمل ہیں کہ قانون کو خود اپنی
ذات سے لے کر نیچے تمام اشخاص تک ہر ایک کی زد سے بچائے اور یہ
حق محض سلطان کے ساتھ مخصوص نہیں، نبی کریم ﷺ کی مشہور حدیث
کے رو سے کہ '' قانون کی ہر خلاف ورزی کو روکو'' یہی حق سلطان کی ادنیٰ
سے ادنیٰ رعایا کو بھی حاصل ہے اور یہ حدیث ترکی میں قانون یا بالفاظ
دیگر آئین و دستور کی حفاظت انفرادی طور پر تمام باشندوں کے سپرد
کرتی ہے۔''(۱)

قانون کی پاسداری کا اندازہ ایک عجیب و غریب واقعہ سے ہو سکتا ہے،
۱۷۵۵ء میں باب عالی کی عمارت آتش زدگی سے برباد ہوگئی، جب وہ دوبارہ تعمیر کی
جانے لگی تو اس خیال سے کہ آئندہ اس قسم کا حادثہ پیش نہ آئے، یہ طے کیا گیا کہ جو
مکانات اس سے متصل ہیں ان کو خرید کر منہدم کر دیا جائے اور عمارت کے چاروں طرف

---

(۱) ترکی از جارج لارپنٹ مطبوعہ لندن ۱۸۵۴ء جلد دوم ص ۶۵ (Turkey by Sir George Larpent)

کافی جگہ چھوڑ دی جائے، جن لوگوں کے مکانات باب عالی سے ملے ہوئے تھے وہ سب انھیں فروخت کر دینے پر راضی ہو گئے، مگر ایک بوڑھی عورت اپنا مکان چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئی، اس نے کہا کہ اس مکان میں کئی پشتوں سے میرا خاندان رہتا آیا ہے اور میری نگاہوں میں اس کی جو قیمت ہے وہ بڑی سے بڑی رقم سے بھی ادا نہ ہو سکے گی، حکام نے اسے بہت کچھ لالچ دیا، ڈرایا دھمکایا بھی مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئی، مجبوراً اس کا مکان بدستور رہنے دیا گیا، حکومت زبردستی اس پر قبضہ نہ کر سکی، سلطان اپنے تمام اختیارات کے باوجود یہ نہ کر سکا کہ بوڑھیا کو مکان کی قیمت دلوا کر اسے منہدم کرا دیتا(۱) نوشیرواں کے محل اور بوڑھیا کے جھونپڑے کا واقعہ تو ساری دنیا میں مشہور ہے، مگر سلطنت عثمانیہ کے مطلق العنان فرماں روا کا یہ عدل بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔

سلطان کی ایک نمایاں حیثیت یہ تھی کہ وہ ایک جنگجو قوم کا سردار تھا، قدیم ترک سلاطین فوج کی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ فوج کی کمان خود کرتے تھے اور سپاہیوں کی قوم کے سپہ سالار سمجھے جاتے تھے، ترکوں کا بے چوں و چرا احکام سلطانی کی تعمیل کرنا سلطان کی اسی حیثیت کی بنا پر تھا، اس قوم کی ایک خاص خصوصیت نظم وضبط کا فطری ملکہ ہے، چنانچہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں انقلابات کے شاذ و نادر واقع ہونے کا بڑا سبب یہی قومی خصوصیت ہے، بعض سلاطین تخت سے اتارے گئے اور بعض قتل بھی کر دیے گئے، مگر ہمیشہ یہ نتیجہ تھا ینی چری کی بغاوت کا جو ترک نہ تھے یا محل کی سازش کا جس کے تمام عہدہ دار ادارۂ حکومت سے تعلق رکھتے تھے اور عیسائی والدین کی اولاد تھے، ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے علاوہ کوئی عام تحریک کبھی سلطان کے خلاف رونما نہیں ہوئی، نیز یہ واقعہ بھی کم تعجب خیز نہیں کہ باغیوں نے کبھی خاندان عثمان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کو تخت پر بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن خاندان شاہی سے ایسی راسخ وفاداری کے باوجود ترک طبقۂ امرا کو تسلیم

(۱) لارینٹ جلد اول ص ۶۲-۲۶۱۔

نہیں کرتے، شاہی خاندان سے متعلق ہونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ایسے لوگوں کو مخصوص حقوق یا رعایات حاصل تھیں، سلطان کے بہت سے اعزہ ایک حد تک گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے، شہزادوں اور شہزادیوں کی فہرست شائع کرنے کی سخت ممانعت تھی اور سلطان محمد فاتح نے تو صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ شہزادیوں کی اولاد فوج کے اونچے عہدوں پر مقرر نہیں ہو سکتی۔(۱)

قانونِ وراثت: ابتدائی صدیوں میں خاندان شاہی کا قانونِ وراثت یہ تھا کہ بیٹا باپ کا جانشین ہوتا تھا، بھائی اسی وقت تخت پر بیٹھتا جب سابق سلطان کا کوئی لڑکا اس کی وفات کے وقت موجود نہ ہوتا، چونکہ تعداد ازواج کی وجہ سے اکثر مختلف ماؤں سے متعدد لڑکے ہوتے تھے اس لیے تاج وتخت کی خاطر ان میں سخت کشمکش ہوتی اور عموماً وہی لڑکا تخت نشین ہوتا تھا جو اپنے بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا، محمد فاتح نے اس دستور کو قانونی شکل دے کر اور بھی مستحکم کر دیا تھا، چنانچہ اس خیال سے کہ سلطنت فتنہ کی آگ سے محفوظ رہے شہزادوں کا قتل جاری رہا، لیکن سلیمان اعظم کے وقت سے بجائے قتل کے شہزادے محل میں نظر بند رکھے جانے لگے، ۱۶۱۷ء میں جب سلطان احمد کا انتقال ہوا تو اس کے تمام لڑکے نوعمر تھے اور کوئی بھی زمامِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے قابل نہ تھا، دیوان نے صورتِ حال کے تقاضے سے قانونِ وراثت کو بدل دیا اور بجائے اس کے کہ مرحوم سلطان کے کسی لڑکے کو تخت نشین کرتے اس کے بھائی مصطفیٰ کو تخت پر بٹھایا اور اب یہ قانون بنا دیا گیا کہ تخت کا وارث آلِ عثمان کا وہ شہزادہ ہوگا جو عمر میں سب سے بڑا ہو، چنانچہ اس وقت سے برابر اسی قانون پر عمل درآمد ہوتا رہا اور سلطان احمد کے بعد صرف دو سلاطین ایسے ہوئے جو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے: محمد رابع اور عبدالمجید۔

دیوان: سلطان کی مجلس شوریٰ جسے دیوان کہتے تھے، مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھی:

(۱) ’ترکی یورپ میں‘ از اوڈیسی لیس، مطبوعہ لندن ۱۹۰۰ء ص ۱۱۹ (Turkey in Europe by Odyseous)

صدر اعظم اور اس کے ماتحت وزرا، شیخ الاسلام، قاضی عسکر اناطولیہ، قاضی عسکر رومیلیا، بیلر بے اناطولیہ، بیلر بے رومیلیا، آغائے ینی چری، قبودان پاشا یعنی عثمانی امیر البحر، دفتر دار اور نشانجی، یہ سب حکومت کے مختلف شعبوں کے افسر اعلیٰ تھے، دیوان سلطنت کی نہ صرف سب سے بڑی انتظامی مجلس تھا بلکہ عدالت العالیہ بھی تھا، شیخ الاسلام اور دونوں قاضیوں کی شرکت اسی حیثیت سے تھی، اس کا اجلاس رمضان شریف کے علاوہ تمام سال ہفتہ میں چار دن ہوا کرتا تھا، شروع میں سلطان خود اس کی صدارت کرتا تھا، لیکن سلیمان نے یہ طریقہ ترک کر دیا، البتہ وہ مجلس کی کارروائی کی نگرانی متصل کمرہ میں ایک جالی دار کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر کیا کرتا تھا، بعد کے سلاطین کو یہ زحمت بھی گوارا نہ ہوئی اور انھوں نے دیوان کا سارا کام صدر اعظم کے سپرد کر دیا، چنانچہ اب اس کی صدارت مستقل طور پر وہی کرنے لگا اور بحیثیت نمایندہ سلطان اسے تقریباً تمام ملکی، فوجی اور عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے۔

وزرا: شروع میں صدر اعظم کے ماتحت تین وزیر ہوتے تھے، کخیا بے، رئیس آفندی اور چاوش باشی، کخیا بے وزیر جنگ اور وزیر داخلہ کی خدمات انجام دیتا تھا اور صدر اعظم کی غیر موجودگی میں اس کا قایم مقام ہوتا تھا، رئیس آفندی جس کا پورا لقب رئیس الکتاب تھا بیک وقت چیف سکریٹری اور وزیر خارجہ دونوں کا منصب رکھتا تھا، چاوش باشی سلطنت کا میر دربار اور وزیر پولیس تھا۔

دفتر دار اور نشانجی: دفتر دار اور نشانجی سلطنت کی مالیات کے ذمہ دار تھے اور درجہ میں وزرا کے برابر تھے، دفتر دار وزیر مالیات تھا، نشانجی تمام سرکاری کاغذات تیار کرتا تھا اور جس کاغذ پر ضرورت ہوتی، سلطان کا طغرا ثبت کرتا تھا، اس کے ماتحت متعدد عہدہ دار تھے جو حکومت کی ہر کارروائی کی روداد مرتب کرتے تھے۔

بیلر بے: قاضی عسکر کی طرح بیلر بے بھی ابتداءً صرف دو ہوتے تھے، ایک ایشیائی مقبوضات کے لیے اور دوسرا یورپی، لیکن بعد میں ان کی تعداد بڑھا دی گئی اور یہ سلطنت

تحت صوبوں کے والی یا گورنر جنرل مقرر کر دیئے گئے، بیلر بے اپنے صوبہ کے تمام ملکی اور فوجی عہدہ داروں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، صوبے پہلے ایالت کہے جاتے تھے، بعد کو ان کا نام ولایت ہو گیا، ایالتیں ضلعوں میں تقسیم تھیں جن کو سنجق یا لوا کہتے تھے، دونوں کے معنی جھنڈے کے ہیں، ان ضلعوں کے حاکم سنجق بے یا میر لوا کہے جاتے تھے، ہر صوبہ کی ایک مجلس شوریٰ تھی جس کا صدر وہاں کا والی ہوتا تھا، اس مجلس میں ضلعوں کے معزز اشخاص کی ایک تعداد بھی ہوتی تھی جن کو مقامی باشندے اپنے نمایندوں کی حیثیت سے انتخاب کر کے بھیجتے تھے، مقصد یہ تھا کہ ضلع کے انتظام میں وہاں کے لوگوں کو بھی کسی حد تک شریک کیا جائے، نیز یہ کہ جہاں تک ممکن ہو والی کے استبداد کی روک تھام ہوتی رہے، ہر صوبہ کی مجلس ایک چھوٹے پیمانہ پر مرکزی حکومت کے دیوان کا مثنیٰ تھی، اس کے ارکان بھی صوبہ کی حکومت کے مختلف شعبوں کے افسر اعلیٰ تھے۔

ینی چری: سلطنت کی طاقت کا دارومدار بہت کچھ اس کے فوجی نظام پر تھا، ینی چری مستقل پیدل فوج تھی، جس کی حیرت انگیز شجاعت اور نظم و ضبط نے تین سو برس تک یوروپین سلطنتوں کو لرزہ براندام رکھا، دولت عثمانیہ کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کا نتیجہ تھیں، سولھویں صدی عیسوی تک اس میں صرف عیسائی لڑکے بھرتی کیے جاتے تھے، چونکہ وہ نوعمری ہی میں اپنے گھروں سے علاحدہ کر دیئے جاتے تھے، اس لیے ان کے دل والدین یا وطن کی محبت سے ناآشنا رہتے اور ان کی ساری توقعات سلطان کی ذات سے وابستہ ہو جاتیں، وہ اس کے غلام ہوتے اور اسی کی بے چوں و چرا اطاعت کرنے سے ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلتیں، انھیں شادی کرنے کی اجازت نہ تھی، لیکن سلیمان اعظم کے عہد کے آخری حصہ میں ینی چری کے لڑکے بھی اس فوج میں داخل کیے جانے لگے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تجرد کا قانون جو اس فوج کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا، پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا، یہ ایک ایسی بدعت تھی جو بالآخر اس نظام کے لیے مہلک ثابت ہوئی، سلیمان ہی کے عہد میں کچھ مسلمان لڑکے بھی اس میں داخل کر لیے گئے تھے، کبھی

کبھی اس فوج کا کوئی اعلیٰ افسر ایسا بھی ہوتا تھا جس کے والدین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان ہوتے، لیکن جیسا کہ پروفیسر لی بائر نے لکھا ہے، یہ سب استثنائی مثالیں تھیں اور ان کا مجموعی اثر بہت ہی کم تھا۔(۱)

سلیمان کے بعد ینی چری کا نظام برہم ہونے لگا، انھوں نے ۱۵۷۴ء میں مراد ثالث سے یہ رعایت حاصل کرلی کہ ان کے لڑکے بھی ینی چری دستوں میں داخل کیے جاسکتے ہیں، پھر ۱۵۸۴ء میں جب جنگ ایران کے لیے کافی سپاہی فراہم نہ ہو سکے تو عثمان پاشا نے مجبوراً مسلمانوں کو بھی اس فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ان بے قاعدگیوں میں جتنی ترقی ہوتی گئی اتنی ہی عیسائی لڑکوں کی بھرتی کم ہوتی گئی، سلطان قلی کو جو مراعات حاصل تھیں، ان کو دیکھ کر ترک کسان بھی اپنے عیسائی ہمسایوں کو راضی کر کے اپنے لڑکوں کو عیسائی بنا کر بھرتی کرا دیتے اور بھرتی کرنے والے افسر یا تو دھوکا کھا جاتے یا رشوت لے کر چشم پوشی کر لیتے تھے، اس طرح سترہویں صدی کے وسط سے اس فوج کی ابتدائی نوعیت بالکل بدل گئی تھی، اس کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا، سلیمان کے عہد میں اس کا شمار بارہ سے پندرہ ہزار تک تھا، ۱۶۸۳ء کی مہم ویانا میں یہ تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی، تعداد کے اضافہ کے ساتھ اس فوج کی سرکشی بھی بڑھتی گئی، اپنی طاقت کا احساس اسے شروع سے تھا، لیکن جب تک مضبوط سلاطین تخت نشین رہے انھوں نے اسے قابو میں رکھا، سلیمان کے بعد جب عنانِ حکومت کمزور ہاتھوں میں آئی اور ینی چری کی تنظیم میں بے عنوانیاں شروع ہوئیں تو اس نے سر اٹھایا اور خود سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گئی، پروفیسر جرمانس لکھتے ہیں:

> ''اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو علاوہ اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو شرکت کی اجازت نہ تھی، اگرچہ جاں نثاری افواج اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں، لیکن ان کی

---

(۱) لی بائر ص ۵۰

حلقہ بندی اور رشتۂ اتحاد مستحکم تھا، البتہ سولہویں صدی کے آخر میں وہ
بازیگر اور مسخرے بھی جو اپنے کرتبوں سے شاہی محفلوں میں سلطان کی
خوشنودی حاصل کر لیتے اس میں بھرتی کیے جانے لگے، اس کے بعد
سے تو جاں نثاریوں کی بارکوں میں ہر قسم کے غیر معتبر بیرونی لوگ داخل
ہونے لگے، جس نے اس فوج کی روایتی یکجہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ
پہنچایا اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا، اب یہ لوگ شادیاں
کر کے بارکوں کے باہر رہنے اور امن وامان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی
کاروبار بھی کرنے لگے، غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت
کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اب اس کی حیثیت صرف
ایک شورش پسند اور شورہ پشت انبوہ کثیر کی سی ہوگئی، جس سے ملک کے
امن وامان کے لیے اندیشہ پیدا ہو چلا، لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل
رہے ہی نہیں اور جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی، لیکن ناکامی
ہوئی تو آخر کار ۱۸۲۶ء میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ ڈالا گیا۔" (۱)

باب عالی کے سپاہی: جس طرح ینی چری سلطنت کی مستقل پیدل فوج تھی، اسی
طرح "باب عالی کے سپاہی" مستقل سوار فوج تھی، ادارۂ حکومت میں جو عیسائی لڑکے
داخل کیے جاتے تھے، ان میں سے کچھ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کر لیے جاتے تھے، انہی
میں سے جو اپنی ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بہترین ثابت ہوتے وہ حکومت کے انتظامی
شعبہ کے لیے چن لیے جاتے، جو باقی رہ جاتے ان کا بڑا حصہ باضابطہ سوار فوج میں جسے
"باب عالی کے سپاہی" کہتے تھے داخل کر دیا جاتا، فوج میں وہی امیدوار لیے جاتے تھے
جن پر سلطان کو پورا اعتماد ہوتا، اس کا نظم وضبط بھی ویسا ہی سخت تھا جیسا ینی چری کا، لیکن
سلیمان کے بعد اس میں بھی وہی بے عنوانیاں ہونے لگیں جو ینی چری کے نظام میں

(۱) "ترکوں کی اسلامی خدمات" از ڈاکٹر جولیس جرمانس، مطبوعہ انجمن اردو پریس اورنگ آباد ص ۳۱

ہورہی تھیں، سلطنت کی ان دونوں فوجوں کا شیرازہ ساتھ ساتھ منتشر ہورہا تھا۔

جاگیری سپاہی: ینی چری اور باب عالی کے سپاہی کے علاوہ ایک جاگیری سوار فوج بھی تھی جو ان دونوں سے زیادہ قدیم تھی، اس کو "سپاہی" کہتے تھے، صوبوں میں قدیم موروثی جاگیرداروں کا ایک حکمران طبقہ تھا، یہ وہ لوگ تھے جن کے آباواجداد نے سلطانی علم کے نیچے فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کے صلہ میں انھیں مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں دی گئی تھیں، آمدنی کے لحاظ سے ان جاگیروں کی دو قسمیں تھیں، بڑی جاگیروں کو زعامت اور چھوٹی کو تیمار کہتے تھے، ہر جاگیردار کو سواروں کی ایک معین تعداد لے کر سلطان کی طلب پر جنگ میں شریک ہونا پڑتا تھا، جن کے مصارف وہ جاگیر کی آمدنی سے ادا کرتا تھا، صدیوں تک عثمانی افواج کا بڑا حصہ انہی جاگیری "سپاہیوں" پر مشتمل تھا، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں جاگیری سواروں کی تعداد غالباً دو لاکھ سے زیادہ تھی (۱) اس نظام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان سواروں کی ایک فوج صوبوں کی بغاوت فرو کرنے اور بیرونی جنگوں پر روانہ کیے جانے کے لیے ہر وقت تیار رہے اور سلطنت پر کوئی مالی بار بھی نہ پڑنے پائے، فوجی مہموں سے فارغ ہوکر جاگیردار اپنا وقت شکار اور فوجی کھیلوں میں صرف کرتے تھے، جن صوبوں میں ان کی جاگیریں واقع تھیں وہاں کے انتظام میں وہ کوئی حصہ نہ لیتے مگر خود اپنے علاقوں میں وہ خود مختار تھے، وہاں نہ سنجق بے کا حکم چلتا تھا نہ والی کا، صرف فوجی معاملات میں وہ حکومت کے ان عہدہ داروں کی اطاعت کرتے تھے، باقی تمام امور میں وہ بالکل آزاد تھے، سولھویں صدی کے بعد اس جاگیری فوج کا نظم بھی پراگندہ ہونے لگا، مراد ثالث کے عہد میں قصر شاہی کے مقربین کی نگاہیں ان جاگیروں پر پڑنی شروع ہوئیں، زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ انھوں نے "سپاہیوں کے رجسٹر میں اپنے نوکروں اور غلاموں کے نام لکھ دالیے اور بہت سی بڑی بڑی جاگیریں غلاموں اور خواجہ سراؤں کے قبضہ میں چلی گئیں، ان میں سے اکثر "سپاہی" کے فرائض انجام دینے

(۱) لی بائر ص ۱۰۴۔

کی مطلق اہلیت نہیں رکھتے تھے، یہ جاگیروں سے دور بیٹھ کر صرف ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ''سپاہیوں'' کا ضبط مفقود ہوتا گیا اور اٹھارہویں صدی میں ان کی فوجی اہمیت باقی نہیں رہ گئی، اس درمیان میں حکومت کی طرف سے جب کبھی اصلاحات کی کوشش کی گئی، جاگیرداروں نے ہمیشہ مخالفت کی، بالآخر محمود ثانی نے یہ دیکھ کر کہ ان کی بدنظمی سے سلطنت کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ رہا ہے، ان کی جاگیریں ضبط کرلیں اور جو حقوق انھیں حاصل تھے وہ سلب کر لیے، یوں دولت عثمانیہ کی اس قدیم فوج کا استیصال بھی ینی چری کی طرح اسی مصلح کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔(۱)

جاگیری ''سپاہی'' اصلاً مسلمان ہونے کی وجہ سے ادارۂ حکومت سے خارج تھے، ان کا تعلق ادارۂ اسلامیہ سے تھا، لیکن اس فوج کے تمام افسر ادارۂ حکومت میں شامل تھے، یہ عیسائی والدین کی اولاد ہوتے اور سلطان کے غلام کی حیثیت سے اس ادارہ میں داخل کیے جاتے تھے، یہاں فوجی تربیت پانے کے بعد یہ ''سپاہیوں'' کے افسر بنا کر بھیجے جاتے تھے۔

قپودان پاشا: قپودان پاشا عثمانی امیر البحر تھا، اس کے ماتحت سلطنت کے مستقل بیڑے کے علاوہ جس کا صدر مقام استنبول تھا وہ جاگیری بیڑا بھی تھا جسے بحر ایجین کے ساحلی علاقوں کے بعض نے وہاں کی جاگیروں کے معاوضہ میں فراہم کرتے تھے، ان ساحلی علاقوں میں قپودان پاشا کو وہی اختیارات حاصل تھے جو سلطنت کے دوسرے حصوں میں بیلر بے رکھتے تھے، عثمانی بحریہ کے تمام افسر اور جہاز راں عیسائی والدین کی اولاد اور سلطان کے غلام تھے، ادارۂ حکومت کی حیرت انگیز تربیت نے انھیں ایسا بنادیا تھا کہ سولہویں صدی میں سارا یورپ ان کے کارناموں سے ہیبت زدہ رہتا تھا، امیر البحروں میں خیر الدین پاشا، حسن پاشا، طورغوت، پیالے، پیری رئیس اور سیدی علی کے نام نہ صرف عثمانی تاریخ بلکہ یورپ کی بحری تاریخ میں بھی ہمیشہ یادگار رہیں گے، انھوں نے

(۱) 'ترکی' از لین پول ص ۳۳۳۔

اپنی فتوحات سے سلطنت عثمانیہ کی وسعت میں بہت کچھ اضافہ کیا، بحری فتوحات کے علاوہ ان میں سے بعض نے علمی کارنامے بھی دکھائے مثلاً پیری رئیس نے بحر روم اور بحر ایجین کا ایک نقشہ تیار کیا، جس میں بحری رووں، مختلف مقامات کی گہرائیوں اور بندرگاہوں کے متعلق ضروری معلومات درج کیں، اسی طرح سیدی علی جس کا جہاز باد مخالفت کی وجہ سے ہندوستان کے ساحل پر پہنچ گیا تھا، جب خشکی کے راستہ سے خراسان، بلوچستان اور ایران ہوتا ہوا ترکی واپس آیا تو اس نے اپنے سفر کی سرگذشت لکھ کر مفید معلومات بہم پہنچائیں، اس کے علاوہ اس نے اصطرلاب کے استعمال پر بھی ایک کتاب لکھی اور ایک دوسری کتاب ''محیط'' نامی لکھی جس میں ہندوستان کے سمندروں کا حال بیان کیا۔(۱)

بری فوجوں کی طرح سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت میں بھی سولھویں صدی کے آخر سے زوال شروع ہوا اور وہ روز بروز کمزور ہوتی گئی، اس کی اصلی وجہ ادارۂ حکومت کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی تھی، جس نے ہر شعبہ کو صدمہ پہنچایا یعنی یہ ادارہ اب نہ عیسائی لڑکوں کے لیے مخصوص رہا اور نہ فوجی اور ملکی ملازمتوں پر انہی امیدواروں کا تقرر کیا جاتا جو اس ادارہ کی تعلیم و تربیت کا نصاب معیار کے مطابق پورا کر چکے ہوتے، تین سو برس کے بعد سلطان عبدالعزیز خاں نے اپنے شوق تعمیرات کے سلسلہ میں عثمانی بیڑے کی تعمیر پر بھی شاہانہ توجہ کی اور اسے اتنا طاقتور بنادیا کہ یورپ کے بہترین بیڑوں میں شمار ہونے لگا مگر سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں ان جہازوں کو شاخ زریں سے نکلنے کی بھی نوبت نہیں آئی اور وہ وہیں پڑے پڑے زنگ آلود ہوتے رہے۔

ادارۂ اسلامیہ: ادارۂ اسلامیہ میں سلطنت کے وہ تمام مسلمان شامل تھے، جو ادارۂ حکومت کے باہر تھے اور جو کسی حیثیت سے عام سطح سے بلند تھے، سلطان اس ادارہ کا بھی صدر تھا، دونوں کا بنیادی فرق یہ تھا کہ ادارۂ حکومت کے ارکان تقریباً بلا استثنا عیسائی خاندانوں سے لیے جاتے تھے اور ادارۂ اسلامیہ کے ارکان تمامتر مسلمان خاندانوں کے

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جو مانس ص ۳۳

افراد ہوتے تھے، ادارۂ اسلامیہ کا بھی ایک تدریجی نظام تعلیم تھا، جماعت علما میں شامل ہونے کے لیے جو اس ادارہ کا حکمراں طبقہ تھا، اس کے تعلیمی نظام سے گذرنا ضروری تھا، اس ادارہ کی خاص جماعتیں مدرسین، مفتیوں اور قاضیوں کی تھیں، انہی کے ہاتھوں میں سلطنت کے علوم، مذہب اور قانون کا نظام تھا۔

تعلیمی نظام: تعلیم کا ذوق یوں تو سلاطین عثمانیہ کو شروع ہی سے تھا لیکن محمد فاتح اپنے تمام پیشروؤں سے بڑھ گیا، اسی نے "سلسلہ علما" کو قایم کرکے سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم وترقی کا ضابطہ مرتب کیا، مکاتب و مدارس سلطنت کے ہر حصہ میں کثرت سے قایم تھے، یہ مسجدوں سے متعلق ہوتے تھے اور ان کے اخراجات وقف کی آمدنی سے پورے کیے جاتے، مکاتب یعنی ابتدائی اسکولوں میں تعلیم مفت تھی اور اکثر طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی وقف ہی کی آمدنی سے ہوتا تھا، اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں بھی طلبہ کو جزوی طور پر امداد دی جاتی تھی، نصاب تعلیم کی تفصیل آیندہ باب میں بیان کی گئی ہے، ان تمام لوگوں کو جو ادارۂ اسلامیہ میں کوئی سرکاری عہدہ چاہتے تھے، کسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونا لازمی تھا، جب تک وہ زیر تعلیم رہتے انھیں "سوفتہ" کہا جاتا، نصاب پورا کرنے کے بعد دانشمند کی سند مل جاتی تھی، ایسے طلبہ کو جو مکاتب کی معلّمی یا مساجد کی امامت وغیرہ کے عہدوں پر قناعت کر لیتے یہ سند کافی تھی، لیکن جو مفتی یا قاضی بننے کا حوصلہ رکھتے تھے انھیں قانون کا ایک اعلیٰ نصاب پورا کرنا پڑتا تھا، مفتی اعظم خود ان کا امتحان لیتا تھا اور اگر وہ کامیاب ہوتے تو انھیں ملازم کی سند دی جاتی تھی، اسی جماعت سے اونچے درجہ کے مدرس بھی مقرر کیے جاتے تھے۔

مفتی: مفتیوں کی جماعت علما میں خاص اہمیت رکھتی تھی، ہر بڑے شہر کے قاضی کے ساتھ ایک مفتی مقرر ہوتا تھا، اس کے علاوہ بیلر بے اور سنجق بے کے ساتھ بھی مفتی ہوا کرتے تھے، وہ مدت العمر کے لیے مقرر کیے جاتے تھے، انھیں خود معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا بلکہ جب کبھی کوئی قاضی بے یا عام آدمی ان سے استفتا کرتا تو ان

کا فرض تھا کہ مذہب حنفی کے مطابق فتویٰ دیں، عام طور پر تو مفتی کا درجہ قاضی کے بعد تھا مگر قسطنطنیہ میں ایسا نہ تھا جہاں سلطان اور افسرانِ حکومت کو اکثر نہایت اہم معاملات میں فتویٰ لینے پڑتے تھے، اسی وجہ سے قسطنطنیہ کے مفتی کا درجہ جو مفتی اعظم کہا جاتا تھا، قاضیوں سے بھی بڑھ گیا، محمد ثانی نے اسے شیخ الاسلام کا لقب بھی عطا کیا جواب اس کا عام لقب ہوگیا، مفتی اعظم اپنی جماعت سے نہیں منتخب ہوتا تھا بلکہ سلطان اسے عموماً قاضیوں میں سے مقرر کرتا تھا، اسے سلطنت کے تمام دوسرے مفتیوں کو مقرر کرنے اور ترقی دینے کا حق حاصل تھا۔

سلیمان نے مفتی اعظم کو علما کا صدر مقرر کیا اور اس حیثیت سے اس کا درجہ حکومت کے تمام عہدہ داروں سے اونچا ہوگیا، بجز اس کے کہ دیوان میں اس کی جگہ صدر اعظم کے بعد تھی، اپنے منصب کی اہمیت کے لحاظ سے وہ قریب قریب سلطان کا ہمسر ہوگیا کیونکہ وہی قانونِ شریعت کا شارح اور وکیل تھا اور شریعت سلطان سے بلند تر چیز تھی، بایزید ثانی کا معمول تھا کہ مفتی اعظم کے استقبال کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا اور اسے اپنے سے اونچی جگہ بیٹھنے کو دیتا تھا۔(۱)

سلطان سلیم اور مفتی جمالی کا واقعہ مشہور ہے، سلیم جب مصر کی مہم سے واپس آیا تو اس نے چاہا کہ سلطنت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے لیے تمام عیسائیوں کو مسلمان کرلے، خواہ اس میں جبر ہی سے کام لینا پڑے مگر اتنا اہم کام شرعی فتوے کے بغیر ممکن نہ تھا اور شیخ الاسلام جمالی آفندی نے اس بنا پر فتویٰ دینے سے انکار کردیا کہ سلطان محمد فاتح نے عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی تھی اور اس معاہدہ کی پابندی قانونِ شریعت کے لحاظ سے ضروری تھی، انھوں نے تین بڈھے ینی چری بھی جن کی عمر سو سال سے زیادہ تھی بطور گواہ اس معاہدہ کے ثبوت میں پیش کیے، یہ تینوں محمد فاتح کے علم کے نیچے لڑچکے تھے مجبوراً سلیم کو یہ خیال ترک کردینا پڑا، خالدہ خانم اس واقعہ پر تبصرہ

---

(۱) لی بائر ص ۲۰۹۔

کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

''یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ سلیم کا سا شخص جس نے خدا جانے کتنے وزیروں کو قتل کرادیا، شیخ الاسلام کے آگے جو قانون اور شریعت کا نمایندہ ہے سر جھکا دیتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک سلطنت عثمانی کا نظام اور اس کے اصول بڑے سے بڑے سلطان کی شخصیت سے زیادہ قوی تھے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جمالی آفندی اور تینوں بوڑھے سپاہیوں میں عثمانی قومیت کا احساس اس حد تک موجود تھا کہ گو وہ دل سے چاہتے ہوں کہ سارا ملک مسلمان ہو جائے مگر انھوں نے اپنی سلطنت کے اصول کی حفاظت فرض سمجھی۔''(۱)

نظام عدالت: قاضیوں کا حلقۂ اختیار ادارۂ حکومت سے زیادہ وسیع تھا، مثلاً کریمیا اور شمالی افریقہ کی ریاستیں اگرچہ انتظامی حیثیت سے مرکزی حکومت کے تابع نہ تھیں بلکہ محض وابستہ (Yassal) حکومتیں تھیں، مگر یہ بھی عثمانی نظامِ عدالت کے ماتحت تھیں، قاضیوں کے عدالت میں دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات فیصل ہوتے تھے، لیکن چند جماعتوں کے معاملات ان کے اختیار سماعت سے باہر تھے، مثلاً سلطان قلی، سادات اور غیر ملکی باشندوں کے معاملات جنھوں نے سلطنت عثمانیہ میں اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں خود ان کی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے، عیسائی رعایا کے مقدمات بھی جن میں فریقین عیسائی ہوتے انہی کی کلیسائی عدالتوں کے سپرد تھے، ادارۂ اسلامیہ کے جج یعنی قاضی ان تمام مقدمات کی سماعت کرتے تھے جو قانونِ شریعت سے متعلق ہوتے اور جن میں دونوں فریق مسلمان یا ایک مسلمان اور دوسرا عیسائی ہوتا، علاوہ اس صورت کے کہ مسلمان سلطان قلی یا سید ہوتا۔

---

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۳۰

قاضی: تقریباً تمام قاضی شہر کے قاضی ہوا کرتے تھے مگر ان کا حلقۂ اختیار گرد ونواح کے علاقوں کو بھی محیط ہوتا تھا، ججوں کے پانچ خاص طبقے تھے: بڑے درجہ کے ملا، چھوٹے درجہ کے ملا، مفتش، قاضی اور نائب، جج کے لیے عام نام قاضی تھا مگر احتراماً لوگ اسے ملا کے لقب سے پکارتے تھے، ایک دوسری تقسیم جغرافیائی بنیاد پر تھی یعنی یورپ اور ایشیا کے قاضی عسکر جو قاضی عسکر رومیلیا اور قاضی عسکر اناطولیہ کہے جاتے تھے، ہر قاضی عسکر کے ساتھ ایک بڑی جماعت ماتحت عہدہ داروں کی ہوتی تھی، سب سے اونچی عدالتیں قاضی عسکر صدر اعظم اور دیوان کی تھیں، علاوہ ان مقدمات کے جو دیوان میں ان کے سامنے پیش ہوتے تھے یا جن کی سماعت دیوان کے ختم ہوجانے پر وہ قصر شاہی کے باب پر کرتے قاضی عسکر دوسرے اوقات میں بھی اپنے گھروں پر عدالت کیا کرتے تھے جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، ان کی اصلی حیثیت فوجی ججوں کی تھی مگر بعد میں ان کے اختیارات وسیع کردئے گئے، یہاں تک کہ وہ اپنے حلقہ کے تمام ججوں کے افسر اعلیٰ بن گئے، دیوان میں ان کا درجہ وزرا کے بعد تھا، لیکن دیوان کے ختم ہونے پر انھیں سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں باریابی کا حق حاصل تھا، سلیمان کے عہد تک انھیں جماعت علما پر وہ تمام اختیارات بھی حاصل تھے جو سلیمان نے مفتی اعظم کو تفویض کردئے۔

صدر اعظم کی عدالت: سلطان کے نمایندے کی حیثیت سے صدر اعظم ادارۂ اسلامیہ کا بھی حقیقی صدر تھا اور اس کی عدالت دیوانی کے تمام مقدمات کے لیے سب سے بڑی عدالت مرافعہ تھی، لیکن وہ صرف عدالت عالیہ ہی نہ تھی بلکہ سلطنت کی دوسری عدالتوں کی طرح عدالت ابتدائی بھی تھی، جہاں امیر و غریب کے چھوٹے بڑے کثیر التعداد مقدمات فیصل ہوتے تھے، عدالت کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا یا تو صدر اعظم خود فیصلے صادر کرتا یا فرصت نہ ہونے کی صورت میں مقدمات کو کسی قاضی عسکر یا دوسرے جج کے سپرد کردیتا کہ فیصلہ جلد کردیا جائے، پروفیسر لی بائر لکھتے ہیں کہ کم سے کم ایک حیثیت سے عثمانی عدالتیں بہت قابل تعریف تھیں، فریقین مقدمہ کو فیصلہ کے انتظار

کی زحمت بہت کم برداشت کرنی پڑتی تھی، مقدمات فوراً اور صاف وسادہ الفاظ میں فیصل کیے جاتے تھے(۱)، عدالتوں میں مذہب حنفی پر عمل درآمد تھا۔

ملتیں: ادارہ اسلامیہ کے علاوہ سلطنت میں مختلف ملتوں کا بھی جداگانہ نظام نہ تھا، یہ ملتیں کلیسائی فرائض کے علاوہ پیدائش، اموات، نکاح اور وصیت ناموں کا اندراج کرتیں اپنے مذہب والوں کے شخصی قانون کے معاملات خود اپنی عدالتوں میں فیصل کرتیں اور اگر فریقین مقدمہ اسی ملت کے ہوتے تو ان کے دیوانی کے مقدمات کا فیصلہ بھی ان ہی عدالتوں میں ہوتا، اس کے علاوہ یہ ملتیں اپنے حلقہ کے لوگوں سے ٹیکس بھی وصول کرتی تھیں یہ تمام فرائض جو حقیقتۃً فرماں روائی کی خصوصیات میں داخل ہیں سلطنت عثمانیہ نے صراحت کے ساتھ ملتوں کو تقسیم کر دئے تھے اور ان کی انجام دہی میں خود اپنی فوجوں سے ملتوں کی مدد کرتی تھی، ان میں سب سے اہم ملت روم تھی، جس کے حلقہ میں وہ تمام عیسائی رعایا شامل تھی جو مشرقی یا یونانی کلیسا کی پیرو تھی، خواہ وہ سلطنت کے کسی حصہ میں آباد ہو اور اس کی مادری زبان کچھ بھی ہو، اس ملت کا قائد اعظم بطریق قسطنطنیہ تھا، جس کو سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانہ میں اس سے زیادہ اقتدار حاصل تھا جتنا وہ سلطنت بازنطینی کے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے رکھتا تھا، ملت روم کے علاوہ چند ملتیں اور بھی تھیں مثلاً ملت ارمنی جو قسطنطنیہ کے گریگوری بطریق کے ماتحت تھی، ملت یہود جس کا افسر ربی اعظم تھا اور رومن کیتھولک عیسائیوں کا فرقہ جو پوپ کے ایک نمایندہ کے ماتحت تھا۔

سلطنت میں ایسے بہت سے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آباد تھے، جو سلطان کی رعایا نہ تھے بلکہ مغربی طاقتوں مثلاً وینس، فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کی رعایا تھے، یہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور یہیں مقیم ہو گئے تھے، انھیں بھی حکومت عثمانیہ کی طرف سے ان کے سفیروں اور قنصلوں کے ماتحت اسی قسم کے اختیارات دے دئے گئے تھے، جس قسم کے ملتوں کو حاصل تھے اور یہ غیر ملکی باشندے بھی عیسائی رعایا کی طرح اپنے معاملات کا انتظام

(۱) لی بائرص ۳۲۲

خود ہی کرتے تھے، عثمانی ترکوں نے تقریباً کل تجارت عیسائیوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھی تھی۔

انقلابی تبدیلیاں: ادارۂ حکومت کے بنیادی نظام میں جب تک طاقت رہی ان حقوق و مراعات سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچا، لیکن سولھویں صدی کے بعد جب اس ادارہ کے اصول سے بے اعتنائی برتی جانے لگی تو حکومت کے ہر شعبہ میں اختلال کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے، سلیمان کے بعد جو شہزادے تخت پر آئے وہ بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے باعث ملکۂ حکمرانی سے محروم ہو چکے تھے، ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اتنی بڑی سلطنت کا بار اٹھا سکتے، ان کی نا اہلی سے امورِ مملکت میں حرم کا دخل شروع ہوا، سفارش گردیوں کا دور دورہ ہوا، ملکی اور فوجی عہدے فروخت ہونے لگے اور نظامِ حکومت کی تمام بنیادیں متزلزل ہو گئیں، یہ اندرونی کمزوریاں بیرونی حملوں کا پیش خیمہ تھیں، چنانچہ سترہویں صدی کے بعد دولت عثمانیہ اپنے مغربی حریفوں سے اکثر جگہوں میں شکست کھاتی رہی اور آسٹریا اور روس سے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں متعدد صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے، محمود ثانی نے یہ دیکھ کر کہ سلطنت پرانی بنیادوں پر جو بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں زیادہ دنوں قایم نہیں رہ سکتی، اس قدیم نظام کو توڑ دیا اور حکومت کے ہر شعبہ میں اصلاحات شروع کیں، ادھر عیسائی رعایا میں بھی ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی تھی، سترہویں صدی کے آخر میں بہت سے یونانیوں نے تجارت کے ذریعہ مغرب سے ربط پیدا کر لیا تھا، مغربی زبانیں سیکھ لی تھیں اور مغربی علوم و فنون اور سیاسی خیالات سے آشنا ہو گئے تھے، دولت عثمانیہ کو جب یوروپین طاقتوں کے مقابلہ میں شکستیں ہونے لگیں تو عیسائی صوبوں کی طرف سے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ شروع ہوا اور دولِ عظمٰی نے ان کی حمایت میں باب عالی پر دباؤ ڈالا کہ ان صوبوں میں اصلاحات جلد سے جلد جاری کر دی جائیں، چنانچہ ۱۸۳۹ء کے خط شریف اور ۱۸۵۶ء کے خط ہمایوں میں ان تمام اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا، جن کا مطالبہ دولِ عظمٰی نے کیا تھا مگر اس کے بعد بھی عیسائی صوبوں کا مطالبہ خود اختیاری بدستور قایم رہا اور دولِ عظمٰی کو بھی یہ اصلاحات ناکافی معلوم

ہوئیں، اس کے بعد ان طاقتوں کی طرف سے عیسائی صوبوں کی خفیہ اور علانیہ امداد کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے بالآخران کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرا کر چھوڑا، ان واقعات کی تفصیل گذشتہ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

غرض انیسویں صدی کی ان اصلاحات سے جو ''تنظیمات'' کے نام سے مشہور ہیں، سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا، وہ نظامِ حکومت جو قدیم سلاطین نے قایم کیا تھا بالکل بدل دیا گیا اور اس کی جگہ مغربی طرز کا جدید نظام قایم کیا گیا، حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے وزارتیں قایم ہوئیں اور ہر وزیر اپنے شعبہ کا ذمہ دار قرار دیا گیا، حکومت کے تمام عہدے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے، بڑے بڑے عہدوں یہاں تک کہ وزارتوں اور سفارتوں پر بھی عیسائیوں کا تقرر ہونے لگا، عدالتی نظام میں بھی تبدیلی ہوئی، پہلے صرف شرعی عدالتیں تھیں جن میں قانون شریعت کے مطابق تمام مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے، یہ شیخ الاسلام کے ماتحت تھیں اور ان میں صرف ایک قاضی یا جج ہوتا تھا، ''تنظیمات'' کے بعد مغربی طرز کی عدالتیں قایم کی گئیں جو وزیر عدل کے زیر نگرانی تھیں، ان عدالتوں میں مختلف مذہبی فرقوں کے کئی جج ہوتے تھے قدیم شرعی عدالتیں بھی قایم رکھی گئیں، مگر اب ان میں وہی مقدمات پیش ہوتے جن کا تعلق وراثت، نکاح وطلاق یا مسلمانوں کے دوسرے شخصی معاملات سے ہوتا، جدید عدالتیں ان ضوابط کا نتیجہ تھیں جو مغربی یورپ کے قانونی ضوابط کے مطابق تیار کیے گئے تھے، چنانچہ ایک ضابطۂ تجارت مرتب ہوا جس میں قرض روپیہ پر سود کی شرط تسلیم کی گئی، حالانکہ قرآن مجید سے اس کی صریح ممانعت ثابت ہے، اسی طرح ایک ضابطۂ فوجداری بنایا گیا جس میں قانونِ شریعت کے تعزیری احکام کے بجائے جرائم کے لیے دوسری سزائیں مقرر کی گئیں، فرانس کے ضابطہ دیوانی کے نمونہ پر ایک ضابطۂ دیوانی بھی مدون ہوا اور جدید نظام عدالت اسی کے مطابق قایم کیا گیا، اس ضابطہ کے رو سے عدالت ابتدائی اور عدالت مرافعہ الگ الگ قایم کی گئیں، ان عدالتوں میں عیسائی

اور یہودی جج مسلمان قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر فیصلے کرتے تھے، ان تمام معاملات میں جو صراحت کے ساتھ ضابطۂ تجارت یا ضابطہ فوجداری میں مذکور نہ تھے، یہ جدید عدالتیں بھی قانون شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرتی تھیں۔

ممالک محروسہ: سلطنت عثمانیہ مندرجہ ذیل اقسام کے ممالک محروسہ پر مشتمل تھی:

۱- آراضی کا وہ بڑا حصہ جس کا انتظام باب عالی کی طرف سے براہ راست ہوتا تھا

۲- وہ متعدد علاقے جن کا انتظام خاص ضوابط کے ماتحت ہوتا تھا۔

۳- متعدد باج گذار صوبے۔

۴- بعض وابستہ ریاستیں۔

ان کے علاوہ ایک خطہ نزاعی علاقہ کا تھا، جو دونوں فریق کے مسلسل حملوں کی وجہ سے عموماً ویران رہتا تھا، اس خطہ کی اہمیت سلطنت عثمانیہ کے باشندوں اور حکومت کے نزدیک اس وجہ سے تھی کہ یہیں سے سلطنت کے لیے قیدی غلام فراہم ہوتے تھے، اس خطہ کے باہر دار الحرب تھا۔

جو علاقے براہِ راست زیر حکومت تھے، وہ ضلعوں یا سنجقوں میں تقسیم تھے اور ان میں سے ہر سنجق کے محاصل کا ایک علاحدہ قانون نامہ تھا، جس کی بنیاد ان معاہدوں پر تھی جو فتح کے وقت کیے گئے تھے، البانیا اور کردستان کے بعض پہاڑی علاقے اور صحرائے عرب حقیقتاً خود مختار تھے، گو نام کے لیے ان کا انتظام باب عالی کی طرف سے ہوتا تھا، ان ملکوں نے اپنی قبائلی تنظیم قایم رکھی تھی اور یہ اپنے موروثی سرداروں کے ماتحت تھے، جن کو فوجی خدمات کے معاوضہ میں عثمانی خطابات دیے گئے تھے، یہ جب چاہتے محصول ادا کرتے اور جب نہ چاہتے نہ ادا کرتے۔

سلطنت کے مرکزی حصہ کی زمینیں تین قسم کی تھیں: ارض عشریہ، ارض خراجیہ اور ارض مملکت۔ ارض عشریہ، مسلمانوں کو فتح کے وقت اس شرط پر دی گئی تھی کہ حکومت کو عشر ادا کرتے رہیں گے، ارض خراجیہ فتح کے وقت عیسائیوں کو دی گئی تھی یا ان کے پاس چھوڑ

دی گئی تھی، اس شرط پر کہ دو میں سے کوئی ایک ٹیکس ادا کریں گے یا تو زمین کے معاوضہ میں ایک معین رقم دیتے رہیں یا پیداوار کا ایک حصہ دیں جس کی مقدار زمین کی نوعیت کے لحاظ سے عشر سے نصف تک ہوتی تھی، ارضِ مملکت میں وہ زمینیں شامل تھیں جو کسی کو بطور ملک نہیں دی گئی تھیں بلکہ ان کا مالک خود سلطان تھا، لیکن وہ ان کو صرف ایک جز سے منتفع ہوتا تھا کیونکہ ان کا بڑا حصہ مسجدوں پر وقف کر دیا گیا تھا اور ان مسجدوں سے متعلق جو مدرسے ہسپتال یا دوسری عمارتیں تھیں ان کے اخراجات بھی اسی وقف سے ادا کیے جاتے تھے، اس کے علاوہ ارض مملکت کی بہت سی زمینیں مسلمان ''سپاہیوں'' کو جاگیر میں دی گئی تھیں، جو اس کے معاوضہ میں فوجی خدمت کے لیے سوار فراہم کرتے تھے، ان حصوں کے نکالنے کے بعد نسبتاً تھوڑی سی زمین جو بچ جاتی تھی وہی سلطان کی ذاتی ملک سمجھی جاتی تھی اور اس کا انتظام سلطان بحیثیت مالک کے ایک خاص طریقہ پر کرتا تھا، ارض مملکت کے کاشتکار صرف پٹہ پر زمینیں حاصل کرتے تھے اور مال گذاری نقد یا جنس کی شکل میں مسجد، جاگیردار یا سلطان کو دیتے تھے، یورپ کے تمام مقبوضات ارضِ مملکت خیال کیے جاتے تھے ایشیائے کوچک کا بھی اکثر حصہ ارضِ مملکت تھا، لیکن شام مسوپوٹامیا اور مصر قدیم انتظامات کے تحت تھے اور زیادہ تر ارض خراجیہ تھے، عرب اور بصرہ تقریباً تمام تر ارض عشریہ تھے، کریمیا جارجیا، منگریلیا اور عرب کے بعض حصے وابستہ (Yassal) علاقے تھے، جو باضابطہ خراج نہیں ادا کرتے تھے، جزیرہ قبرص، ہنگری کے علاقے، رگوسا، ٹرانسلوینیا، مولڈیویا اور ولاچیا باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے اور انھیں اپنا انتظام خود کرنے کی اجازت حاصل تھی، مصر ایک خاص انتظام کے ماتحت تھا، جو مملوکوں کے نظامِ حکومت سے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ماخوذ تھا، وہاں کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا، جو تین سال کے لیے باب عالی سے بھیجا جاتا تھا اور وہاں کے سالانہ محاصل کا بڑا حصہ شاہی خزانہ میں جاتا تھا، حرمین شریفین سے بجائے اس کے کہ کوئی خراج لیا جائے، مصر کے محاصل سے ایک بڑی رقم خود وہاں بھیجی جاتی تھی، شمالی افریقہ کے مقبوضات سے زیادہ تر اقتدار اور بحری مدد حاصل تھی۔ (لی بائر)

تعلیم

جارج لارپنٹ اپنی تاریخ ترکی میں لکھتا ہے:

''اسلام کے متعلق اکثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف ہے اور خصوصاً آلِ عثمان کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم منظّم جہالت کی دلدادہ ہے، دونوں قول مساوی طور پر بے بنیاد ہیں، قرآن کا بغور مطالعہ خلفائے بغداد کے علمی کارناموں کی آب و تاب جب کہ مغرب ہنوز قعر جہالت میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ حیرت انگیز تصانیف جن سے عربوں نے اسپین کو مالا مال کر دیا، پہلے قول کی ناانصافی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، دوسرے قول کا جھوٹ بھی اس شخص کے لیے اس سے کم واضح نہیں ہے جس نے ترکی کی حالت غور سے دیکھی ہے، کسی ملک میں تعلیم کی عزت ترکی سے زیادہ نہیں ہے، کسی ملک میں ان لوگوں کا احترام جن کے سپرد تعلیم پھیلانے کی خدمت ہے ترکی سے زیادہ نہیں کیا جاتا، خواجہ (استاد) کا لقب ایک ایسا لقب ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاتا، خواجہ کی ظاہری حیثیت کیسی ہی حقیر ہو، اس کا شاگرد کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے یہاں تک کہ صدر اعظم بھی ہو جائے تاہم وہ مجمع عام میں بھی اپنے قدیم استاد کے ساتھ ہمیشہ ملاطفت اور احترام کے ساتھ پیش آتا ہے۔''(۱)

---

(۱) ترکی از سر جارج لارپنٹ ج ۲ ص ۱۳۷ (Turkey by Sir George Larpent) مطبوعہ لندن ۱۸۵۲ء

ترکی میں تعلیم کے تین دور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں:

۱- دینی دور: آغاز سے تنظیمات یعنی ۱۸۳۹ء تک

۲- درمیانی دور: تنظیمات سے جمہوریہ کے اعلان تک یعنی ۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۳ء تک۔

۳- اصلاحات کا دور: ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء تک

۱- دینی دور: سلاطین عثمانیہ نے تعلیم کا نظام شروع ہی سے قایم کیا، چنانچہ اورخاں نے جو اس سلسلہ کا دوسرا فرماں روا تھا ازنیق میں ایک مدرسہ قایم کیا جو سلطنت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا، اس کے بعد دوسرے سلاطین نے بھی تعلیم پر شاہانہ توجہ کی اور سیکڑوں مدرسے اور دارالعلوم قایم کیے، ان کی پوری تفصیل مولانا شبلی نعمانی نے اپنے رسالہ ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میں بیان کی ہے، ارکھارٹ (Urquhart) جس نے مشرقی ممالک کے حالات ذاتی تحقیق سے لکھے ہیں بیان کرتا ہے کہ ''ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو اور اس پر کچھ جائداد نہ وقف کر دی ہو(۱)''، جس سلسلہ کو اورخاں نے شروع کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے دور میں ترقی کر کے سلطان محمد فاتح کے عہد میں حد کمال کو پہنچ گیا، محمد فاتح کا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ تخت سلطنت پر آنے کے بعد بھی اس نے تحصیل علم کا مشغلہ جاری رکھا، ۸۶۵ھ (۱۴۶۰ء) میں اس نے قسطنطنیہ میں ایک یونی ورسٹی کی بنیاد ڈالی، جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ ہاؤس تھے (۲)، کریسی لکھتا ہے:

> ''محمد ثانی کے پیشرؤوں اور خصوصاً اورخاں کو اسکولوں اور کالجوں کے قایم کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا، اسی نے ''سلسلۂ علما'' کو قایم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی

---

(۱) ''روح مشرق'' از ارکھارٹ (Spirit of the east by urquhart) بحوالہ لارپنٹ

(۲) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم از مولانا شبلی نعمانی

تعلیم وترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتحِ قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قایم رکھنے کے علاوہ شجاعت اور فوجی لیاقت کے کچھ اور بھی ضروری ہے، محمد نے جو علوم میں خود بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظام درست رکھنے کے لیے قاضیوں کا احترام قایم کرنا ضروری ہے اور ان کا احترام قایم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور معزز عہدوں پر بھی مامور کیے جائیں، نیز افلاس کی پریشان خاطری سے محفوظ کر دیے جائیں، محمد نے علاوہ ابتدائی مدارس کے جو مکتب کہے جاتے ہیں اور ہر شہر کے ہر محلّہ اور ترکی کے تقریباً تمام دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں بہت سے بڑے بڑے مدرسے قایم کیے، ان مدرسوں میں دس مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی، صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، تاریخ، زبان، فصاحت و بلاغت، اقلیدس اور ہیئت، یہ ایک ایسا نصاب تعلیم ہے جس کا موازنہ یقیناً پندرہویں صدی کے پیرس اور آکسفرڈ کے نصابِ تعلیم سے کیا جا سکتا ہے، جو طلبہ ان سب مضامین میں پوری دستگاہ حاصل کر لیتے تھے، ان کو ''دانشمند'' کا لقب دیا جاتا تھا اور اس حیثیت سے وہ چھوٹے چھوٹے طالب علموں کو پڑھاتے تھے، دانشمند بغیر مزید تعلیم حاصل کیے کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسی کا حقدار ہو سکتا تھا، لیکن اس صورت میں وہ علما کی جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا اور اسے تمام اعلیٰ تعلیمی عہدوں سے محروم ہو جانا پڑتا تھا، جماعت علما کا رکن بننے کے لیے فقہ کے ایک طویل نصاب کو مکمل کرنا پڑتا تھا اور کیے

بعد دیگرے مختلف انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے متعدد اسناد لینے پڑتے تھے......"(۱)

محمد کے جانشینوں نے اس کی قایم کی ہوئی مثال کے مطابق تعلیم کو خوب پھیلایا ہر سلطان ایک مسجد ضرور تعمیر کرتا اور ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ کا قایم کرنا لازمی تھا، یوں مسجدوں کی تعداد کے ساتھ مدرسوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی گئی، لارپنٹ کا بیان ہے کہ ۱۷۶۵ء سلطان مصطفیٰ ثالث کے عہد حکومت میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر دو سو پچھتر مدرسے موجود تھے اور انیسویں صدی کے وسط میں سلطان عبدالمجید خاں کے زمانہ میں یہ تعداد تین سو سے اوپر پہنچ گئی تھی، عبدالمجید خاں کے عہد میں ہر شہر میں کم سے کم ایک مدرسہ موجود تھا، بڑے شہروں مثلاً اورنہ، بغداد اور قاہرہ میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس مدرسے تھے۔(۲)

ابتدائی مدارس یعنی مکتب سلطنت کے ہر حصہ میں قایم تھے، شہر کا کوئی محلّہ یا چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ان سے خالی نہ تھا، مکتبوں کی تعلیم تقریباً مفت تھی، فیس صرف دو پیاستر (قرش) ماہانہ تھی جو گویا مفت کے برابر تھی، نصاب عقائد، اخلاق اور قرآن مجید کی تعلیم پر مشتمل تھا، ان مکتبوں میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ پنچانوے فیصدی مسلمان بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے۔(۳)

سلطان محمد فاتح نے تعلیم کا جو نظام قایم کیا تھا، اس میں دو نمایاں خامیاں تھیں، پہلی اور بڑی خامی تو یہ تھی کہ مکتب اور مدرسہ (دارالعلوم) کی تعلیم کے درمیان کوئی وسطی نصاب نہ تھا، مکتبوں میں بہت ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اور مدرسوں میں بہت اعلیٰ، جو بچے مکتبوں کی تعلیم سے فارغ ہو کر اوسط درجہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے لیے اس قسم کی کوئی درسگاہ نہ تھی، مدرسوں کا نصاب بہت اونچا تھا، جس کی تکمیل میں پچیس سے تیس سال کی مدت صرف ہو جاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ مکتبوں میں تو مسلمان طلبہ کا

(۱) کریسی ج ۱ ص ۱۷۰-۱۶۹ (۲) لارپنٹ ج ۳ ص ۱۴۳ (۳) ایضاً ص ۱۴۲

اوسط پچانوے فیصدی تھا، لیکن مدرسوں میں ۱۸۵۳ء تک چار فیصدی سے زیادہ نہ ہوسکا تھا(۱) جو طلبہ اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے یا سول سروس (ملازمت دیوانی) کے لیے تیار ہونا چاہتے تھے وہ اپنے گھروں پر تعلیم حاصل کرتے، دوسری خامی یہ تھی کہ زیادہ تر وقت عربی زبان کے سیکھنے اور اس کی صرف ونحو اور اصلاحات وغیرہ کے یاد کرنے میں صرف ہوجاتا تھا اور ضرورت سے زیادہ زور معقولات اور منطقی موشگافیوں پر دیا جاتا تھا، قوموں کے باہمی تعلقات اور مختلف طرز کی حکومتوں سے طلبہ بالکل بے خبر رہتے، تاریخ اور جغرافیہ سے بھی تقریباً ناآشنا رہتے، ان علوم میں جو کچھ تھوڑی بہت واقفیت ہوتی وہ صرف اپنے ہی ملک تک محدود رہتی، تعلیم تمامتر مذہبی اور ادبی تھی اور اس کا نظام کلیۃً علما کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس میں کسی ترمیم یا اصلاح کو گوارا نہ کرتے اور نہ زمانہ کی ضروریات کو تسلیم کرتے تھے۔

۲-دورِ تنظیمات: یہ حالت آغازِ تنظیمات یعنی ۱۸۳۹ء تک قایم رہی اور دینی نظامِ تعلیم بغیر کسی اصلاح وترمیم کے تمام سلطنت میں جاری رہا، لیکن جب سلطان عبدالمجید خان تخت پر آئے اور انھوں نے حکومت کے ہر شعبہ میں اصلاحات شروع کیں تو نظامِ تعلیم میں بھی بعض اہم اصلاحیں کی گئیں، ان کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے محسوس کی جارہی تھی کہ علما اور طلبہ کی جماعت ملکی اصلاحات کی مخالف تھی اور چونکہ عوام پر اس جماعت کا اثر بہت زیادہ تھا، اس لیے سلطنت کے ہر حصہ میں اصلاحات کے خلاف شورش برپا ہورہی تھی، غرض مارچ ۱۸۴۵ء میں باب عالی نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم عامہ کی اصلاح اور ملک کی روز افزوں ضروریات کا لحاظ کرکے ایک جامع نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے، اس کمیشن کے ممبر وہی لوگ مقرر کیے گئے جو اپنی لیاقت اور اصلاحات کی حمایت کا قوی ثبوت دے چکے تھے، کمیشن نے اگست ۱۸۴۶ء میں اپنی رپورٹ پیش کی، اس رپورٹ کے مطابق تعلیم عامہ کی ایک مستقل مجلس مقرر کی

(۱) لارپنٹ ج ۲ ص ۱۳۴

گئی اور اس کے ماتحت عثمانیہ یونی ورسٹی بطور ایک سرکاری ادارہ کے قایم ہوئی، تعلیم کے تین درجے قرار دئے گئے: (۱) ا ائی تعلیم جس کے خاص اجزا وہی تھے جو مکتب کے نصاب میں شامل تھے (۲) ثانوی تعلیم جو ایک درمیانی اور نئی چیز تھی (۳) اعلیٰ تعلیم جس کے لیے یہ طے پایا کہ جدید اصول پر از سر نو ترتیب دی جائے، لیکن قدیم نظامِ تعلیم اور اس کے طلبہ کو جو حقوق و مراعات حاصل تھے، وہ برقرار رکھے گئے، یونی ورسٹی کے لیے ایک نئی عمارت بننے کا حکم ہوا اور ایا صوفیا کے قریب جیب خانہ کے مقام پر جہاں پہلے ینی چری فوجوں کی بارکیں تھیں، اس کا سنگِ بنیاد بڑی شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ (۱)

ابتدائی تعلیم: تعلیمی مجلس نے سب سے پہلے ا ائی مدارس کی اصلاح شروع کی اور پہلا کام یہ کیا کہ ا ائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا، اور پیاسٹر (۲) ماہانہ کی رقم جو پہلے استاد کو دی جاتی تھی، اس کے بجائے اساتذہ کی مستقل تنخواہیں مقرر کر دی گئیں جو مکتبوں کی موقوفہ جائدادوں سے حاصل کی جاتی تھیں، جہاں ان جائدادوں کی آمدنی کافی نہ ہوتی، وہاں حکومت کی طرف سے یہ کمی پوری کر دی جاتی تھی، اس کے بعد یہ قانون جاری کیا گیا کہ تمام مسلمان اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر جب ان کی عمر چھ سال کی ہو جائے ضلع کی میونسپلٹی کے صدر دفتر میں حاضر ہوں اور ان بچوں کے نام مکتب کے رجسٹر میں درج کرائیں، جو لوگ اپنے بچوں کو مکتب کی تعلیم دلانا نہ چاہتے ان کو یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ انھوں نے گھر پر تعلیم کا معقول انتظام کر لیا ہے، اس حکم پر عمل درآمد کرانے کے لیے ایک قانون یہ بھی بنایا گیا کہ کسی فن کا استاد کسی لڑکے کو اپنے ہاں بطور شاگرد کے نہ رکھے، جب تک اس لڑکے نے مکتب کی سند حاصل نہ کر لی ہو، ا ائی مدارس کا نصابِ تعلیم تقریباً وہی قایم رکھا گیا جو قدیم طرز کے مکتبوں کا تھا، مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ا ائی مدارس میں قرآن مجید، ترکی زبان، عربی کا املا، خط اور حساب تقسیم

---

(۱) لارپنٹ ج ۲ ص ۴۸-۱۴۷ (۲) پیاسٹر جسے ترکی میں قرش یا غرش کہتے ہیں دو آنے کے برابر ہوتا ہے۔

تک سکھایا جاتا تھا، قدیم مکتبوں میں ترکی زبان کی ریڈریں رائج نہ تھیں، اب خاص طور پر بچوں کے لیے عام فہم ترکی ریڈریں تیار کی گئیں اور تعلیمی مجلس نے تمام ابتدائی مدارس میں انھیں پڑھانے کا حکم دیا، صرف قسطنطنیہ میں ان مدارس کی تعداد ۱۸۵۲ء میں (۳۹۶) تھی جن میں (۲۲۷۰۰) لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں (۱) مدتِ تعلیم زیادہ سے زیادہ پانچ سال تھی، لیکن ذہین طالب علم اس سے پہلے ہی نصاب ختم کر کے ترقی کر سکتا تھا۔

ثانوی تعلیم: مکاتب ابتدائیہ کے بعد مکاتب رشدیہ کا درجہ تھا، جن میں ثانوی تعلیم دی جاتی تھی، اس کی مدت بھی عموماً چار سال تھی، لارپنٹ لکھتا ہے کہ ۱۸۵۱ء میں مکاتب رشدیہ کی تعداد چھ تھی جن میں (۸۷۰) طلبہ زیر تعلیم تھے، چونکہ ان ثانوی مدارس کے قیام کو ابھی بہت تھوڑی مدت گذری تھی، اس لیے طلبہ کی یہ تعداد کافی امید افزا تھی، ابتداء نصاب میں صرف یہ مضامین تھے: عربی صرف ونحو، املا، انشا، اسلامی تاریخ، ترکی تاریخ، عام تاریخ، جغرافیہ، حساب اور علم ہندسہ (جیومیٹری) کے کچھ حصے، لیکن مولانا شبلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کچھ مضامین بڑھا دئے گئے تھے اور کچھ بدل دئے گئے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ رشدیہ کی مدت تعلیم تین برس تھی اور اس میں ترکی املا، مفرداتِ زبان ترکی، نحو ترکی، عقائد اسلام بزبانِ ترکی، حساب چاروں حصے، فرنچ زبان، عربی زبان، جغرافیہ، اقلیدس، کاغذات تجارت کے اصول اور نقشہ کشی کی تعلیم ہوتی تھی (۲)، رشدیہ میں بھی تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی، مدارس کے اخراجات، اساتذہ کی تنخواہیں، طلبہ کی کتابیں اور آلات، یہ سب چیزیں حکومت کی طرف سے ملتی تھیں۔ (۳)

مولانا شبلی نے ثانوی تعلیم کے دو درجے بیان کیے ہیں، رشدیہ اور اعدادیہ، رشدیہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے مڈل کے برابر یا اس سے کچھ بڑھ کر ہے، رشدیہ کے بعد اعدادیہ کا درجہ بتایا ہے، جس کو انٹرنس کہا جا سکتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: "اس کلاس کے طالب علموں کی مجموعی تعداد ۱۸۹۲ء میں (۵۲۱۵) تھی، اس میں تمام

(۱) لارپنٹ ج ۲ص ۱۵۰ (۲) سفرنامہ روم ومصر وشام (۳) لارپنٹ ج ۲ص ۱۵۲

اضلاع اور خود پایہ تخت کے مدارس شامل ہیں۔"

اعلیٰ تعلیم: اعلیٰ تعلیم کی اصلاح تعلیمی مجلس کے لیے سب سے زیادہ دشوار تھی کیونکہ علما اس میں کسی تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے اور مدرسوں کے نصاب کی اصلاح کے سخت مخالف تھے، بہر حال چونکہ ثانوی مدارس حال ہی میں قایم ہوئے تھے اور طلبہ کو وہاں سے فارغ ہوکر کالج کی تعلیم تک پہنچنے میں تین سال کی مدت درکار تھی، مجلس کو یہ فرصت غنیمت معلوم ہوئی اور اس نے اپنے ہی ارکان میں سے ایک رکن کمال آفندی کو جو اسکولوں کے انسپکٹر جنرل تھے یورپ روانہ کیا تاکہ فرانس، جرمنی اور انگلستان کی یونی ورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کریں، چنانچہ کمال آفندی کئی مہینے پیرس میں مقیم رہے اور حکومت فرانس نے ان کے لیے تمام ضروری معلومات بہم پہنچائیں، اس درمیان میں تعلیمی مجلس نے خاص خاص مدرسوں کی اصلاح کی کوشش کی، جن میں سے بعض نہایت قدیم زمانہ سے قایم تھے، یہ مدرسے اعدادیہ سے اونچے درجہ کے تھے اور ان میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔

غرض سلطان عبدالمجید خاں کے دورِ حکومت میں منجملہ اور اصلاحات کے تعلیم کی اصلاح کا کام بھی نہایت سرگرمی سے شروع کیا گیا اور بہت سی مفید اصلاحیں کی گئیں، لیکن ۱۸۵۲ء کے بعد وہ جوش باقی نہیں رہا اور تحریک سست پڑگئی، چنانچہ جدید یونیورسٹی کی تعمیر بھی ملتوی ہوگئی اور سلطنت کے خاص خاص شہروں میں ثانوی مدارس جو قایم کیے جانے والے تھے وہ بھی قایم نہ ہوسکے پھر بھی اس درمیان میں ایک علمی اور ادبی اکادیمی قایم کردی گئی تھی، جس کا مقصد بلند معیار کتابوں کی تالیف وترجمہ کے ذریعہ زبان و ادب کی اصلاح اور تعلیم عامہ کی ترقی تھا۔

جب سلطان عبدالمجید خاں ثانی تخت پر آئے تو تعلیمی ترقی کی رفتار پھر تیز ہونے لگی، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> "سلطان کی تخت نشینی کے وقت مدارس رشدیہ کی تعداد (۹۶) تھی، لیکن اب (۱۸۹۲ء میں) ۴۰۵ ہے، ہر قسم کے نئے مدارس

جو سلطان کی شانزدہ سالہ حکومت میں قایم ہوئے ان کی تعداد دو ہزار ہے، اسی کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں طالب علموں کی تعداد اس کثرت سے بڑھتی جاتی ہے کہ ترقی تعلیم کی سالِ ماقبل کی رپورٹ سالِ مابعد سے کچھ نسبت نہیں رکھتی، پروفیسر ویمبری نے اب سے چند برس پہلے ترکوں کی عام ترقی پر جو لکچر دیا، اس میں مکتب الحقوق (قانونی کالج) کے طالب علموں کی تعداد تین سو بیان کی ہے، لیکن میں جب قسطنطنیہ میں تھا تو اس کالج میں بارہ سو طالب العلم موجود تھے، میں نے زمانۂ قیام مصر میں قاہرہ کے مشہور اخبار المؤید میں پڑھا تھا کہ سلطان خاں نے جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مصارفِ تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ تھے، لیکن اب آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ ہیں، یہ رقم ہمارے یہاں کے ایک کرور میں لاکھ کے مساوی ہے۔"(۱)

تعلیم کی اس ترقی کے باوجود سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں قبائل عرب اس کے فیض سے تقریباً بالکل محروم تھے، اس لیے سلطان نے خاص عربوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج اور اس کے ساتھ ایک وسیع بورڈنگ ہاؤس قایم کرنے کا حکم دیا اور حکام و عمال کے نام فرمان صادر کیے کہ حجاز، یمن، دیار بکر، بغداد، طرابلس الغرب، حلب، موصل اور شام سے معزز عرب قبائل کے لڑکے انتخاب کر کے بھیجے جائیں، ان کے تمام مصارف سلطان نے حکومت کی طرف سے دینے منظور کیے، ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کو اس کالج کی رسم افتتاح بڑی شان وشوکت کے ساتھ ادا کی گئی، کالج کا نام مکتب العشائر رکھا گیا۔

اسی طرح خاص یتیموں کے لیے بھی سلطان عبدالحمید خاں نے ایک مدرسہ قایم کیا، جس کا نام دار الشفقہ تھا، ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا، اس

(۱) سفرنامہ

مدرسہ میں ایک ہزار یتیم لڑکے تعلیم پاتے تھے اور سب کے سب بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے، ان کی خوراک، لباس اور تمام ضروری مصارف کا بار سر رشتۂ تعلیم پر نہیں بلکہ خود سلطان کی جیب خاص پر تھا۔

تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں ہر قسم کے مدارس جو صرف قسطنطنیہ میں تھے ان کی مجموعی تعداد پانچ سو تھی، جن میں تیرہ بڑے بڑے کالج تھے (۱)، کالجوں اور اسکولوں میں مندرجہ ذیل زیادہ اہم تھے:

(۱) مکتب حربیہ شاہانہ، اس کو سلطان محمود ثانی نے فرانس کے فوجی کالج کے نمونہ پر ۱۸۳۰ء میں قایم کیا تھا، اس کے اساتذہ زیادہ تر فرانسیسی افسر تھے، تعلیم کی مدت پیدل فوج کے لیے چار سال اور سوار کے لیے پانچ سال تھی، لارپنٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۵۳ء میں اس کے طالب علموں کی تعداد (۱۲۰) تھی، مکتب حربیہ کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کالج تھا قسطنطنیہ، مناستر، بروصہ، دمشق اور بغداد میں فوجی اسکول بھی قایم تھے، جہاں مکتب حربیہ کے لیے طالب علم تیار کیے جاتے تھے، ۱۸۹۲ء تک جب مولانا شبلیؒ نے جا کر اسے دیکھا یہ کالج بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ اس میں حربی علوم کے علاوہ طبیعیات، کیمیا، ریاضی اور بالخصوص طب کی تمام شاخوں کی تعلیم اس حد تک ہوتی ہے کہ اسے اصطلاحی تعلیم کے دائرہ سے باہر نہیں کہا جا سکتا، ۱۸۹۲ء میں اس کالج کے ماتحت جس قدر حربی مدارس تھے ان کی تعداد (۴۷) تھی، جن میں (۱۸) اعدادیہ اور (۲۹) رشدیہ تھے، ان میں (۹۲۲۴) طالب علم تعلیم پاتے تھے (۲)، اس کالج کے تفصیلی حالات مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔

(۲) مکتب سلطانی، یہ کالج مکتب حربیہ کے سوا تمام کالجوں سے ممتاز تھا، یہ غلطہ سرائے میں واقع تھا، جہاں زیادہ تر یوروپین تاجر آباد تھے، اس وجہ سے دوسرے کالجوں کی نسبت اس میں عیسائی لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ طالب علموں

(۱) سفرنامہ (۲) ایضاً

کی مجموعی تعداد آٹھ سو تھی جن میں زیادہ تر بورڈر رہتے تھے، تمام بورڈروں کی خوراک، کپڑے، بچھونے، کتاب کاغذ وغیرہ کالج کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے، بورڈر سے چالیس پونڈ سالانہ (چھ سو روپیہ) فیس لی جاتی تھی، ایسے طالب علم بھی داخل ہو سکتے تھے جو دو ثلث یا ایک ثلث فیس ادا کر سکتے تھے یا بالکل نہیں ادا کر سکتے تھے، لیکن ان کی تعداد معین تھی، اس قسم کے طلبہ کی بقیہ فیس خود سلطان یا امرائے شہر ادا کرتے تھے، اس لیے خوراک اور لباس وغیرہ کے لحاظ سے ان میں اور ذی مقدور طالب علموں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا، جو طلبہ بورڈر نہیں تھے، ان کی فیس دس پونڈ سالانہ تھی، تعلیمی حیثیت سے اس کالج کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام علوم وفنون فرانسیسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور اس وجہ سے اکثر پروفیسر فرانسیسی یا جرمن تھے، ترکی زبان کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ کی دی جاتی تھی، عربی و فارسی کی تعلیم بھی لازمی تھی مگر معیار بلند نہ تھا، یونانی، ارمنی، انگریزی، جرمن، اطالوی اور لاطینی زبانوں کی تعلیم اختیاری تھی، اس کالج کے نصابِ تعلیم کے متعلق مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''ترکی و عربی و فارسی میں علاوہ علم ادب اور قرآن مجید کے جن مضامین کی تعلیم ہوتی ہے وہ یہ ہیں: عقائد، فقہ، اخلاق، تاریخ دولت عثمانیہ، قرأت، تجوید، حدیث وتفسیر لیکن قرأت وحدیث وتفسیر کی تعلیم چوتھے درجہ سے شروع ہوتی ہے اور ہفتہ میں صرف ایک بار ہوتی ہے، فرنچ زبان شروع ہی سے پڑھائی جاتی ہے اور اختتامِ تعلیم یعنی سات برس تک برابر جاری رہتی ہے۔ نحو، صرف، ادب کے ساتھ اصول انشا نگاری وفن بلاغت اعلیٰ درجہ تک پڑھایا جاتا ہے اور مضامین ذیل کی تعلیم بھی اسی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ حساب، جبر ومقابلہ، جغرافیہ، ہندسہ، کیمسٹری، علم الحیوانات، طبیعیات، الکٹرسٹی، علم الاصوات، علم طبقات الارض، رسم ہندسی، رسم تقلیدی۔

(۳) مکتب ملکیہ، یہ سول سروس کالج سلطان عبدالحمید خاں ثانی کا قایم کردہ تھا، پہلے اس میں پانچ درجے تھے، تین ادنیٰ اور دو اعلیٰ اور مدتِ تعلیم کل پانچ سال تھی، لیکن بعد میں دو درجے اور بڑھادئے گئے، جس سے مدت تعلیم میں بھی دوسال کا اضافہ ہوگیا، اس کالج میں فرانسیسی زبان کے ساتھ یونانی اور ارمنی زبان کی تعلیم بھی لازمی تھی، عربی و فارسی بھی نصاب میں داخل تھی، لیکن لازمی نہ تھی، تاریخ، جغرافیہ، برقیات، طبعیات، اقتصادیات، اصولِ قانون اور قوانین یورپ کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی، اس کالج کے تعلیم یافتہ بڑے بڑے ملکی عہدوں پر مقرر کیے جاتے تھے، ۱۸۹۲ء میں اس کے طلبہ کی تعداد چھ سو سے زیادہ تھی۔

مکتب ملکیہ تو سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں قایم ہوا، لیکن سول سروس یعنی ملازمت دیوانی کی تعلیم کے لیے سلطان محمود ثانی نے بھی دو مدرسے مسجد احمد اور مسجد سلیمان سے متعلق قایم کیے تھے، لارپنٹ کا بیان ہے کہ ۱۸۳۱ء میں ان کے طلبہ کی مجموعی تعداد (۳۷۰) تھی، جن میں سے (۲۵۰) پہلے مدرسہ میں تھے اور (۱۲۰) دوسرے میں نصابِ تعلیم یہ تھا: عربی و فارسی صرف ونحو، جغرافیہ، تاریخ، خوشنویسی، اسی قسم کا مدرسہ سلطان محمود کی والدہ نے ۱۸۳۰ء میں قایم کیا تھا، جس کے اخراجات وہ اپنی جیب خاص سے ادا کرتی تھیں، اس مدرسہ کا خاص مقصد حکومت کے لیے اہل کار تیار کرنا تھا، مدتِ تعلیم چار سال تھی، اس میں بلا امتیاز مذہب ہر فرقہ کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔

(۴) مکتب الحقوق (قانونی کالج) اس میں مضامین ذیل پڑھائے جاتے تھے: فقہ، اصولِ فقہ، رومن لا، قانون تجارت، اصولِ محاکمہ، تعزیرات، قانون بحری، سیاست مدن، قوانین سلطنتہائے یورپ، مختصر طور پر قانون کی ایجاد کی تاریخ اور اس کی عہد بعہد کی ترقیاں ۱۸۹۲ء میں طالب علموں کی مجموعی تعداد بارہ سو تھی جن میں چھ سو بورڈر تھے، یہاں کے تعلیم یافتہ منصف اور صدر الصدور وغیرہ کے عہدوں پر مقرر کیے جاتے تھے، مدتِ تعلیم چار برس تھی۔

(۵) مکتب الہندسہ، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ رڑکی کالج کے مشابہ ہے، مدتِ تعلیم چھ برس تھی۔

(۶) مکتب اللسان، اس میں جرمن، فرانسیسی، یونانی، ارمنی، لاطینی، اطالوی اور روسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔

(۷) مکتب الصناعۃ یعنی ٹیکنکل اسکول، اس میں حدادی، نجاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی، ۱۸۹۲ء میں اس کے طالب العلموں کی تعداد (۲۴۰) تھی اور یہ کل یتیم لڑکے تھے، ان کے مصارف مدرسہ کے فنڈ سے ادا ہوتے تھے۔

(۸) مکتب نواب، اس کالج میں وہ طلبہ تعلیم پاتے تھے جو قاضی اور مفتی کے عہدوں کے امیدوار ہوتے، پہلے ان عہدوں کے لیے کسی خاص قسم کی تعلیم میں امتحان دینا مشروط نہ تھا مگر سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ جو شخص اس کالج کا تعلیم یافتہ نہ ہو وہ شرعی مناصب پر مامور نہیں کیا جا سکتا، اس کالج میں فقہ کی تعلیم نہایت اعلیٰ معیار پر ہوتی تھی، علومِ جدیدہ کی بعض چیزیں بھی نصاب میں داخل کر لی گئی تھیں۔

(۹) مکتب بحریہ، اس میں جہاز رانی کی تعلیم ہوتی تھی۔

(۱۰) مکتب الزراعۃ، یہ ۱۸۵۱ء میں قسطنطنیہ سے قریب سان اسٹیفانو کے مقام پر قایم کیا گیا تھا اور اس میں زراعت، نباتات اور جانوروں کے متعلق نظری اور عملی تعلیم دی جاتی تھی، ۱۸۵۳ء میں اس میں (۴۶) طالب علم تھے جن میں سے (۲۳) مسلمان تھے اور (۲۳) مختلف قوموں کے عیسائی۔

جانوروں کے متعلق ایک مخصوص مدرسہ بھی تھا جسے پرشا کے ایک ڈاکٹر نے ۱۸۴۴ء میں قایم کیا تھا۔

(۱۱) مکتب طبیہ، اسے سلطان محمود ثانی نے غلطہ سرائے میں قایم کیا تھا اور اس میں عیسائی اور مسلمان طلبہ دونوں داخل کیے جاتے تھے، تعلیم کچھ فرانسیسی زبان میں دی

جاتی تھی کچھ ترکی زبان میں، اس مدرسہ میں ایک مطبع بھی تھا جہاں سے ایک ماہوار طبی گزٹ فرانسیسی زبان میں نکلتا تھا، ایک ہسپتال اور حیوانات، نباتیات اور طبیعیات کا ایک ادارہ بھی اس سے متعلق تھا۔

(۱۲) فوجی انجینئروں کے لیے ایک کالج سلطان سلیم ثالث نے قایم کیا تھا، سلطان عبدالمجید خان کے عہد میں اسے از سر نو جدید طرز پر منظم کیا گیا اور فوجی انجینئروں کے علاوہ سول انجینئروں اور توپچیوں کو بھی اس میں تعلیم دی جانے لگی، ۱۸۵۲ء میں اس کے طلبہ کی تعداد (۹۰) تھی۔

(۱۳) ایک ٹریننگ کالج اساتذہ کی تعلیم کے لیے بھی تھا، ۱۸۵۳ء میں اس میں ساٹھ طلبہ تھے جن میں سے نصف کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔

چند خاص باتیں: نظام تعلیم کی نسبت چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) تقریباً تمام کالجوں اور اسکولوں میں فرانسیسی زبان کی تعلیم لازمی تھی جس کی وجہ سے تعلیم جدید کا ہر طالب علم اس زبان سے آشنا ہو جاتا تھا۔

(۲) تمام بڑے بڑے کالجوں میں طبیعیات، کیمیا اور ارضیات وغیرہ کی تعلیم بھی لازمی تھی اور ان علوم کی عملی مشق کرائی جاتی تھی۔

(۳) بجز مکتب سلطانیہ کے جس میں عیسائی طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی اور تمام مدارس میں ہر قسم کے علوم وفنون ملکی زبان یعنی ترکی میں پڑھائے جاتے تھے۔

(۴) تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی تھے، جن میں کثرت سے طلبہ رہتے تھے، لیکن اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ وضع، لباس، خوراک، فرنیچر وغیرہ تمام چیزیں ایک سی ہوں تاکہ طالب علموں میں بظاہر فرقِ مراتب نہ پایا جائے، بورڈنگ ہاؤس کی فیس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے تھے اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے تھے۔

(۵) ہر کالج میں غریب طالب علموں کی تعداد بھی معتدبہ ہوتی تھی، لیکن

دولتمند ترکوں کی طرف سے انھیں کافی مدد دی جاتی تھی، مولانا شبلی کے زمانہ سفر (۱۸۹۲) میں کالجوں کی فیس پچاس پونڈ سالانہ سے کم نہ تھی، صرف مکتب سلطانیہ میں چالیس پونڈ سالانہ تھی، اس وقت اس کالج میں دوسو غریب طالب علم تھے، جن میں سے ڈیڑھ سو کی فیس امرا اور ارکانِ حکومت ادا کرتے تھے اور پچاس کی سلطان اپنی جیب خاص سے دیتے تھے، طلبہ کی ظاہری حالت سے کوئی شخص یہ تمیز نہیں کرسکتا تھا کہ ان میں سے کون غریب اور نادار ہے۔

بعض باتوں کی کمی: اس تعلیمی ترقی کے باوجود بعض چیزوں کی کمی بھی نمایاں تھی، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ کسی کالج بلکہ تمام شہر میں کوئی علمی انجمن ایسی نہ تھی جہاں طالب علموں کو تقریر کرنے کی مشق کرائی جاتی، دوسری کمی یہ تھی کہ کالج اور بڑے بڑے اسکول سب قسطنطنیہ تک محدود تھے، اگرچہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کثرت سے مدرسے قایم ہوگئے تھے تاہم وہ عموماً ابتدائیہ اور رشدیہ یعنی اوسط درجے کے مدارس تھے، مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت بیروت، دمشق، حلب اور بیت المقدس میں کوئی مدرسہ ایسا نہ تھا جسے کالج کہا جاسکے، ایک قابل لحاظ بات یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج حکومت کی طرف سے تھے، ایک بھی قومی کالج نہ تھا، یہ کمی قابل افسوس ضرور تھی مگر اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے تعلیم کا جو انتظام کیا تھا وہ اس قدر کافی تھا کہ قوم نے اس میں اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نوجوان ترکوں کی تعلیمی اصلاحات: سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی کے بعد جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے منجملہ دیگر امور کے تعلیم میں بھی اہم اصلاحات کیں، ترکی میں تعلیم عامہ کا جو نظام آج موجود ہے وہ انہی کا قایم کیا ہوا ہے، دور تنظیمات میں تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا: قدیم اور جدید، قدیم یعنی مذہبی مدارس کا انتظام شیخ الاسلام کے ہاتھ میں تھا اور جدید مدارس کے لیے حکومت نے ایک نیا محکمہ معارف کے نام سے قایم کیا تھا، ان مدارس میں مغربی زبانوں اور جدید علوم وفنون

کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، نوجوان ترکوں کے زمانہ میں شیخ الاسلام خیری آفندی نے قدیم مکاتب میں بھی جو مسجدوں سے متعلق تھے جدید طرز تعلیم کو رواج دیا اور جدید طرز کا ایک کالج بھی قایم کیا، جس مین سائنس اور تاریخ کی تعلیم کے لیے بہت قابل اساتذہ مقرر کیے گئے، لیکن یہ کالج زیادہ دنوں قایم نہ رہ سکا اور شیخ الاسلام کے مستعفی ہو جانے کے بعد توڑ دیا گیا، البتہ خیری آفندی نے مکتبوں میں جو اصلاح شروع کی تھی اس کی تکمیل یوں ہوئی کہ حکومت نے ان تمام مکتبوں کو محکمۂ تعلیمات کے سپرد کر دیا اور مذہبی تعلیم کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں آ گیا، نوجوان ترکوں نے دس سال کی قلیل مدت میں تعلیم کو جو ترقی دی، اس کا اندازہ خالدہ ادیب خانم کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

''۱۹۰۸ء میں جب حکومت نوجوان ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو دو کرور تین لاکھ آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ایک فی صدی تھی، ۱۹۱۸ء میں جب وہ حکومت سے علاحدہ ہوئے تو ایک کرور چالیس لاکھ کی آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بیس فی صدی تک پہنچ گئی تھی۔''(۱)

اعلیٰ تعلیم کے متعلق خالدہ خانم لکھتی ہیں:

''قسطنطنیہ کی یونی ورسٹی عہد تنظیمات کے نوجوان ترکوں نے قایم کی مگر عبدالعزیز نے اسے بند کرا دیا، اس کی حکومت کے آخر زمانہ میں دینیات اور سائنس کے شعبے کھول دیے گئے مگر حقیقی معنوں میں یونی ورسٹی اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں نے قایم کی، جرمنی سے (۱۹) پروفیسر بلائے گئے جن میں سے بعض علمی دنیا میں شہرت رکھتے تھے، ان کے اسسٹنٹ ترک تھے جنھوں نے جرمن یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی، نوجوان ترکوں کی دس سال کی حکومت میں

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۹۶

یونیورسٹی کہیں سے کہیں پہونچ گئی، اس کا سب سے زیادہ قابل قدر کام
یہ تھا کہ اس نے بہت سی کتابیں شایع کیں جن میں سے اکثر سائنس،
تاریخ اور ادب کی کتابوں کے ترجمے تھے، تالیف اور ترجمہ کے لیے
ایک علاحدہ انجمن قایم تھی، جس نے بڑی مفید خدمت انجام دی،
تاریخ اکاڈیمی نے عثمانی تاریخ کے متعلق بہت قابل قدر تحقیقات کی۔"

جامعۂ استنبول کی ترقی کا اندازہ اس کے مختلف شعبوں اور ان کے طلبہ کی تعداد سے کیا جاسکتا ہے، جو ۱۹۱۰ء سے متعلق میرز (E.G. Mears) نے اپنی کتاب ماڈرن ٹرکی میں درج کی ہے۔

شعبۂ قانون	(۲۵۰۰)	شعبۂ سیاسیات	(۳۰۰)
شعبۂ دینیات	(۱۴۰)	شعبۂ ادب	(۱۰۰)
شعبۂ نیچرل سائنس	(۹۰)	شعبۂ ریاضیات علمیہ	(۸۰)
شعبۂ انجینئرنگ	(۵۰۰)	شعبۂ طب	(۸۵۰)(۱)

جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی نوجوان ترکوں نے تعلیمی ترقی کی کوشش جاری رکھی، چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جامعۂ استنبول کی از سر نو تنظیم کی گئی اور طلبہ کے قیام وغیرہ کے متعلق مزید سہولتیں بہم پہنچائی گئیں، اسی زمانہ میں ایک نمایاں ترقی یہ ہوئی کہ لڑکیوں کے لیے بھی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام بڑے پیمانہ پر کیا گیا اور قسطنطنیہ میں پانچ ہائی اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قایم کیے گئے، یہ اسکول جرمن اساتذہ کی نگرانی میں تھے اور ان میں دو ہزار سے زیادہ لڑکیاں پڑھتی تھیں (۲)، اب تک لڑکیوں کے لیے صرف ابتدائی مدارس تھے جن میں دس سال کی عمر تک وہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں، ان کی ثانوی تعلیم کے لیے صرف چند ہائی اسکول تھے جن میں سے ایک قسطنطنیہ میں تھا اور ایک بیروت میں۔

---

(۱) ماڈرن ٹرکی از میرز ص ۱۲۵ مطبوعۂ نیویارک ۱۹۲۴ء (۲) ایضاً ص ۱۲۶

نوجوان ترکوں نے جب سے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، چند روز بھی امن واطمینان کے میسر نہ آئے کہ پیش نظر اصلاحات کی تکمیل کر سکتے، بیرونی جنگوں کے علاوہ خود ملک کی اندرونی شورشیں اور مخالفتیں قدم قدم پر حائل ہوتی رہیں، تاہم اپنے مختصر دور حکومت میں انھوں نے تعلیم کو جس قدر ترقی دی وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے، اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ تمام ملک میں مغربی نظامِ تعلیم کو رائج کر دیا، اس وقت تک امریکن کالجوں سے جو ترکی میں تقریباً نصف صدی سے قایم تھے ہزاروں طلبہ فارغ ہو کر نکل چکے تھے، لیکن ان میں ترکوں کی تعداد تھوڑی تھی، یوروپین نظامِ تعلیم کو اختیار کرنے کا پہلا اہم قدم اس وقت اٹھایا گیا جب ترکی جرمنی کے ساتھ جنگ عظیم میں شریک ہوا، دو ہزار سے زیادہ ترک لڑکے ہائی اسکول اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے جرمنی بھیجے گئے جو آج جدید ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک ممتاز جزو ہیں۔(۱)

---

(۱) کمالی ترکی اور مشرقی وسطی از ڈاکٹر کروگر ص۸۱ (Kemalist Turkey and the middle east by Dr. Kruger)

عثمانی ترک

(۱)

ادبی، تمدنی اور سیاسی تحریکیں

انیسویں صدی تک دولت عثمانیہ کی تاریخ حقیقتاً اس کے بادشاہوں کی تاریخ تھی، سلطان کی حیثیت ایک راعی کی تھی جس کا فرض رعایا کی نگہ داشت اور فلاح و بہبود تھا، قوم کو امورِ مملکت میں کوئی دخل نہ تھا، لیکن جب سلاطین کی کمزوری اور غفلت سے حکومت کے تمام شعبوں میں ابتری پھیلنے لگی اور سلطنت کے باشندے ان حالات سے تنگ آگئے تو ان کے اندر اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، جس نے رفتہ رفتہ مطالبات کی شکل اختیار کر لی، قدیم نظامِ حکومت فرسودہ ہو چکا تھا اور اس میں قومی بیداری کی اس بڑھتی ہوئی روکو روکنے کی طاقت نہ تھی، دوسری طرف فرانس میں انقلابی تحریک نے نہ صرف غیر مسلم رعایا بلکہ ترکوں میں بھی حریت کے خیالات پھیلا دئے تھے۔

عثمانی ترکوں میں مغربی تحریک اول اول فوجی اصلاحات سے شروع ہوئی، یہ تحریک یورپ سے تمدنی تعلقات کی بنا پر نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس کا سبب وہ احساسِ کمتری تھا جو "صلح نامہ کوچک کینارجی" (۱۷۷۴ء) کے صدمہ سے عثمانی مدبروں میں پیدا ہو گیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ روس نے جسے وہ اب تک ایک حقیر دشمن خیال کرتے تھے، محض مغربی طرز کے اصلاحات جاری کرنے سے میدانِ جنگ میں انھیں شکست دے دی اور انھوں نے اس شکست سے یہ نتیجہ نکالا کہ مغرب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ خود اسی کے

ہتھیاروں سے کیا جا سکتا ہے، لیکن یورپ کی فوجی طاقت اس کی مضبوط انتظامی اقتصادی اور مالیاتی بنیادوں پر قایم تھی اور سلطنت عثمانیہ میں یہ بنیادیں روز بروز زیادہ کمزور ہوتی جارہی تھیں، پھر بھی انیسویں صدی کے نصف اول میں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے سب سے زیادہ توجہ عثمانی فوج کو مغربی طرز پر مرتب کرنے میں صرف کی اور اس میں شبہہ نہیں کہ جو توقعات اس فوج سے قایم کی گئی تھیں وہ بہت کچھ پوری ہوئیں، ان فوجی اصلاحات کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی افسروں نے ترقی و اصلاح کی ہر مزید کوشش میں حصہ لینا شروع کیا، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ فوجی افسر دوسری جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ روشن خیال تھے بلکہ وجہ یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ میں ایک صدی تک یہی ایک جماعت ایسی تھی جسے باقاعدہ مغربی تربیت دی گئی تھی اور اس لیے مغربی کلچر (تہذیب وتمدن) کا اثر اسی جماعت پر زیادہ پڑا تھا، سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے دور استبداد میں بھی فوجی افسروں کی مغربی تعلیم بند نہیں کی گئی، لیکن یہ نوجوان افسر فن حرب کے اصول مغربی زبانوں کے سیکھے بغیر حاصل نہیں کر سکتے تھے اور ان زبانوں کے ذریعہ سے وہ مغربی خیالات سے بھی واقف ہو گئے۔

مغربی خیالات کی اشاعت بالواسطہ جدید نظامِ تعلیم سے بھی ہوئی، جو تنظیمات کے عہد میں قایم کیا گیا تھا، تنظیمات محض انتظامی، عدالتی اور مالیاتی اصلاحات تک محدود نہ تھیں بلکہ اس سلسلہ میں تعلیم کو ترقی دینے کے لیے جدید طرز کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کھولے گئے اور ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی، تعلیمی اصلاحات کا ذکر مفصل طور پر گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے، رفتہ رفتہ قدیم مدرسوں کے حلقہ کے باہر ایک جدید تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو گیا، یوروپین زبانوں خصوصاً فرانسیسی زبان سے بہت سی علمی اور ادبی کتابوں کا ترجمہ ترکی میں کیا گیا اور ترکی ادبی زبان جو مغلق الفاظ، مقفیٰ اور مسجع عبارت اور تشبیہات و استعارات سے گرانبار تھی آسان بنائی جانے لگی، یورپ میں وطنیت اور قومیت کی جو تحریک انیسویں صدی میں پیدا ہو گئی تھی اس نے اب سلطنت عثمانیہ کی طرف

بھی رخ کیا اور ادب وصحافت کے ذریعہ پوری قوم میں پھیل گئی۔

قدیم ادب: قدیم عثمانی ادب زبان وخیالات دونوں لحاظ سے جمہور سے الگ تھا، اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت تھی اور عبارت آرائی اس کی زینت سمجھی جاتی تھی، یہ زیادہ تر ایرانی ادب کے زیر اثر تھا، حسن وعشق کی داستان، گل وبلبل کے افسانے، موسم بہار کی دل کشی اور عموماً ان سب کی تہ میں تصوف کی چاشنی، فارسی شاعری کی طرح قدیم عثمانی شاعری کی بھی تقریباً کل کائنات یہی تھی، بلند پایہ نثر میں پر تکلف عبارت آرائی اور پیچیدگی پائی جاتی تھی، البتہ واقعہ نگاری میں عثمانیوں کو خاص امتیاز حاصل تھا، خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں:

> ''میرے خیال میں عثمانی ترکوں کے ادب کی بہترین صنف سوانح نگاری ہے، پندرہویں صدی سے درباری مورخ برابر ترکی تاریخ قلم بند کرتے رہے، گو ان کی زبان خصوصاً سولہویں صدی کے بعد سے ثقیل ہے مگر ان میں حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری کا وصف ایسا ہے کہ ان کی تصنیفات تاریخ کے طالب علم اور آرٹ کے قدرداں دونوں کے لیے بہت بڑی قیمت رکھتی ہیں، وہ اس زمانہ کی زندگی کا ہو بہو مرقع دکھاتے ہیں، جس میں سلاطین، وزرا، امرا اور عوام سب کی تصویریں موجود ہیں، زمانہ انقلاب میں عوام کی جدوجہد کا جیسا مفصل اور مکمل بیان ان سوانح میں ہے میں نے آج تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا، تنقید کا ان کے یہاں نام بھی نہیں ہے، خوش قسمتی سے یہ مورخ اور اس زمانہ کے عثمانی اس احساسِ کمتری سے پاک تھے، جس نے ہمارے ادب اور خیالات پر جھوٹ کا رنگ چڑھا دیا ہے، وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھ دیتے تھے، انھیں اس کی فکر نہیں تھی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ کیا کہیں گے۔''(۱)

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۱۶۴

عثمانی ادب کے ذکر میں لارپنٹ لکھتا ہے کہ شاعری کی طرح ابتدائی وقائع نگاری بھی فارسی میں کی جاتی تھی، لیکن بعد میں سلطنت کے حالات ترکی زبان میں لکھے جانے لگے اور درباری مورخوں نے سن وار، ترتیب کے ساتھ تمام واقعات آغازِ سلطنت سے لے کر اپنے زمانہ تک تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے، رنگین اور پرتکلف عبارت کے علاوہ عثمانی وقائع نگاروں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخی تنقید بالکل نہیں ہوتی، واقعات یکے بعد دیگرے تاریخ وار بیان کیے جاتے ہیں اور بظاہر ان میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات سے لے کر بڑے بڑے واقعات تک سب انتہائی احتیاط اور تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں اور مورخ کے لیے ترکی ادب کا یہ حصہ نہایت قیمتی ہے(۱) مورخوں کی دو قسمیں ہیں: وقائع نگار اور سوانح نگار، سوانح نگاروں نے مشرق کے تمام مشاہیر رجال مثلاً بادشاہوں، وزیروں، مفتیوں، عالموں، شاعروں، مغنیوں، مصوروں، طبیبوں وغیرہ کے حالات لکھے ہیں۔(۲)

قدیم ادب کے متعلق پروفیسر جولیس جرمانس کا بیان ہے:

'یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خودساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی اور اس لیے خود بھی مصنوعی تھی، شعرا جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے، لیکن جمہور کو شعرا کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی، ان کے پرشکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمہیں عام انسانوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں، کسی دور دراز میدانِ جنگ میں خون میں نہا کر مرنے والوں کے جذبات، ان کی امنگیں، ان کے صدمات، ان کی خوشیاں، ان کے غم والم، ان کے حوصلے، ان میں سے کسی ایک کی بھی صدائے بازگشت نہ سنائی دے گی، اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمہیں نظر نہ آئے گی، اس لیے کہ اس نے اپنے

(۱) ترکی از لارپنٹ ج ۲ ص ۱۸۸ (۲) ایضاً ص ۱۸۹

سانچے روزمرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لیے تھے بلکہ ایک سانچہ پسند کرلیا تھا اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا، تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہو بہو ایک سے ہیں اور تمام شعرا کی مثنویوں میں جو جذبات رنج والم بیان کیے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی فرضی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں۔"(۱)

فطرت پسندانہ شاعری: لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایسی شاعری سے لوگوں کی طبیعت سیر ہوگئی اور زندگی کی واقعی اور اصلی تصویر کھینچنے کا شوق پیدا ہوا، اس شوق نے انیسویں صدی کی ابتدا میں فطرت پسندانہ شاعری کی بنیاد رکھی اور اس حلقہ کے شاعروں نے اپنے کلام میں ترکی معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کیا، بقول خالدہ خانم "انھوں نے ادب کو زندگی کا آئینہ بنادیا اور انسانی فطرت کی مصوری کا حق ادا کردیا۔"

عہد تنظیمات: فطرت پسندانہ شاعری کا دور بہت جلد ختم ہوگیا، انیسویں صدی میں ترکوں میں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا، جو نتیجہ تھا فرانسیسی افکار اور فرانسیسی مذاق شاعری کا چنانچہ ترکی ادب خصوصاً شاعری اپنے خیالات اور طرز ادا کے لحاظ سے فرانسیسی رنگ میں ڈوب گئی، ادب کے ذریعہ فرانس کے سیاسی خیالات بھی پھیلائے جانے لگے، اس عہد کے اہل قلم نے سب سے پہلے "وطن"، "حریت" اور "مشروطیت" (دستوری حکومت) کا اعلان کیا اور اپنی سیاسی اور ادبی تنقیدوں، ناولوں، فلسفیانہ اور عمرانی مقالوں اور مغرب کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے ان خیالات کی اشاعت کی، "عہد تنظیمات" کی ممتاز شخصیتیں شناسی، نامق کمال، عبدالحق حامد اور ضیا پاشا ہیں۔

شناسی: شناسی (۱۸۲۶ء تا ۱۸۷۱ء) تنظیمات کے ادب کا بانی اور نوجوان ترکوں کا سیاسی لیڈر تھا، یہ حیرت انگیز قابلیت کا آدمی تھا، سولہ برس کی عمر میں اس نے عربی اور فارسی ادب پر عبور حاصل کرلیا تھا اور "اسے اس عمر میں پوری ترکی لغت زبانی یاد تھی"(۲)

---

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۵۷ (۲) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۷۲

اس نے فرانسیسی زبان سیکھنے کے بعد فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کی استعداد دیکھ کر سلطان عبدالمجید خاں نے اسے مالیات میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پیرس بھیج دیا، مگر وہاں بھی وہ اپنی فرصت کے اوقات فلسفہ، سائنس اور ادب کے مطالعہ میں صرف کرتا رہا، اپنے ذوق ادب اور سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر وہ تھوڑے ہی دنوں میں پیرس کے علمی حلقہ میں داخل ہوگیا، اور ارنسٹ رینان (Ernest Renon) لا مارتی نے (Lamartine) اور ساسی (Sacy) سے اس کی دوستی ہوگئی، چند سال کے بعد جب وہ ترکی واپس آیا تو صدر اعظم رشید پاشا نے اسے انجمن دانش کا رکن بنا دیا جو ۱۸۵۳ء میں جدید اسکولوں کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کرنے کی غرض سے قایم کی گئی تھی، اس کے علاوہ وہ مجلس مالیات کا رکن بھی مقرر کیا گیا اور فوج کی مالیات کی نگرانی اس کے سپرد ہوئی، لیکن یہ عہدے اس کے سیاسی خیالات کو بدل نہ سکے، وہ استبداد کا شدید مخالف تھا اور ترکی میں دستوری حکومت قایم کرنا چاہتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ سلطان عبدالمجید خاں کے خلاف ایک سازش میں بھی شریک تھا مگر سلطان نے اسے معاف کر دیا عبدالمجید خاں کے انتقال کے بعد نئے صدر اعظم عالی پاشا نے جو نوجوان ترکوں کی آئینی تحریک کا مخالف تھا، شناسی کو تمام عہدوں سے برطرف کر دیا۔

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترکی میں جدید طرز کے اخبار کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۶۰ء میں ''ترجمان احوال'' جاری کیا، اب تک جو چند اخبارات ترکی میں نکلتے تھے وہ سرکاری تھے، ترجمان احوال پہلا غیر سرکاری اخبار تھا، یہ نہ صرف پہلا غیر سرکاری اخبار تھا بلکہ ادب کے جدید اسکول کی پہلی آواز بھی تھا، اس کی اشاعت سے عثمانی ادب اور عثمانی زبان کا ایک نیا دور شروع ہوا، شناسی کا تعلق ترجمان احوال سے صرف چھ مہینے رہا، اس کے بعد وہ اپنے رفیق کار آغا آفندی سے علاحدہ ہوگیا اور اپنا ایک ذاتی اخبار تصویر افکار نکالا، ترجمان احوال کی طرح اس اخبار میں بھی اس کا مقصد یہ تھا کہ ترکوں کی ذہنی زندگی کو جس قدر زیادہ ممکن ہو اہل یورپ کی ذہنی زندگی سے ہم آہنگ

کردے، اس نے سیاسی جھگڑوں سے الگ رہنے کی کوشش کی اور اپنی توجہ زیادہ تر سائنٹفک مسائل اور سوشل معاملات پر رکھی اور خاص طور پر زبان کی اصلاح وترقی اور اسے آسان بنانے کی سعی کرتا رہا(۱)، جدید ترکی کے خیالات کی تشکیل اور رائے عامہ کی تربیت میں تصویر افکار کا بڑا حصہ ہے، یہ اخبار سوائے عبدالحمید خاں ثانی کے عہد حکومت کے ۱۹۲۵ء تک برابر جاری رہا، تصویر افکار میں مشہور فرانسیسی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بھی شایع ہوتے تھے، شناسی نے ترکی صرف ونحو پر بھی ایک کتاب لکھی اور ایک ڈراما ''شاعر کی شادی'' کے عنوان سے تصنیف کیا جس میں شاعروں کا خاکہ اڑایا ہے مگر اس کی سب سے عظیم الشان تصنیف ترکی لغت ہے، جس میں اس نے ہر لفظ کا ماخذ اور ترکی ادب میں اس کا استعمال دکھایا ہے، وہ اس لغت کو ہزار ہزار صفحوں کی چودہ جلدوں میں لکھنا چاہتا تھا مگر عمر نے وفا نہ کی اور صرف بیس حرفوں تک لکھ سکا۔

ادب اور زبان کی اصلاح میں شناسی کی سرگرمیوں نے قدامت پرستوں کو اس کا مخالف بنادیا مگر وہ خلوص اور صداقت کے ساتھ آخر دم تک اپنے کام میں لگا رہا، چنانچہ یہ تحریک باوجود مخالفت کے روز بروز بڑھتی گئی اور ادب جدید کی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں۔

نامق کمال: شناسی کے بعد نئے ادب کی رہنمائی نامق کمال (۱۸۲۷ء تا ۱۸۸۸ء) کے ہاتھ میں آئی، وہ ایک زبردست آرٹسٹ، ایک سرگرم مجاہد، ایک کثیر التصانیف اہل قلم اور ایک پر جوش محب وطن تھا، اس کے نزدیک آرٹ ملک میں نشاۃ ثانیہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ تھا اور اس نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنے ڈراموں اور ناولوں، اپنی شاعری، اپنی تاریخی تصنیفوں اور تنقیدی مقالوں یہاں تک کہ اپنے خانگی خطبوں سے بھی کام لیا(۲)، وہ ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا تھا اور اوائل عمر میں اس نے سلطنت عثمانیہ

---

(۱) 'جدید ترکی کی ترقی اس کے پریس کے پیمانہ سے' از احمد امین پی ایچ ڈی مطبوعہ نیورک ۱۹۱۴ء ص ۳۴-۳۵ (The Devolopment of modern Turkey as measured by its press by ahmad amin Ph.D.)

(۲) مقالہ کوپرولوزاور محمد فوادہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۴ ص ۹۵۶

کے تمام ممالک کی سیاحت کی تھی، رعایا کی غربت وفلاکت اور حکام کی ناانصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس نے دیکھے ان کا اثر اس کے دل پر بہت گہرا پڑا اور اس نے اہل وطن کی خدمت اور ان کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے کا عزمِ راسخ کرلیا، اس کی تمام سرگرمیوں کا مرکز وطن ہے، جیسا کہ ڈاکٹر احمد محی الدین نے لکھا ہے: ''عثمانی وطن کا تصور اسی سب سے بڑے ترک محبّ وطن کی تخلیق ہے۔'' اسی کی خدمت کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کردی تھی، اس کا اعتقاد تھا کہ ''سچی حکومت قوم کی خدمت کا نام ہے۔'' فنونِ لطیفہ، زبان وادب، سب اسی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، وہ لکھتا ہے: ''اگر میں اپنی قوم کی اس بہار کو دیکھے بغیر مرجاؤں جس کی امید میں جیتا ہوں تو میرے لوحِ مزار پر یہ لکھ دینا:

''وطن سوگ میں ہے اور میں بھی سوگ میں ہوں''(۱)

وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہوگیا تھا اور دستوری حکومت کا حامی تھا، جب حکومت کی طرف سے سختی شروع ہوئی تو اسے بھی دوسرے مشہور وطن پرستوں کی طرح بھاگنا پڑا، چنانچہ وہ لندن پہنچا اور وہاں ضیا پاشا کی شرکت میں اخبار ''حریت'' نکالتا رہا، چار سال کے بعد جب عام معافی کا اعلان ہوا تو وہ ترکی واپس آگیا اور بدستور سابق وطن کی خدمت میں مشغول ہوگیا، لندن سے واپسی کے بعد اس نے اپنا ایک ذاتی اخبار ''عبرت'' نکالنا شروع کیا، جس کا اثر قومی تحریک کے پھیلانے میں خاص طور پر پڑا۔

''عبرت'' کی تقلید میں چند اخبارات اور بھی جاری ہوئے مگر ان میں سے بہت کم زیادہ دنوں تک چل سکے، پھر بھی حوصلہ مند نوجوان اخبار نکالنے سے باز نہ آئے، اخبارات کا معیار بلند تھا کیونکہ تعلیم یافتہ طبقہ کے بہترین افراد صحافت کا کام کرتے تھے اور یہ پیشہ حب الوطنی میں داخل تھا، لیکن حکومت کی طرف سے پریس پر پابندیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں، اخبارات کا معطل کیا جانا روز کی بات ہوگئی تھی، چنانچہ ''عبرت'' بھی کئی

(۱) ترکی میں جدید تمدنی تحریک از ڈاکٹر احمد محی الدین پروفیسر زبان ترکی لائپزک یونی ورسٹی بحوالہ رسالہ جامعہ بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء

بار بند کر دیا گیا تھا، اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اخبار نویس بغیر اس کے کہ ان پر با قاعدہ مقدمہ قایم کیا جائے یا انھیں جواب دہی کا موقع دیا جائے، جلاوطن کر دئے جاتے تھے، کبھی انعام واکرام اور عہدوں کے ذریعہ سے انھیں قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی تھی مثلاً نامق کمال کو گیلی پولی کا گورنر مقرر کر کے بھیج دیا گیا تھا مگر چند ہی مہینوں کے بعد وہ استعفادے کر قسطنطنیہ واپس آ گیا اور پھر اپنا اخبار جاری کیا لیکن ۱۸۷۵ء میں جب اس کا ڈرامہ ''وطن'' اسٹیج پر لایا گیا اور اس سے عوام میں بے حد جوش پیدا ہوا تو نامق کمال کو قبرص (سائپرس) لے جا کر قید کر دیا گیا، کمال کے علاوہ اور تمام مشہور اہل قلم بھی جو عوام میں مقبول تھے قبرص بھیج دئے گئے، سلطان عبدالعزیز خاں کے معزول ہونے پر جب سلطان مراد کے مختصر عہد حکومت میں نوجوان ترکوں کو اختیار حاصل ہوا تو جلاوطن اخبار نویس سب واپس بلا لیے گئے اور ترکی پریس میں ایک نئی سرگرمی شروع ہوئی۔

وطن کی طرح نامق کمال کو اپنے مذہب اور تمدن سے بھی بے حد محبت تھی، وہ سلطنت عثمانیہ کو پھر ایک عظیم الشان اسلامی طاقت دیکھنا چاہتا تھا، اسلام ہی کا نام لے کر وہ اس ذہنیت کے خلاف جہاد کرتا تھا، جس نے ترکی قوم میں دنیا سے بیزاری اور دنیا سے نفرت کا زہر پھیلا کر اس کے قوائے عمل کو مفلوج کر دیا تھا، اس نے اپنی قوم کو کارزار حیات میں عمل اور جدوجہد کی دعوت دی اور اپنے زور قلم اور جوش کلام سے اس میں ایک نئی روح پھونک دی، وہ مغرب کے علوم وفنون سے بیگانہ نہ تھا، لیکن خود اس کی قوم نے علم وحکمت کے جو خزانے صدیوں میں جمع کیے تھے ان کی قدر وقیمت کو خوب سمجھتا تھا اور ان پر فخر کرتا تھا، اس کے تمام خیالات اسلامی اصولوں اور عثمانی روایتوں سے ماخوذ ہیں، نامق کمال کی تصنیفوں کے دو بنیادی اصول ''حب وطن'' اور ''حقوقِ انسانی'' کے نظریے ہیں، خالدہ خانم اپنے خطبات میں لکھتی ہیں:

> ''حب وطن اس معنی میں جو آج کل سمجھے جاتے ہیں، اس کا
> خاص موضوع ہے، اس نے جابجا اپنے ملک کے حالِ زار کا دلدوز مرقع

دکھایا ہے، خصوصاً ایک نثر کی کتاب میں جس کا نام ''خواب'' ہے اور ایک نظم میں جس کا عنوان ''واویلا'' ہے، اس نے ان خیالات کے اظہار میں انتہائی جوش وخروش سے کام لیا ہے، خواب میں اسے مادر وطن کی تصویر یہ نظر آئی کہ ایک عظیم الشان ہستی زخموں سے چور کفن میں لپٹی ہوئی چلی جارہی ہے، وہ درد سے بیتاب ہے مگر اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے، ''واویلا'' میں وہ اپنے مادر وطن سے التجا کرتا ہے کہ اپنے سفید کفن پر سیاہ چادر ڈال لے، ایک ہاتھ کربلا کی طرف اور دوسرا روضۂ رسول ﷺ کی طرف پھیلا کر کھڑی ہوجائے اور بارگاہِ الٰہی میں ان لڑائیوں کی فریاد کرے جو ترکی زمین پر لڑی گئیں اور جن میں سے ایک ایک لڑائی بدر وحنین کے معرکے سے کم نہ تھی، اس نے دکھایا ہے کہ سلطنت کی تاریخ میں ترکوں کا خون کس کس طرح بہایا گیا اور کن کن شہیدوں نے اپنے وطن کی زمین کو اپنے خون سے سینچا۔''(۱)

حقوقِ انسانی کے نظریہ کی حمایت بھی نامق کمال اسی جوش سے کرتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ جو حکومت محکوموں کی رضامندی پر قایم نہ ہو استبدادی حکومت ہے، جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہر شخص کا فرض ہے، حقوقِ انسانی کی حفاظت کے لیے وہ جنگ اور ہر قسم کی قربانی کرنے کی تبلیغ کرتا ہے، اس نے اپنے عمل سے اپنے عقیدہ کی سچائی کا ثبوت دیا، اس کی ساری زندگی وطن اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کی سعی میں گذری اور اس راہ میں اس نے بارہا جلاوطنی اور قید کی صعوبتیں اٹھائیں، چنانچہ اس کا انتقال بھی جلاوطنی کی حالت میں ایک جزیرے میں ہوا، اگر وہ چاہتا تو آسانی سے وزیر اعظم ہوسکتا تھا مگر وہ آخر دم تک اپنے عقیدہ پر قایم رہا اور سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدہ کی ترغیب بھی اسے اپنے اصول سے منحرف نہ کرسکی، حقوقِ انسانی کے خیال کو اس نے ایک نظم میں

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۱۷۷

جو "قصیدۂ حریت" کے نام سے مشہور ہے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ خالدہ خانم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"یہ دیکھ کر کہ زمانہ کی روش حق اور ایمان سے منحرف ہوگئی ہے ہم نے عزت اور عظمت کے ساتھ منصب حکومت سے ہاتھ اٹھالیا، وہ انسان جو انسانیت کے لقب کا مستحق ہے کبھی خلق خدا کی خدمت سے نہیں تھکتا، وہ ہمیشہ ستم کشوں اور مظلوموں کی دست گیری کرتا ہے، ظالموں کا حامی وہی ہوتا ہے، جس کا دل ودماغ شقاوت سے معمور ہو، کتوں کو اسی میں مزہ آتا ہے کہ خونخوار شکاری کے آگے آگے دوڑیں، میرے لیے یہی کافی ہے کہ لوگ کہیں کہ یہ وہ شخص ہے جو اپنے مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانے کو وزیر کے منصب بلکہ وزیر اعظم کے مرتبہ سے زیادہ عزت اور مسرت کا باعث سمجھتا ہے۔

پھانسی کی رسی جو موت کا اژدہا ہے، اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے جس میں انسان کو غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑے، خواہ آزادی کا میدان جہنم کا طبقہ ہو، انسان اسے چھوڑنا گوارا نہ کرے گا، تقدیر کے پاس ظلم وجور کے جتنے ہتھیار ہیں وہ لے کر آجائے اور مجھ پر حملہ کرے، اگر میں خدمت کی راہ اور جنگ کے میدان سے ہٹ جاؤں تو مجھ سے بڑھ کر بزدل دنیا میں کوئی نہ ہوگا، آہ اے آزادی تجھ میں کیا جادو ہے کہ ہم نے سب زنجیروں کو توڑ پھینکا مگر تیری غلامی کا طوق خوشی سے گلے میں ڈال لیا۔"(۱)

عبدالحق حامد: وطن پرستی کے جذبہ کی ترجمانی نامق کمال کے بعد اس کے دوست اور شاگرد عبدالحق حامد نے کی، وہ ایک ممتاز شاعر اور ڈرامانویس تھا، خالدہ خانم فرماتی ہیں کہ

(۱) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۱۸۰-۱۷۹

"اس کی تصانیف نے ادب جدید کا معیار بہت بلند کر دیا اور ان کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہو جائے تو وہ یقیناً بین الاقوامی شہرت حاصل کر لیں۔"

حامد نے بھی نامق کمال کی طرح ظلم و ناانصافی کے خلاف شدت سے احتجاج کیا، باوجود اس کے کہ اس کی زندگی کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا اور وہ بمبئی، میڈرڈ اور لندن میں مدت تک ترکی سفیر کی حیثیت سے رہا، تاہم اپنی کتابوں میں اس نے "سلطان عبدالحمید خاں کے استبداد پر خوب خوب چوٹیں کی ہیں۔"(۱)

ضیا پاشا: وطنی تحریک کا ایک اور زبردست حامی ضیا پاشا تھا، اس پر فرانسیسی ادب کا بہت اثر تھا اور اس نے روسو اور مولیر کی کتابوں کا ترجمہ کر کے نیز اپنی ادبی اور سیاسی تنقیدوں سے اس تحریک کو بہت مدد پہنچائی، اس نے جلاوطنی کے کئی سال پیرس اور لندن میں گذارے تھے، لندن ہی سے اس نے اخبار "حریت" نکالا تھا، جس کی ادارت میں نامق کمال بھی شریک ہو گیا تھا، ضیا پاشا قدیم ادب کا ماہر تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس ادب کو ترکوں کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اس کا نظریہ یہ تھا کہ ادب کو عوام کی زبان اور خیالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔(۲)

ادبیات جدیدہ: سلطان عبدالحمید خاں کے عہد سے ترکی ادبیات کا ایک نیا دور شروع ہوا، سلطان نے تنظیمات کے ادب کو مٹا دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور بظاہر اسے کامیابی ہوئی، شناسی اور نامق کمال وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت بند ہو گئی اور جن الفاظ سے جذبۂ وطن پرستی کا اظہار ہوتا تھا وہ لغت سے خارج کر دیے گئے "دستور آزادی اور وطن" کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت صرف سرکاری اخباروں کو تھی، دوسروں کے لیے ان الفاظ کا زبان پر لانا بھی جرم تھا اور ممنوع الاشاعت کتابوں کا ایک صفحہ چوری سے پڑھنا بھی بغاوت میں داخل تھا، جس کی پاداش میں لوگ اکثر تمام عمر کے لیے

(۱) کشمکش ص ۱۸۱ (۲) مقالہ کوپرہ لوزادہ محمد فواد، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۹۵۶

جلاوطن کر دیے جاتے تھے۔(۱)

لیکن ان سختیوں کے باوجود بلکہ شاید انہی کی وجہ سے اس عہد میں ایک جدید ادبی حلقہ پیدا ہوا، جس نے اپنے زور قلم سے نہ صرف حمیدی استبداد کی بنیادیں ہلا دیں بلکہ مذہب اور ماضی کی روایات پر بھی یہ سمجھ کر کہ وہ استبداد کی حامی ہیں، شدید حملے کیے، اس حلقہ کی نمایاں خصوصیت اس کی مغرب پسندی تھی، یہ لوگ مغربی سائنس، مغربی عقلیت اور مغربی مادیت کے دلدادہ تھے، مذہب اور قدیم روایات ان کے نزدیک تہذیب وتمدن کی راہ میں حائل تھیں، اس لیے وہ ان دونوں کے مخالف تھے، انھوں نے ناول اور شاعری کے ذریعہ اپنے خیالات کی اشاعت کی، خالد ضیا اس حلقہ کا ناول نویس تھا، اس کے ناول مغرب کے جدید ناولوں کے طرز پر لکھے جاتے تھے، توفیق فکرت اس جماعت کا سب سے مشہور شاعر تھا، وہ غیر معمولی خصوصیات کا حامل تھا، خالدہ خانم لکھتی ہیں کہ "اس میں اولیاء اللہ کا سا زہد اور ضبط نفس پایا جاتا تھا" مگر باوجود اس کے اسے مذہب میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی، اس کا دماغ وسعت نظر اور تنگی ذہن کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے، اخلاق اور سیرت پر مذہب کے پاکیزہ اثرات اسے دکھائی نہیں دیتے، مغرب کے مادی تمدن کی چمک نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مذہب اور قدیم روایات ترقی کی راہ میں دو سب سے بڑے پتھر ہیں، اس نے ان خیالات کا اظہار اپنی مشہور نظم "تاریخ قدیم" میں کیا ہے، خالدہ خانم اس پر تبصرہ کرتی ہیں:

> "اس میں عموماً قدیم روایات اور خصوصاً مذہب پر جنھیں وہ ترقی میں حائل سمجھتا ہے بے پناہ حملہ کیا گیا ہے، اس کا اثر اچھا اور برا دونوں طرح کا پڑا، سب سے بڑی خرابی اس میں یہی ہے کہ مذہب کے ہر پہلو کی بلاتفریق مخالفت کی گئی ہے اور اسے نوعِ انسانی کے لیے ایک لعنت قرار دیا گیا ہے، توفیق فکرت کے لیے لوگ بغیر مذہب کے

---

(۱) کشمکش ص ۱۸۴

بھی پاکیزہ اور بلند سیرت کے مالک ہو سکتے تھے مگر ہر ملک اور ہر قوم میں لوگوں کی اخلاقی تعلیم کی حقیقی بنیاد مذہب ہی پر قایم ہے، اس میں جتنا حصہ ضعیف الاعتقادی اور جہالت کا ہے اس کو جتنا جی چاہے برا کہہ لیجیے مگر مجموعی حیثیت سے مذہب کی عزت اور احترام کرنا چاہے اور اسی پر نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہیے، اس کے اس طرح مذہب پر اندھادھند حملہ کرنے سے بداعتقادی پیدا ہوگئی، اس کے علاوہ لوگ اپنے ماضی سے قطعاً نفرت کرنے لگے۔

اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس نظم میں بڑے پاکیزہ اور پائدار خیالات ہیں، جو پرزور انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یہاں توفیق فکرت جنگ و جدل کا مخالف، بین الاقوامی اتحاد عمل کا علم بردار، عالمگیر برادری کا حامی اور عقل انسانی کی فضیلت اور خوبی کا دل سے معتقد نظر آتا ہے، نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ماضی کی روح مجسم ہو کر ظاہر ہوتی ہے، یہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچا ہے جس کے دانتوں سے خون ٹپک رہا ہے، اس کے آنے سے رات کی مدت بڑھ جاتی ہے اور صبح جس کی نوع انسانی منتظر ہے اور دور ہو جاتی ہے، تشدد کے خلاف اس سے زیادہ شدید حملہ شاید ہی کسی زبان کے ادب میں کیا گیا ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ صبح ہو جائے، ان لوگوں کو جنھوں نے پہاڑ سی اندھیری راتیں خواب غفلت میں گذاری ہیں، صبح کا مبارک جلوہ دیکھنا نصیب ہو، اے مہیب پیکر جو اندھیرے میں قدم اٹھائے چلا آ رہا ہے تو کون ہے؟ تیرے چہرے سے خونخواری ٹپک رہی ہے ...... تو ہی ہے جس نے میری قوم کو برباد کر دیا ہے۔

کیا کہا؟ شجاعت؟ جس کی بنا خونریزی اور وحشت پر ہے،

فتح؟ یعنی شہر کے شہر روندڈالنا فوجیں کی فوجیں کاٹ کر رکھ دینا، قتل و خون، گیرودار، تباہی، بربادی، پامالی، آتش زنی، غارت گری، رحم کا نام نہیں، آہوں اور آنسوؤں کا اثر نہیں، جہاں تیرا قدم پہنچا آفت آئی، مصیبت آئی، فصلیں برباد، گھاس اور کائی تک معدوم، خاندان تباہ ہو گئے، بستیاں اجڑ گئیں، ہر گھر قبر بنادیا گیا، ہر چھت معصوم بچوں کے سر پر گرادی گئی۔"(۱)

توفیق فکرت کا اسلوب بیان تمثیلی ہے، اس کی نظمیں جن میں ظلم و استبداد پر در پردہ چوٹیں ہوتی تھیں، ہفتہ وار اخبار ثروت فنون میں شایع ہوا کرتی تھیں جس کا مدیر خود توفیق فکرت تھا، یہ نظمیں نوجوان ترکوں میں بے حد مقبول ہوئیں، چنانچہ جب ۱۸۹۶ء میں ان کا مجموعہ "رباب شکستہ" کے عنوان سے شایع ہوا تو اس کے تمام نسخے ایک سال کے اندر فروخت ہو گئے، پروفیسر جرمانس لکھتے ہیں کہ "ترکی نظم کی کسی تصنیف کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جو اس مجموعہ کو ہوئی"(۲)، لیکن کتاب کی مقبولیت مصنف کے حق میں مضر ثابت ہوئی، توفیق فکرت گرفتار کرلیا گیا اور ثروت فنون بند کردیا گیا، رہائی کے بعد اسے امریکی مشن کے رابرٹ کالج میں پروفیسری کی جگہ مل گئی، جہاں وہ بظاہر قومی خدمت سے کنارہ کش ہو کر درس و تدریس میں اپنا وقت گذارنے لگا، "رباب شکستہ" کے بعد اس کی کوئی نظم شایع نہیں ہوئی، لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار سے باز نہ آیا اور اپنے خاص انداز میں متعدد پرجوش نظمیں لکھیں جو شایع تو نہیں ہو سکتی تھیں مگر لوگ ہاتھ سے لکھ کر ان کو زبانی یاد کر لیتے تھے، اس نے نوجوان ترک پارٹی کے لیے ایک "قومی گیت" لکھا، جو حق اور ملت پرستی کے جذبات سے لبریز ہے، اس کی دو بیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

"ہمارا راستہ حق اور ملت کا راستہ ہے...... مبارک ہے حق، مبارک ہے ہماری پیاری ملت، ظلم کے پاس توپیں ہیں، گولیاں ہیں، قلعے

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۸۹-۸۷ (۲) ترکوں کی اسلامی خدمات ص ۹۱

ہیں، حق کے پاس خم نہ کھانے والا بازو، ہار نہ ماننے والا ایمان ہے۔"(۱)

ادبیاتِ جدیدہ کا دوسرا نہایت ممتاز شاعر محمد عاکف ہے، وہ بھی فکرت کی طرح استبداد کا دشمن اور عدل و انصاف کا حامی ہے، لیکن مذہب اور ماضی کا مخالف نہیں، برخلاف اس کے وہ مذہب کو انسان کی اصلاح کے لیے ضروری خیال کرتا ہے اور ماضی کو کھودینے سے مستقبل کی تعمیر کو ناممکن سمجھتا ہے، اس کا دل اسلام کی محبت اور دنیاے اسلام کی زبوں حالی کے درد سے لبریز ہے، اپنی طویل نظم "مشرق" میں لکھتا ہے:

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی، آخر تم نے کیا دیکھا؟ میں کیا بتاؤں کیا دیکھا، میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل، بند نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں، میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ، بے حس دل، الٹی عقلیں دیکھیں، میں نے ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریا کاری، قابل نفرت برائیاں، طرح طرح کی بیماریاں، جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولہے، بنجر کھیت، میلی عورتیں، ننگے ہاتھ پاؤں دیکھے، میں نے بے جماعت کے امام دیکھے، بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا، دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں، راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔"(۲)

حیات وکائنات کا ایک نیا تصور: ترکی میں جو ادبی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی وہ حقیقتاً ایک تمدنی تحریک تھی، جس نے حیات وکائنات کا ایک نیا تصور پیش کیا، عثمانی ترکوں کا تصور کائناتِ اسلامی تھا مگر امتدادِ زمانہ سے اس کی اصلی ہیئت میں بہت کچھ فرق پیدا ہوگیا تھا، اسلام نے انسان کو جو منصب کائنات میں عطا کیا تھا، اس پر مستبد حکمرانوں نے قبضہ کرلیا تھا اور یہ قبضہ صدیوں تک قایم رہا، انسان کے لیے صبر و رضا

---

(۱) ترکوں کی اسلامی خدمات ص ۹۲ (۲) ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ص ۱۹۳

کے ساتھ اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ترکی میں بھی صورتِ حالات یہی تھی، لیکن جب داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر استبداد کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو جمہور کے دلوں میں اس منصب کے دوبارہ حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا جسے سلاطین نے اس سے چھین لیا تھا، قدیم نظام حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں، یورپ کے تمدنی تعلقات اور تعلیم جدید نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی تھی، جو ادب کے ذریعہ ظاہر ہوئی، لیکن گو نیا ادب فرانسیسی رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے، اس کے بنیادی اصول خاص اسلامی ہیں، انسان نے کائنات میں اپنی حیثیت کا پھر احساس کیا، قرآن کریم کے وہ مقامات پھر یاد آنے لگے جہاں انسان کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے، محمد عاکف اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ''انسان'' ہے، لکھتا ہے:

> ''انسان اپنی قدر نہیں پہچانتا، وہ تو فرشتوں تک سے بلند تر ہے، اس کے سینہ میں علم پنہاں ہے، اس کے قلب پر وجود باری اپنا پرتو ڈالتا ہے، جسمانی حیثیت سے دیکھو تو ایک ذرا سی چیز ہے، لیکن کارسازی الٰہی کا مقصود یہی ہے اور اسی لیے ابدی ہے اور بے قیود، قدرت اس کی خادمہ ہے، عالمِ اشیا اس کا باج گذار ہے، دنیا اس کی مرضی اور اس کے آئین کی فرماں بردار ہے، یہ کائنات کا تاج ہے۔'' (۱)

انسان کی اس بلند حیثیت کا احساس اس کی عقل کی قدر افزائی کا باعث ہوا، مغربی فلسفہ نے تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر ڈالا اور ترکی کی جدید ادبی تحریک میں عقلیت کی رو نمایاں طور پر نظر آنے لگی، عثمانی مفکرین نے شروع میں یہاں بھی اسلام ہی کا دامن پکڑا اور بتایا کہ اسلام میں عقل کا درجہ کس قدر بلند ہے مگر بعد میں وہ یورپ کی عقلیت کا شکار ہو گئے، ان کی عقل پرستی یہاں تک بڑھی کہ ان میں سے بعض خود مذہب کی مخالفت کرنے لگے، توفیق فکرت اسی جماعت کا نمایندہ ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر احمد محی الدین بحوالہ جامعہ ص ۱۱۰-۱۰۹

عثمانی ترک جب شروع شروع اسلام لائے تو ان میں وہی جوش اور جذبۂ عمل پایا جاتا تھا جو ایک نئی قوم میں ہوتا ہے، یہ جذبہ سلطنت کی ابتدائی صدیوں میں قایم رہا، لیکن رفتہ رفتہ تمدن کے تعیّشات میں گرفتار ہو کر ان کی سپاہیانہ سرگرمی سرد پڑتی گئی، دوسری طرف عجمی فلسفہ اور تصوف نے دنیا سے نفرت اور بیزاری کا سبق پڑھایا، میدانِ جنگ میں جب یورپ کے مقابلہ میں شکستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور سلطنت کے صوبے یکے بعد دیگرے نکلتے گئے تو یہ بیزاری اور بڑھی، اپنی کمزوریوں پر نظر کرنے کے بجائے انھوں نے سارا الزام تقدیر کے سر رکھا، استبدادی حکومت میں جمہور کی بے دست و پائی نے عقیدہ تقدیر کو مزید تقویت پہنچائی، کیونکہ ان کے حالات کا بننا بگڑنا حکمرانوں کے رحم و کرم پر موقوف تھا، جدید تمدنی تحریک نے اس غلط قسم کی تقدیر پرستی اور دنیا سے نفرت اور بیزاری کے عقیدہ کے خلاف شدت سے آواز بلند کی اور اثبات زندگی کا تصور نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا، اس تصور کے پیش کرنے میں نامق کمال سب سے آگے ہے، اس کی تمام تصنیفیں اثباتِ زندگی کے جذبہ اور ولولہ سے پر ہیں، اس نے اپنی قوم کو اسلام کے نام پر عمل کی دعوت دی، اس نے بتایا کہ اسلام ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا اور کائنات کی تسخیر جو انسان کو دیگر مخلوقات پر فضیلت بخشتی ہے، بغیر عمل اور جدوجہد کے ممکن نہیں لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کا الٰہی قانون اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر احمد محی الدین لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلہ میں بھی ترکی شاعری نے اپنے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس نے تقدیر پرستی اور غلط معنوں میں خدا پر بھروسہ کرنے کی مخالفت کو اپنا سب سے پہلا مقصد قرار دیا اور دوسرا مقصد مایوسی اور کاہلی کے خلاف جہاد، یہاں بھی ہمیں سرلشکر وہی نامق کمال دکھائی دیتا ہے، وہ مضبوط ارادوں والا عملی آدمی جس نے اپنے خیالات کی تمام قوت اس کاہلی اور خدا پر اس غلط بھروسہ

کے خلاف صرف کردی اور محنت وعمل کے پیغام کی تبلیغ کی، حامد، فکرت، امین اور عہد جدید کے تقریباً سب شعرا نے اس کی پیروی کی، لیکن اس ضمن میں شاعری کا سب سے عظیم الشان کارنامہ عاکف کا ہے...... وہ سرتاپا مسلمان ہے، اس کا ایمان نہایت مضبوط اور پختہ ہے اور اس کے عقیدہ میں ایک عجیب سادگی اور صفائی ہے، لیکن اس پر بھی اسلامی دنیا کے مصائب اور ترکوں کے تکلیف دہ حالات کا اثر ہے اور باوجود اپنے عقیدہ کے یہ محسوس کرتا ہے کہ خود اسے اور اس کی اسلامی دنیا کو خدا نے چھوڑ دیا ہے اس تکلیف دہ خیال سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا علاج یہ اس علم میں ڈھونڈھتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تیسرے باب کی پہلی نظم میں محنت وسعی کا نیا قانون پیش کرتا ہے، نظم کے شروع میں تو تسلیم اور رضائے الٰہی پر قناعت کے جذبات کا اظہار ہے، لیکن آگے چل کر یہ اسلامی اور ترکی دنیا کے تکلیف دہ حالات کا ذکر کرتا ہے اور خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ تیری مدد کہاں ہے، اس پر اس کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں جنھیں سن کر یہ خاموش ہو جاتا ہے: ''اے نادان! خاموش، دنیا کی گردش کبھی نہیں رکتی، تو کیا سمجھتا ہے، کیا قوانین عالم شکوہ اور شکایت سے معطل ہو سکتے ہیں؟ مدد چاہتا ہے تو اپنے آپ سے مدد کر، جا اور خود اپنی کوشش سے ظلم اور ناانصافی کو دور کر اور دیکھ دنیا کس قدر عزت کے ساتھ اس قانون سعی کی اطاعت کرتی ہے۔''(۱)

پریس کی سرگرمی: ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد جب دستوری حکومت قایم ہوئی اور پریس کا احتساب منسوخ کر دیا گیا تو عثمانی ادب وصحافت میں لامحدود جوش پیدا ہوا، دفعۃً سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آ گئیں، تمام ممنوع الاشاعت کتابوں کے تازہ اڈیشن فوراً تیار

(۱) ص ۱۷-۱۸

کیے جانے لگے، کمال اور حامد کے ڈرامے پھر اسٹیج پر آئے اور مغرب کی بہت سی عمرانی، فلسفیانہ اور تاریخی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے گئے، اخباروں اور رسالوں کی تعداد میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا، چند ہفتوں کے اندر ترکی روزانہ اخباروں کی تعداد تین سے پندرہ تک پہنچ گئی، بعض پر جوش اشخاص نے بغیر اس خیال کے کہ ملک میں مانگ ہے بھی یا نہیں، محض یورپ کی تقلید میں ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالے جاری کر دئے، چنانچہ ''اشتراک'' کے نام سے بھی ایک اشتراکی ہفتہ وار اخبار جاری کیا گیا، حالانکہ ترکوں کو اشتراکی خیالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ اس وقت ترکی میں اس اخبار کی مانگ تھی، ہر جماعت اپنا خاص اخبار نکالنا چاہتی تھی، تقریباً ایک ہی وقت میں معماروں کیمیا سازوں، مویشی کے ڈاکٹروں، طبیبوں، وکیلوں ایکٹروں، کاریگروں، سرکاری عہدہ داروں، سابق سیاسی جلاوطنوں، سول سروس اسکول اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی جماعتوں سے علاحدہ علاحدہ ہفتہ وار یا ماہوار رسالے جاری ہوگئے (۱)، ان میں سے اکثر جلد ہی بند بھی ہوگئے''، کچھ تو اخبار نکالنے والوں کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اخبارات نے اپنے لب ولہجہ میں ایسی شدت اور بے باکی اختیار کر لی تھی کہ دستوری حکومت کو بھی ان کی روک تھام کے لیے از سر نو پابندیاں عاید کرنا پڑیں۔

رسم الخط کا مسئلہ: نوجوان ترکوں نے اپنے مختصر عہد حکومت مین تعلیم کی اصلاح وترقی میں جو سرگرمی دکھائی اس کا ذکر ہو چکا ہے، اس دور میں ''ادبیات جدیدہ'' کے حلقہ کا رجحان یہ تھا کہ ترکی کو بالکل مغربی تمدن کے رنگ میں رنگ دیا جائے، چنانچہ عربی فارسی اور علوم مشرقیہ کی بجائے مغربی زبانوں اور مغربی علوم وفنون کی تحصیل پر زور دیا جانے لگا، اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے فرانسیسی تہذیب اختیار کر لی، یورپ سے تمدنی تعلقات تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے، اسی سلسلہ میں حسین عابد نے جو توفیق فکرت کے حلقہ کا اخبار نویس اور انشا پرداز تھا لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریک شروع کی اور اس مسئلہ پر اخباروں میں

(۱) جدید ترکی از میرز (Mears) ص ۴۵۹

بحث ہونے لگی، اس تجویز کی مخالفت عوام کے علاوہ بعض اہم تعلیم یافتہ جماعتوں نے بھی کی، اتحاد اسلامی کے حامی اس بنا پر مخالف تھے کہ اس سے ترکوں کا تعلق دنیائے اسلام سے منقطع ہو جائے گا، اتحاد تورانی کے حامی یہ کہتے تھے کہ ایسا کرنے سے دوسرے ملکوں کے ترکوں سے بھی جو ترکی زبان بولتے ہیں اور عربی حروف میں لکھتے ہیں اور جن کا تمدن کم وبیش ہمارا ہی جیسا ہے تمدنی اتحاد باقی نہ رہ سکے گا، قوم پرور جماعت کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ قدیم عثمانی علوم وفنون کا کل سرمایہ عربی اور فارسی زبان میں ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا، وہ عربی رسم الخط میں بعض تبدیلیوں اور اصلاحات کو مناسب سمجھتے تھے مگر اسے بالکل چھوڑ کر لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے سخت مخالف تھے۔

تحریک اتحاد عثمانی: نوجوان ترکوں کی سرگرمیوں کے تین خاص رخ تھے: اتحاد عثمانی، اتحاد اسلامی اور اتحاد تورانی، انیسویں صدی میں قومیت کا جو سیلاب یورپ سے چلا تھا وہ نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا سلطنت عثمانیہ کے حدود میں بھی داخل ہو گیا تھا اور مختلف عیسائی قوموں نے حکومت خود اختیاری کے مطالبات شروع کر دئے تھے، مغربی سلطنتیں ان کی حمایت کے لیے کھڑی ہو گئیں، سب سے پہلے یونان نے بغاوت کا اعلان کیا، اس کے بعد دوسرے عیسائی صوبے دول عظمیٰ کی مدد سے یکے بعد دیگرے آزاد ہوتے گئے، یہ صورتِ حال بہت کچھ نظام حکومت کی ابتری کا نتیجہ تھی، چنانچہ نوجوان ترکوں نے مدحت پاشا کی سرکردگی میں اسی کی اصلاح کی کوشش شروع کی اور سلطان کے استبداد اور مطلقیت کو دور کر کے جو در اصل تمام خرابیوں کی جڑ تھی دستوری حکومت قایم کرنی چاہی، قومیت کی تحریک سے وہ بھی متاثر تھے مگر انھوں نے اپنا نصب العین عثمانی قومیت کو بنایا یعنی وہ سلطنت عثمانیہ کے تمام باشندوں کو خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس قومیت کے رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتے تھے اور پیش نظر دستوری حکومت میں سب کو مساوی حقوق دینا چاہتے تھے، تیس چالیس سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے بالآخر استبداد کو ختم کر کے ملک میں دستوری حکومت قایم کر دی

اور سلطنت کے تمام باشندوں نے بے انتہا جوش مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اس انقلاب میں ترکوں کے علاوہ سلطنت کی تمام دوسری قوموں نے بھی حصہ لیا تھا اور اس کی کامیابی ان سب کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھی، نوجوان ترک سمجھتے تھے کہ عثمانی قومیت کا یہ مضبوط حصار سلطنت کی بقا اور سالمیت کا ضامن ہوگا مگر چند ہی دنوں کے بعد جو سیاسی واقعات رونما ہوئے ان سے صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ خیال خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، جنگ بلقان کی ضرب نے انھیں اس خواب سے ہمیشہ کے لیے بیدار کر دیا۔

تحریک اتحاد اسلامی: لیکن اس جنگ سے اتحاد اسلامی کی تحریک کو مدد پہنچی اور ترکوں کے ساتھ جو چھ سو برس سے یورپ میں اسلام کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھے اور اسے بجھانے کے لیے مسیحی طاقتیں اب آخری کوشش کر رہی تھیں، تمام دنیا کے مسلمانوں کو ہمدردی ہوگئی، بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں نے ان مجاہدین ملت کی بڑی مدد کی اور نقد کے علاوہ ضروریات زندگی کی دیگر اشیا بکثرت روانہ کیں، وہ خود ترکی فوج میں شریک تو نہ ہوسکے مگر ان کے طبی مشن نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیامت میں ترکی جا کر غازیوں کی خدمت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

اتحاد اسلامی کی تحریک حقیقتاً انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوئی تھی، اس کے بانی سید جمال الدین افغانی تھے، وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی تسلط اور غلبہ کو پوری طرح محسوس کیا اور دنیائے اسلام کو اس خطرہ سے آگاہ کر کے دفاع و تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اسٹاڈرڈ (Stoddard) نے اپنی مشہور و معروف کتاب ''جدید دنیائے اسلام'' میں سید موصوف کے جو خیالات نقل کیے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

عیسائی دنیا نسل و قومیت کے اندرونی اختلافات کے باوجود مشرق اور خصوصاً اسلام کے مقابلہ میں متحد ہے اور تمام اسلامی حکومتوں کو برباد کر دینا چاہتی ہے، صلیبی لڑائیاں اب بھی جاری ہیں اور پیٹر راہب (Peter the Hermit) کی روح آج بھی

کارفرما ہے، عیسائی دنیا اب بھی اسلام کے متعلق متعصّبانہ نفرت اورحقارت کے جذبات اپنے دل میں رکھتی ہے، اس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، مثلاً بین الاقوامی قوانین میں مسلمان قومیں عیسائی قوموں کے برابر نہیں سمجھی جاتیں اور نہ ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا، اسلامی حکومتوں پر جو حملے کیے جاتے ہیں اوران کی جو ذلتیں ہوتی ہیں ان کا عذر عیسائی حکومتیں یہ پیش کردیتی ہیں کہ اسلامی حکومتیں ابھی پستی اور جہالت کی حالت میں ہیں لیکن یہی عیسائی حکومتیں اسلامی ممالک کی ہر اصلاحی کوشش کو ہزاروں طریقوں سے روکتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے لیے جنگ بھی چھیڑ دیتی ہیں، اسلام سے نفرت کا جذبہ تمام عیسائی قوموں میں موجود ہے اوراس جذبہ کا اثر یہ ہے کہ اسلام کی تباہی کے لیے سب کوشاں ہیں، عیسائی دنیا مسلمانوں کے ہر جذبہ اور حوصلہ کا مضحکہ اڑاتی ہے اور انھیں بہتان وافترا کا نشانہ بناتی ہے، اہل یورپ جس چیز کو اپنے ہاں قوم پروری اور وطن دوستی سے تعبیر کرتے ہیں، اسی کو مشرق میں تعصب کا نام دیتے ہیں اور جسے مغرب میں خودداری، آن بان اور قومی عزت کہتے ہیں اسے مشرق میں جنگ جویانہ وطن پرستی سے موسوم کرتے ہیں، یہ تمام باتیں اسلامی دنیا کے لیے ایک زبردست مدافعانہ اتحاد کی ضرورت کو واضح کرتی ہیں اور اگر اپنے کو تباہی سے بچانا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ مغربی ترقی کے طریقہ کار سیکھے اور یورپ کے طریقِ کار کے اسرار معلوم کیے جائیں۔(۱)

سید جمال الدین کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر متحد ہو جائیں ان کو اس سے زیادہ بحث نہ تھی کہ یہ مرکز ترکی میں ہو یا اسلامی دنیا کے کسی اور حصہ میں، لیکن چونکہ ترکی ہی سب سے بڑی اسلامی سلطنت تھی اور مرکز خلافت بھی صدیوں سے وہیں تھا اسی لیے اسی کو تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز بنانا مناسب معلوم ہوا، دولِ یورپ کے حملوں سے سلطنت کے بقیہ حصوں کو محفوظ رکھنے کے لیے سلطان عبدالحمید خاں

(۱) 'جدید دنیائے اسلام' از اسٹاڈرڈ، مطبوعہ لندن ۱۹۲۲ء، ص ۵۳-۵۴ (The new world of Islam by L.Stoddard Ph.D.)

نے بھی اس تحریک کو خاص اہمیت دی اور دوسرے اسلامی ممالک میں اسے پھیلانے کی غرض سے سید جمال الدین کو اپنا حامی بنانا چاہا، چنانچہ ان کے پیہم اصرار پر سید موصوف ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ آئے اور سلطان نے اس تحریک کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں دے دیا، قاضی عبدالغفار صاحب اپنی گراں قدر تالیف ''آثار جمال الدین افغانی'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ خوب جانتے تھے کہ عبدالحمید نے خلافت کی تحریک کو اپنی بساط کا ایک مہرہ بنایا ہے اور وہ عبدالحمید کے خیالات اور ارادوں سے ناآشنا نہ تھے، لیکن جس طرح عبدالحمید ان کی ذات سے اپنے مقاصد پورے کرانا چاہتے تھے، اسی طرح شیخ عبدالحمید کے نام اور وقار سے تحریکِ اتحاد اسلام کو تقویت پہنچانے کی فکر میں تھے۔''(۱)

بہر حال اتحاد اسلامی کے سفرا قسطنطنیہ سے روس، وسط ایشیا، افغانستان، ہندوستان، جاوا، چین اور افریقہ روانہ کیے گئے، دول عظمیٰ میں جو سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست کا تجربہ رکھتی تھیں، خصوصاً برطانیہ، روس اور فرانس میں جن کے فیوض و برکات سے کروروں مسلمان مستفید ہو رہے تھے، اس تحریک نے خاصی بے چینی پیدا کر دی، لیکن چند ہی سالوں کے بعد سید جمال الدین کا جو اس تحریک کے روح رواں تھے انتقال ہو گیا اور محض سلطان کا اقتدار اتحاد اسلامی کے لیے ایک جسم بے جان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

دستوری حکومت کے قایم ہونے کے بعد انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان نے ۱۹۱۱ء میں ایک کانگریس سالونیکا میں منعقد کی اور اس میں طے کیا گیا کہ تمام ممالک اسلامیہ کے مندوبین ہر سال قسطنطنیہ میں مجتمع ہو کر ان مسائل پر بحث کریں جن کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، اتحاد اسلامی کے سفرا پھر ان سب ملکوں میں بھیجے گئے جہاں کے مسلمان یوروپین حکومتوں کے ماتحت تھے، نیز ان ملکوں میں جہاں مسلمان مغربی تسلط

---

(۱) آثار جمال الدین افغانی مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۲۷۶

سے ابھی آزاد تھے، سنی اور شیعہ کے اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش کی گئی، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں متعدد عثمانی اور ایرانی علما نجف میں جمع ہوئے اور اپنے دستخط سے اس مضمون کا ایک بیان شایع کیا کہ دونوں فرقوں میں کوئی اختلاف نہیں اور دونوں سلطنتوں کے باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل پر زور دیا، اس کے بعد ہی ستمبر ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوگئی، ترکی جو خلافت اور تحریک اتحاد اسلامی کا مرکز تھی اب تمام دنیاے اسلام کی ہمدردی کا مرکز بن گئی، پورا اسلامی پریس اتحاد اسلامی کی ضرورت اور اہمیت کے اعلان میں متفق اللفظ تھا۔

لیکن جس طرح جنگ بلقان سے اتحاد اسلامی خواب پریشان ہوگیا، اسی طرح جنگ عظیم نے اتحاد اسلامی کے تخیل کو درہم برہم کر ڈالا، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار کس قدر اطمینان قلب کے ساتھ لکھتا ہے:

> "۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے اتحاد اسلامی کی کمزوری ظاہر ہوگئی اور قوم پروری کے جذبہ کے زیادہ قوی اثر نے اتحاد اسلامی کے تخیل کو پس پشت ڈال دیا، دول یورپ جن کے مقابلہ میں یہ تحریک جاری کی گئی تھی یعنی انگلستان، فرانس، روس اور بعد میں اطالیہ، ان کو دورانِ جنگ میں اپنی مسلمان رعایا کی طرف سے وفاداری اور محبت کے بڑے بڑے ثبوت ملے۔"(۱)

لیکن جس خنجر نے اتحاد اسلامی کی تحریک کا خاتمہ کیا وہ پیر حرم کا خنجر تھا، عربوں کی بغاوت برطانوی سیاست کا وہ شاہکار ہے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے ترک کیوں کر شکایت کر سکتے تھے، ان کی "وفاداری" اور "محبت" کا تقاضا ہی یہ تھا کہ آقا کی خوشنودی کے لیے ایمان کو بھی قربان کر دیں اور جن بھائیوں کی خدمت کرنا دو سال قبل دین و دنیا کی سعادت خیال کرتے تھے، انھی کے

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، چودھواں ایڈیشن ج ۱۷ ص ۱۸۵

سینوں کو انگریزی گولیوں سے چھلنی کر دیں۔

ترکی میں 'اتحاد اسلامی'' کی تحریک سیاسی حیثیت کے علاوہ تمدنی حیثیت بھی رکھتی تھی، اس کا نصب العین یہ تھا کہ ابتدائی عہد اسلام کی خالص اسلامی زندگی اختیار کی جائے اور مغربی تہذیب و معاشرت سے اجتناب کیا جائے، اس تحریک کا سب سے بڑا حامی محمد عاکف شاعر تھا، اس حلقہ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''سبیل الرشاد'' نکلتا تھا جس میں ان خیالات کی اشاعت کی جاتی تھی، انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان کے حلقہ والوں کو ان کی قدامت پرستی کی وجہ سے شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے، انھوں نے اس رسالہ کے جواب میں حکومت کی طرف سے ''اسلامک ریویو'' نکالا جس کا مدیر انجمن کا ممتاز رکن اور ترکی کا مشہور فاضل قوق الپ ضیا تھا، ''اسلامک ریویو'' کے مقصد سے متعلق خالدہ خانم لکھتی ہیں:

> ''یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے ایک حد تک یہ کوشش کی گئی کہ اسلام کی موجودہ حالت میں اصلاح ہو، خصوصاً مذہب کو علم اور معاشرت سے جو تعلق ہے اس کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے، اس میں قرآن کا ترکی ترجمہ بھی شایع ہوا کرتا تھا، خود قوق الپ ضیا اسے نہایت ضروری سمجھتا تھا کہ اسلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور اس کی حقیقی روح کو پیش نظر رکھ کر مکمل اصلاح و تجدید عمل میں لائی جائے۔''(۱)

اسلام پر ''تنقیدی نظر'' ڈالنے اور اس کی ''حقیقی روح کو پیش نظر رکھ کر مکمل اصلاح و تجدید'' عمل میں لانے کا اگر یہی نتیجہ ہے جو ترکی جمہوریہ میں دیکھا جا رہا ہے تو شاید ''تنقیدی نظر''، ''حقیقی روح'' اور ''مکمل اصلاح'' ہر ایک کا مفہوم بدل دینا پڑے گا۔

تحریک اتحاد تورانی: اتحاد تورانی کی تحریک ترکی میں دستوری انقلاب کے بعد قوق الپ ضیا کی سرکردگی میں تمدنی حیثیت سے شروع ہوئی، چنانچہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۸ء کو

---

(۱) کشمکش ص ۹۶-۱۹۵

انجمن ''تورک دریئہ'' قایم کی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی قوموں کے ماضی اور حال کا مطالعہ کیا جائے اور ترکی زبان کو آسان اور ایک علمی زبان بنایا جائے (۱)، جہاں تک زبان کا تعلق تھا اس کے علمبرداروں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا اور غیر زبانوں کے تمام الفاظ خارج کیے جانے لگے، الپ ضیا نے جو ایک نہایت ممتاز شاعر بھی تھا، اپنی نظموں میں قدیم ترکی الفاظ جو عہد عثمانی سے پہلے وسط ایشیا کے ترکی قبیلوں میں بولے جاتے تھے اور جن کو اس کے ہم عصر ترک بالکل نہیں سمجھتے تھے، کثرت سے بھر دیے، اس سے زبان بجائے آسان ہونے کے حد درجہ مشکل ہوگئی، لیکن آخر الپ ضیا اور اس کے پیروؤں کو یہ روش ترک کر دینی پڑی اور رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہوگیا۔

اتحاد تورانی کی تحریک حقیقتاً ایک نہایت وسیع تحریک تھی، یہ صرف چند ترک محبانِ وطن تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے علمبرداروں میں دوسرے ملکوں کے ترک و تاتار بھی شامل تھے، اس کا سب سے بڑا لیڈر احمد بے آغا ئف تھا، جو والگا کا تاتاری اور ایک نہایت قابل اخبار نویس تھا، اس کا اخبار ''تورک یوردو'' ترکی تاتاری دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچتا تھا اور رائے عامہ کی تشکیل میں بڑا اثر رکھتا تھا (۲)، اسٹارڈ لکھتا ہے کہ احمد بے آغا ئف جیسے لیڈروں کے پیش نظر پوری تورانی دنیا تھی جو فن لینڈ سے منچوریا تک پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن ابتداءً ان کی عملی کوششیں ترکی تاتاری ٹکڑے تک محدود تھیں یعنی ترکی کے عثمانی، روس کے تاتار اور وسط ایشیا اور ایران کے ترکمان، چونکہ یہ تمام قومیں مسلمان تھیں اس لیے اس تحریک میں نسلی اور مذہبی دونوں رنگ شامل ہوگئے تھے، انجمن اتحاد و ترقی کے اکثر لیڈر جو تحریک اتحاد اسلامی کے علمبردار تھے ''اتحاد تورانی'' کے بھی حامی تھے، وہ دونوں تحریکوں کو ساتھ چلانا چاہتے تھے۔

جنگ بلقان کے بعد اس تحریک کی نسلی حیثیت زیادہ نمایاں ہوئی، نہ صرف یہ کہ ترکوں نے بلقان سے نکل کر اب اپنے قدیم وطن کی طرف نظر ڈالنی شروع کی بلکہ جیسا

(۱) کوپرلوزادہ محمد فواد، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۹۵۷ (۲) جدید دنیائے اسلام ص ۱۶۵

کہ اسٹارڈ نے لکھا ہے اہل ہنگری اور اہل بلغاریا کے دلوں میں فاتح سرویوں کے خلاف نفرت کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ ان دونوں قوموں نے اپنے تورانی الاصل ہونے کا اعلان کردیا اور سرویا اور روس کے سلانی اتحاد کے مقابلہ میں یہ تورانی اتحاد کے تخیل سے دل بہلانے لگے تھے۔(۱)

قوق الپ ضیا نے ترکوں کے ملک وملت کی یہ تعریف کی تھی ''ہمارا وطن نہ ترکی ہے نہ ترکستان وہ ایک فضائے روحانی ہے یعنی توران''(۲)، تورانی تہذیب کا یہ دلفریب تخیل یورپ کے دو مستشرقوں ویمبری (Yambery) اور کاہون (Cahun) کا پیدا کیا ہوا تھا، نامق کمال اور عبدالحق حامد اپنی شدید قوم پروری کے باوجود ''دارالاسلام'' یعنی اسلامی ترکی ہی کو اپنا وطن سمجھتے رہے، لیکن ''اتحاد تورانی'' کے حلقہ والوں نے اپنی قبل اسلام کی تاریخ پر فخر کرنا شروع کیا، وہ عثمانی عہد کی تہذیب کے سخت مخالف تھے اور اپنے رسالوں میں اس عہد کے عقاید اور خیالات پر آزادی کے ساتھ تنقیدیں کرتے تھے۔

جنگ عظیم کے بعد ترکوں نے اتحاد تورانی کی وسعت کو جو توران کی ''فضائے روحانی'' میں پھیلی ہوئی تھی بہت کچھ محدود کردیا اور وہی قومیں اس دائرہ میں داخل کی گئیں جو ترکی زبان بولتی ہیں، اب اس تحریک میں نسلی تصور کے بجائے لسانی اور قومی تصور کارفرما ہے اور یہ بھی یورپ کی موجودہ قومی تحریکوں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

---

(۱) جدید دنیائے اسلام ص ۱۲۶ (۲) کشمکش ص ۱۹۶

عثمانی ترک

(۲)

معاشرت، اخلاق و عادات

عثمانی ترکوں کی ابتدائی معاشرت نہایت سادہ تھی، آزادی، مساوات اور سادگی اس کی خاص خصوصیات تھیں جو شاہی محل سے لے کر غریبوں کے جھونپڑوں تک ہر جگہ نظر آتی تھیں، چودھویں صدی کا عرب سیاح ابن بطوطہ سلطان سے ملنے کی غرض سے بروصہ گیا تھا، سلطان کہیں باہر گیا ہوا تھا مگر سلطانہ نے اس سے ملاقات کی اور ملکی معاملات پر اس سے گفتگو کرتی رہی، ابن بطوطہ نے دیکھا کہ ترکی عورتیں آزادی کے ساتھ سڑکوں پر چلتی پھرتی اور خرید و فروخت کرتی ہیں (۱)، مگر جوں جوں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مختلف قومیں حدود سلطنت میں شامل ہوتی گئیں ترکوں کے تمدن و معاشرت میں بھی تبدیلیاں نظر آنے لگیں، مفتوحہ قوموں نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، خالدہ خانم لکھتی ہیں:

> ''استنبول کے فتح ہونے کے بعد ترکی سوسائٹی صاف طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی، سلطان اور ارکانِ سلطنت نے بازنطینی طریقے اختیار کیے مثلاً پردہ، عورتوں کے لیے علاحدہ مکان، خواجہ سرا، نہ صرف تعدد ازدواج بلکہ داشتہ رکھنے کی قبیح رسم بھی رائج ہو گئی، اب تک سلطان

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۴۳۶

غیر ملکی شہزادیوں سے شادی کیا کرتے تھے اب وہ صرف لونڈیوں سے کرنے لگے، ان کے ہاں کی عورتیں صرف ان کے عیش و آرام کے لیے تھیں، سوسائٹی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

مگر متوسط طبقے اور ادنیٰ طبقے میں بعض پرانی رسمیں اب تک باقی تھیں، ان کی عورتیں نقاب ڈال کر بے تکلف باہر آتی جاتی تھیں، البتہ انھیں بجز خاص صورتوں کے خاندان کے باہر کے لوگوں سے ملنے کی ممانعت ہوگئی، ان طبقوں کے لوگ لونڈیاں رکھتے تھے مگر داشتہ رکھنے کی یا تعدد ازدواج کی مثالیں بہت کم پائی جاتی تھیں، اگر متوسط درجہ کی کسی ترکی عورت کا شوہر دوسری شادی کرلے تو وہ اس کی زندگی دشوار کر دیتی تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ دونوں بیویاں مل کر اس کی خبر لیتی تھیں، یہ چیزیں بہت تکلیف دہ تھیں اور ان کا اثر بچوں پر بہت برا پڑتا تھا۔

البتہ ماؤں کے حقوق ان سب تغیرات کے باوجود قایم رہے، ماں کی محبت اور عزت دنیا میں عام ہے، مگر ترکوں میں یہ جذبہ بہت ہی گہرا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اکثر بہوؤں کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ بڑی بی کے انتقال سے پہلے ان کی استبدادی حکومت سے نجات پانا ناممکن تھا۔"(۱)

معاشرت کی سادگی: ارکانِ سلطنت کے علاوہ جنھوں نے بازنطینی تکلفات اختیار کر لیے تھے، عام طور پر ترکوں میں معاشرت کی سادگی کئی سو برس تک قایم رہی، شہنشاہ آسٹریا کا سفیر بسبک (Busbecq) جو سلیمان اعظم کے دربار میں ۱۵۵۴ء سے ۱۵۶۲ء تک تھا، اپنے خطوط میں ترکوں کے بعض چشم دید حالات بیان کرتا ہے، چنانچہ ان کے مکانات کی سادگی کے متعلق وہ لکھتا ہے:

---

(۱) ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۳۸-۲۳۷

''ترکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی عمارتوں میں وہ شان وشوکت سے پرہیز کرتے ہیں، باتوں پر توجہ کرنا ان کے خیال میں غرور اور خود بینی کی علامت ہے، گویا انسان دنیا میں ہمیشہ رہنے کی توقع کرتا ہے، وہ اپنے مکانوں کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ ایک مسافر سرائے کو سمجھتا ہے، اگر وہ چوروں سے محفوظ ہوں اور گرمی، سردی اور بارش سے بچے رہیں تو انھیں زیادہ تکلفات کی ضرورت نہیں، یہی وجہ ہے کہ پوری ترکی میں تم کو کوئی دولت مند آدمی بھی مشکل سے ایسا ملے گا جس کا مکان عالی شان ہو، عوام جھونپڑوں میں رہتے ہیں، امرا باغوں اور حماموں کے شائق ہیں اور ان کے مکانات وسیع ہوتے ہیں، جن میں انتظام خانہ داری کے لیے کافی گنجایش ہوتی ہے مگر ان مکانوں میں بھی خوب روشن پورٹیکو (برساتی) یا ہال قابل دید نہیں ہوتے اور نہ ان میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو عالی شان یا جاذب نظر ہو۔''(۱)

سلیمان اعظم کا عہد سلطنت عثمانیہ کے اوجِ کمال کا عہد تھا، اس زمانہ میں ترکوں کی یہ سادگی تعجب خیز ہے، مکانات کے علاوہ غذا کی سادگی کا بھی یہی حال تھا، بسبک لکھتا ہے:

''ترک کھانے پینے میں اتنے کفایت شعار ہیں اور انھیں مزیدار چیزوں کا اس قدر کم شوق ہے کہ اگر روٹی، نمک اور لہسن یا پیاز مل جائے اور ایک قسم کا ترش دودھ جسے وہ برغورت کہتے ہیں تو پھر ان کو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اس دودھ کو بہت ٹھنڈے پانی میں ملا کر روٹی کے ٹکڑے اس میں ڈال دیتے ہیں اور بہت گرمی اور پیاس کی حالت میں اسے کھاتے ہیں، ہم نے بھی اکثر شدید گرمی میں اس

---

(۱) بسبک کے ترکی خطوط مطبوعہ لندن ص ۱۱ (Busbecqs Turkish letters)

سے بہت فائدہ محسوس کیا، یہ غذا نہ صرف خوش ذائقہ اور قابل ہضم ہوتی ہے بلکہ اس میں پیاس بجھانے کی بھی ایک غیر معمولی خاصیت ہوتی ہے، تمام کارواں سراؤں میں جوترکی سرائیں ہیں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، ترش دودھ اور دوسری قسم کی مزیدار چیزیں کثرت سے فروخت ہوتی ہیں، کیونکہ ترک سفر کی حالت میں گرم کھانے اور گوشت کی ضرورت نہیں محسوس کرتے، ان کے ذائقہ کی چیزیں ترش دودھ، خشک آلو بخارا، شفتالو، سفرجل، انجیر، منقی اور شاہ دانہ ہوتی ہیں، یہ سب چیزیں صاف پانی میں ابال کر مٹی کی بڑی بڑی کشتیوں میں رکھ دی جاتی ہیں، ہر شخص اپنی پسند کی چیز خریدتا ہے اور اس پھل کو روٹی کے ساتھ بطور چاٹ اور چٹنی کے کھالیتا ہے اور کھانے کے بعد بچا ہوا عرق پی جاتا ہے، اس طرح ان کی غذا میں بہت کم صرف ہوتا ہے، اتنا کم کہ شاید ہمارے ملک میں ایک آدمی اپنے کھانے پر جتنا ایک روز میں خرچ کرے گا اس سے کم میں ایک ترک بارہ روز تک کھالے گا، ان کی پر تکلف دعوتوں میں بھی عموماً صرف کیک، میٹھا کلچا اور دوسری قسم کی مٹھائیاں ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ مختلف قسم کے چاول اور بھیڑ، بکری اور چوزے کا گوشت ہوتا ہے۔"(۱)

ایک انگریز خاتون لوسی گارنٹ (Lucy m.j. Garnett) نے ترکوں کی شہری اور دیہاتی زندگی پر ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے، وہ سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے عہد میں ترکی گئی تھی، اس نے ترکوں کی معاشرت کے جو حالات لکھے ہیں وہ ایک طویل قیام کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، ترکی مکانوں کے متعلق اس کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) بسبک کے ترکی خطوط مطبوعہ لندن ص ۵۲-۵۳ (Busbecqs Turkish letters)

عثمانیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکانوں کے لیے فطرۃً خوبصورت مقامات پسند کرتے ہیں جہاں درختوں کا سایہ ہو، ٹھنڈے چشمے ہوں اور وسیع میدان ہوں، اس حسن ذوق کی بنا پر انھوں نے اپنے مکانات ایسی جگہوں پر بنوائے ہیں جو عظمت، شان اور خوبصورتی کے لحاظ سے بے مثل ہیں، ان سات پہاڑیوں کے علاوہ جن پر استنبول مثل رومہ کے آباد ہے، ترکوں نے باسفورس اور بحیرا تجین کے بہت سے دلکش ساحلی مقامات پر مکان بنوالیے ہیں، سمرنا میں ان کی آبادی کوہ پیگس (Pagus) کے دامن میں واقع ہے اور بروصہ میں کوہ بتھینین المپس (Bithynioun Olympus) کے ڈھلوان بازوؤں پر، یہی وجہ ہے کہ ترکی آبادی کی سڑکیں اکثر ڈھلوان ہوتی ہیں اور حد درجہ ناہموار بھی، عموماً ان پر پتھر نہیں ہوتے، خشک موسم میں ٹخنوں تک گرد جمی رہتی ہے اور بارش کے زمانہ میں پانی تیزی کے ساتھ بہتا رہتا ہے، لیکن وہ عیسائی اور یہودی حصۂ آبادی سے زیادہ صاف ستھری ہوتی ہیں، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ صحنوں اور باغیچوں میں کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے زیادہ جگہ ہوتی ہے، کیوں کہ صوبہ کے شہروں کے ہر مکان میں خواہ وہ غریب سے غریب آدمی کا ہو، اگر باغیچہ نہیں تو ایک صحن ضرور ہوتا ہے اور اس میں شہتوت اور چنار وغیرہ کے درخت لگے ہوتے ہیں، ہر مکان دوسرے مکان سے بالکل الگ ہوتا ہے، چنانچہ زمین کا ایک بڑا رقبہ چھدری آبادی سے بھر جاتا ہے، ترک کاریگروں اور مزدور پیشہ جماعت کے مکانوں اور اسی پیشہ کے دوسری قوم والوں کے مکانوں میں عموماً یہ فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر کے مکانات میں سڑک کی طرف کی کھڑکیوں میں جھلملیاں لگی ہوتی ہیں، متوسط طبقہ کے مکانات زیادہ وسیع ہوتے ہیں، ان کے تین طرف صحن اور چمن ہوتا ہے اور سڑک کی طرف دو منزلہ حصہ دو فٹ آگے نکلا رہتا ہے، دیواریں عموماً گہرے سرخ رنگ کی ہوتی ہیں، چمن میں اونچے اونچے سرو اور شہتوت کے درخت ہوتے ہیں اور چمن میں مختلف قسم کے پھل کے درختوں کے علاوہ طرح طرح کے پھول اور ترکاریاں ہوتی ہیں، متوسط طبقہ کے مکانوں میں نیچے کے دو کمرے جو سلاملق یا

مردانہ حصہ سے تعلق رکھتے ہیں، صاحب خانہ کے لیے ہوتے ہیں، جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے، مردانہ کے باقی حصہ میں دفتر اور باورچی خانہ وغیرہ ہوتا ہے، اوپر کا حصہ مستورات کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور اس میں کوئی مرد نہیں جا سکتا، متمول آدمیوں کے مکانات جو قوتق کہے جاتے ہیں، شہر اور دیہات دونوں جگہ عموماً جداگانہ قطعات پر مشتمل ہوتے ہیں، مردانہ حصہ کو سلاملق اور زنانہ کو حرملق یا حرم کہتے ہیں، دونوں کے درمیان ایک غلام گردش ہوتی ہے جسے مابین کہتے ہیں، باسفورس کے ساحل پر بعض قدیم قونق بالکل لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔(۱)

ترکوں کی معاشرت اور مکانات کی وضع اور ترتیب کی نسبت مولانا شبلی مرحوم اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

> ”ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے، امرا اور معزز عہدے دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں، میں نے دس ہزار کے تنخواہ سے لے کر بیس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں، اگرچہ دونوں حالتوں میں نہایت تفاوت تھا اور ہونا چاہیے تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب وصفائی میں برابر تھے۔
>
> ڈرائنگ روم کا قدیم طریقہ یہ تھا اور متوسط حیثیت والوں میں اب بھی جاری ہے کہ دیوار سے متصل قریباً دو ہاتھ چوڑے اور دیوار کے طول کے برابر لمبے چبوترے بنے ہوتے ہیں اور ان پر گدا بچھا ہوتا ہے، اب اگرچہ میز وکرسی کا زیادہ رواج ہے، تاہم چونکہ معزز

---

(۱) ”شہر اور دیہات کی زندگی“ از لوسی گارنٹ مطبوعہ لندن ۱۶-۱۷ (Turkish life in town and countary by Lucy Garnett)

ترکوں کے ہاں علما اور درویشوں کی اکثر آمد و رفت رہتی ہے، ایک آدھ
کمرہ اس طریقہ پر بھی ضرور مرتب رہتا ہے، میں نے عثمان پاشا اور
درویش پاشا کے عالیشان مکانوں میں بھی اس وضع کے متعدد کمرے
دیکھے، زمانۂ حال میں یوروپین طریقہ زیادہ مروج ہے، ترکوں نے اس
میں اپنی طرف سے کچھ اصلاحیں کر لی ہیں اور وہ درحقیقت قابل تعریف
اصلاحیں ہیں، ڈرائنگ روم میں جو اکثر عمدہ ٹرکش قالین سے آراستہ
ہوتا ہے، اس سرے سے اس سرے تک سڑک کے طور پر کارپٹ وغیرہ
کی ہاتھ ہاتھ بھر چوڑی پٹیاں بچھی ہوتی ہیں، کمرے میں جو لوگ آتے
جاتے ہیں اسی پر سے گذرتے ہیں، ادھر ادھر پاؤں نہیں رکھ سکتے،
ترکوں کا بوٹ اگرچہ خاک آلودہ نہیں ہوتا لیکن اس طریقہ سے فرش اور
بھی صاف و پاک رہتا ہے۔"

فتح قسطنطنیہ کے بعد اگرچہ ترکوں کی معاشرت میں بہت سے تکلفات داخل
ہو گئے تھے، تاہم ان کی فطری سادگی ہر زمانہ میں نمایاں رہی، مولانا فرماتے ہیں:

"ترکوں کی معاشرت میں مجھ کو جو چیز سب سے زیادہ پسند
ہے وہ یہ ہے کہ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے فضول شان و
شوکت کا نام نہیں، بڑے بڑے وزرا و امرا بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی
حیثیت سے نکلتے ہیں، میں نے بارہا وزیراعظم کی سواری دیکھی ہے،
صرف دو تین سوار ساتھ ہوتے ہیں، سپہ سالار کل علی رضا پاشا کے ساتھ
پانچ سوار سے زیادہ نہیں ہوتے، مکانات اور تمام معاشرت کی چیزوں
میں بھی سادگی پائی جاتی ہے، عثمان پاشا، درویش پاشا، زکی پاشا جس
حیثیت اور رتبہ کے لوگ ہیں اس لحاظ سے ان کے مکانات کو کم از کم
حیدرآباد کا فلک نما اور بشیر باغ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ ہمارے مولوی

مہدی علی صاحب کی کوٹھی کے برابر بھی نہیں، نوکر چاکر بھی کثرت سے
نہیں ہوتے، جیسا ہمارے ہاں کے نواب اور فرضی شاہزادوں کے ہاں
دستور ہے، حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فخر کریں بجا ہے کہ
انھوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایہ میں پل کر سپاہیانہ پن
نہیں چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اموی (اندلس والے) تیموری تو سو ہی
دو سو برس میں اچھے خاصے رنگیلے بن گئے تھے۔"(۱)

حمام: ہر مکان کے ساتھ جو تھوڑی بہت حیثیت بھی رکھتا ہے، حمام کا ہونا ضروری ہے، عام حمام جن میں ہر طبقہ کے لوگ جاتے ہیں تمام بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً قسطنطنیہ میں بہت کثرت سے بنے ہوئے ہیں، ان کی فیس نہایت معتدل ہوتی ہے، غریبوں کے لیے مسجدوں اور دوسری رفاہی عمارتوں میں حمام بنے ہوئے ہیں، جہاں وہ مفت غسل کر سکتے ہیں جمہوریہ سے پہلے شہروں میں حمام لوگوں کے ملاقات کرنے کی خاص جگہ ہوتے تھے، عورتیں بھی زنانہ حماموں میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں، مردوں کے حمام دن کے علاوہ شام کو بھی کھلے رہتے تھے، حمام کے ذکر میں لوسی گارنٹ لکھتی ہے:

"مسلمانوں کے نزدیک جسم کی صفائی کا درجہ یقیناً خدا پرستی
کے بعد ہی ہے، کیونکہ اس کی تاکید شرع شریف میں آئی ہے، جن امراض
میں ان کے عیسائی اور یہودی ہمسایے مبتلا رہتے ہیں، ان میں سے
اکثر سے ان کے نسبتاً محفوظ رہنے کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ باقاعدہ
پابندی سے غسل کرتے ہیں اور شراب سے عادۃً پرہیز کرتے ہیں۔"(۲)

ترکوں کی پرہیزگاری اور طہارتِ جسمانی کے متعلق سر ایڈوین پیرس (Sir Edwin Pears) جو اخبار ڈیلی نیوز کے نامہ نگار کی حیثیت سے مدتوں ترکی میں رہ چکا ہے اپنی کتاب "ترکی اور اس کے باشندے" میں لکھتا ہے:

(۱) سفرنامۂ روم و مصر و شام (۲) لوسی گارنٹ ص ۳۹

اس کا دعویٰ بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اناطولیہ کے ترکوں کو ایک پرہیزگار قوم بنا دیا ہے، میں اس کا ذکر شروع ہی میں اس کی اہمیت کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کرتا ہوں کہ ان کا شراب سے پرہیز کرنا منجملہ ان خصوصیات کے ہے جو فوراً یوروپین سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں، ترکی میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت ہر قسم کی شراب سے کامل اجتناب کرتی ہے، اسلام نے انھیں جسمانی حیثیت سے بھی ایک صاف ستھری قوم بنا دیا ہے، ان کو دن میں کم سے کم پانچ مرتبہ نماز پڑھنی پڑتی ہے، اور ہر نماز سے پہلے دونوں ہاتھ، چہرہ، کہنیوں تک باہیں اور پیر دھونا ضروری ہے، اس قاعدہ کی پابندی اتنی سختی سے کی جاتی ہے کہ اگر پانی میسر نہ آئے جیسے ریگستان میں تو اس وقت بجائے وضو کے تیمّم کرنا پڑتا ہے، نماز کی جگہ کا خواہ گھر میں ہو یا مسجد میں پاک اور طاہر ہونا ضروری ہے، بعض حالتوں میں نجاست سے پاک کرنے کے لیے پورے جسم کو دھونے کی تعلیم، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، ہمیشہ اپنے گھروں اور جسموں کو صاف ستھرا رکھنا، ان چیزوں نے ان میں صفائی کی عادت پیدا کر دی ہے، اندرون ملک میں سفر کرتے ہوئے ؟ اتنے یوروپین اثرات مشکل سے داخل ہوئے ہیں، غریب سے غریب ترکی گھر کی غیر معمولی صفائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کی مثال کا کچھ اثر ان کے عیسائی ہمسایوں پر بھی ہوا ہے، اگرچہ سیاح اکثر و بیشتر یہ دیکھتا ہے کہ عیسائی اپنے مکانوں کے قریب غلاظت اور گندگی ڈال دیتے ہیں جسے کوئی ترک اپنے مکان کے قریب گوارا نہ کرے گا، جسمانی صفائی کے معاملہ میں بھی دونوں میں یہی فرق، ایک دیہاتی قہوہ خانہ میں جب ایک عیسائی کسان سے

یہ پوچھا گیا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کیا وہ پسند نہیں کرتا کہ ہاتھ منھ دھوڈالے تو اس نے جواب دیا کہ ''میں کوئی ترک ہوں کہ ہمیشہ اپنے کو دھوتا رہوں؟''۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ممتاز رکن نے دعوے کے ساتھ یہ کہا کہ میرے مذہب کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ لازمی طور پر مفید صحت ہے، اس کا دعویٰ مضبوط بنیاد پر قایم ہے، معمولی ترک کسان کی صحت بہتر ہوتی ہے، کیونکہ وہ صاف ستھرا رہتا ہے، شراب سے پرہیز کرتا ہے، کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا ہے اور زیادہ تر کھلی ہوا میں رہتا ہے۔''(۱)

قہوہ خانے: حمام کے علاوہ قہوہ خانے بھی ترکی معاشرت کی ایک خاص چیز ہیں، کوئی شہر یا گاؤں ان سے خالی نہیں، شہروں میں ان کی وہی کثرت ہے جو ہمارے ملک میں پان کی دوکانوں کی، مگر پان کی دوکانیں لوگوں کے ملنے جلنے کی جگہیں نہیں ہوتیں، برخلاف اس کے قہوہ خانوں میں ترک ملاقات کی غرض سے بھی جاتے ہیں، وہاں خانگی معاملات سے لے کر ملکی اور غیر ملکی سیاست تک ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں، عوام کو تبادلۂ خیالات کا موقع قہوہ خانوں سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔

جس طرح ہمارے یہاں خاطر تواضع کے لیے پان ایک ضروری چیز ہے، اسی طرح ترکوں کے یہاں قہوہ اور سگریٹ کا پیش کرنا آدابِ معاشرت کے لوازم میں داخل ہے، لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ اگر آپ کسی دوکان پر کچھ خریدنے جائیں تو وہاں بھی دوکاندار نہایت اخلاق کے ساتھ آپ کے سامنے قہوہ کی پیالی ضرور پیش کرے گا، سوشل اور آفیشل ملاقاتوں کے علاوہ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے بھی جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو قہوہ اور سگریٹ کا پیش کیا جانا یقینی ہوتا ہے۔(۲)

---

(۱)'ترکی اور اس کے باشندے' از سرایڈوین پیرس مطبوعہ لندن ۱۹۱۲ء ص ۳۲-۳۳ (Turkish and its people by Sir Edwin peris)

(۲) لوسی گارنٹ ص ۳۹

شہری زندگی کی ایک خصوصیت: ترکوں کی معاشرت کے متعلق لوسی گارنٹ کا مندرجہ ذیل بیان دلچسپی سے خالی نہیں:

''ترکی شہری زندگی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت اس کی انتہائی سنجیدگی اور شائستگی ہے، مختلف قوموں کی آمیزش اور پولیس کے سپاہیوں کی کمی کے باوجود سڑکوں پر جھگڑے فساد یا ہنگامے شاذ و نادر ہوتے ہیں جو ہوتے بھی ہیں ان کے ذمہ دار عموماً یونانی، یہودی یا غیر ملکی ملاح ہیں، پیدل چلنے والے تنگ سڑکوں میں ایک دوسرے کے لیے نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ راستہ خالی کر دیتے ہیں اور آپس میں سلام کرتے جاتے ہیں، حمال اپنی پیٹھ پر بھاری بوجھ لادے ہوئے یا گاڑی ہانکنے والا برابر وار دا (ہٹو بچو) کی صدا لگاتا رہتا ہے اور یہاں وہ اجڈ پن اور وحشیانہ پن بہت کم ملتا ہے جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے، البتہ امن عامہ کے حالات میں مختلف جگہوں کے لحاظ سے بہت کچھ اختلاف ہے، مثلاً سمرنا میں جو ایشیا میں واقع ہے اور کسی حد تک قسطنطنیہ میں بھی غیر ملکی خواتین کامل حفاظت کے ساتھ سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف جا سکتی ہیں یا باسفورس کے اسٹیمروں پر سفر کر سکتی ہیں، لیکن سالونیکا میں جو یورپ میں واقع ہے، معمولی حالات میں بھی کوئی خاتون بغیر کسی شریف آدمی یا ملازم کو ساتھ لیے ہوئے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتی، علاوہ فرینک محلّہ کی ایک یا دو سڑکوں کے، وجہ یہ ہے کہ ایک طرف البانیوں اور مقدونیا کے دوسرے بے لگام باشندوں کا خطرہ رہتا ہے اور دوسری طرف بڑی بڑی سینگوں والے بھینسوں اور بار برداری کے دوسرے جانوروں کی قطاروں کا جن کو یہودی ہانکتے ہیں اور جن پر بھاری اور بے ڈول بوجھ

لدے ہوتے ہیں، رات کے وقت امن عامہ کا تحفظ بیگچی کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو ہمارے قدیم چوکیدار کا جواب ہے، وہ لالٹین ہاتھ میں لیے ہوئے آفتاب کے بعد سے صبح تک گشت کرتا رہتا ہے اور بدکاروں کو متنبہ کرنے کی غرض سے اپنے لوہے کی شام لگے ہوئے ڈنڈے سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سڑک کی پٹری کو کھٹکھٹاتا جاتا ہے، نقب زنی کا جرم ترکی میں تقریباً نا معلوم ہے، کیوں کہ اس ملک میں اپنے طویل زمانۂ قیام کے دوران میں اس قسم کے جرم کی ایک مثال بھی مجھے یاد نہیں آتی، بہر حال غروب آفتاب کے بعد جو شخص بھی باہر نکلے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک جلتی ہوئی لالٹین لے کے نکلے، اگر کوئی شخص راست بازی کی اس علامت کے بغیر باہر نکلے اور اس وقت پولیس کے گشتی سپاہی کا سامنا ہو جائے یا وہ پولیس کی چوکی کی طرف سے گذرے تو دشواریوں میں گرفتار ہو جانے سے بمشکل بچ سکے گا۔"(۱)

ترکوں کی شایستگی کی شہادت مغرب کے دوسرے مستند اشخاص نے بھی دی ہے، لارپنٹ جس نے ترکی کی تاریخ انیسویں صدی کے وسط میں شایع کی ہے اور جس کی کتاب کی بنیاد سر جیمس پورٹر (Sir James Porter) سفیر برطانیہ متعینہ باب عالی (۱۷۴۷ء لغایۃ ۱۷۶۲ء) کے فراہم کردہ مواد پر ہے، لکھتا ہے:

ڈاکہ، نقب زنی، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی چیزوں کی چوری بھی ان (ترکوں) کے ہاں مطلق نہیں ہے، امن اور جنگ دونوں زمانوں میں سڑکیں ویسے ہی محفوظ و مامون رہتی ہیں جیسے ان کے مکانات، تمام سلطنت میں خصوصاً شاہراہوں اور بڑی سڑکوں پر ہمیشہ پوری حفاظت اور سلامتی کے ساتھ سفر کیا جا سکتا ہے اور مسافروں

---

(۱) لوسی گارنٹ ص ۴۹

کی کثرت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ حادثات اتنے کم کیسے ہوتے ہیں، شاید کئی سال میں بھی ایک حادثہ کی نوبت نہیں آتی۔"

"ترک خواہ چوری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسے ایک ایسا ذلیل فعل سمجھتے ہیں جو فطرت انسانی کے سزاوار نہیں، خواہ وہ حقیقتاً قانون سے ڈرتے ہیں جو بہت سخت نہیں ہے، ان سے نقب زنی یا چوری کی واردات قسطنطنیہ میں شاید ہی کبھی ہوتی ہو اس شہر میں لوگ سب سے زیادہ یلغاریوں سے ڈرتے ہیں، عموماً چور وہی ہوتے ہیں، تاہم آپ وہاں حفاظت کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور آپ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔"(۱)

پروفیسر میکس ملر قسطنطنیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"شہر کی سڑکیں بہت خراب ہیں، کیا گاڑی، کیا ٹرام اور کیا حمال، کسی میں بآسانی سہولت اور روانی نہیں، سڑکوں پر بہت شور ہوتا ہے، لوگ عموماً زور سے باتیں کرتے ہیں مگر اس سب کے ساتھ سڑکوں پر جھگڑا فساد شاذ و نادر ہوتا ہے، مگر جو چیز سیاح کے دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتی، وہ سڑکوں پر بدمست عورتوں اور بدمست مردوں کا نہ ہونا ہے اور اگر کہیں کوئی مخمور دیکھا بھی جائے گا تو وہ یقینی ترک نہ ہوگا، اس صفت کی قدر اس وقت بڑھ جاتی ہے جس وقت ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے شہروں میں ہر ایک جھگڑا فساد اور نیز ہر ایک ارتکابِ جرم کا سبب اگر غور سے دریافت کیا جائے تو یہی شراب خواری ہوگی۔"(۲)

یہاں عام سڑکوں پر ایک اور حیرت انگیز چیز جس سے ایک

---

(۱) لارپنٹ جلد اول ص ۳۱۵-۳۱۶ (۲) سیاحت قسطنطنیہ مولفہ مسز جیار جینا میکس ملر مترجمہ سید رشید الدین، مطبوعہ مفید عام آگرہ ص ۲۳

یوروپین سیاح کو استعجاب ہوتا ہے، وہ علانیہ بداخلاقیوں کا نہ پایا جانا ہے، بالخصوص ترکی عورت اس صفت سے زیادہ متصف ہیں۔"(۱)

حرم کی زندگی: ترکی حرم اور اس کی زندگی کے متعلق موجودہ صدی کے آغاز تک عجیب وغریب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں، اہل یورپ کے نزدیک حرم وہ حصۂ مکان تھا جس میں بے شمار عورتیں رہتی تھیں اور وہ سب مالک مکان کی بیویاں، داشتائیں یا لونڈیاں تھیں، ان کا کام صرف کھانا پینا اور اپنے آقا کو خوش رکھنا تھا، چہار دیواری سے باہر نکلنے کی انھیں اجازت نہ تھی، اور نہ وہ کسی سے ملاقات کرسکتی تھیں، ان کی حالت قیدیوں سے بہتر نہ تھی۔

لیکن جب ۱۹۰۳ء میں خالد خلیل نے ترکی معاشرت پر اپنی کتاب "ایک ترک کی ڈائری" (The Diary of a Turk) شائع کی تو یہ غلط فہمیاں بہت کچھ دور ہوگئیں، اس کے بعد لوسی گارنٹ کی کتاب شائع ہوئی، یہ چونکہ ایک انگریز خاتون کی لکھی ہوئی تھی جو مدتوں ترکی میں رہ چکی تھی اور حرم کی زندگی سے ذاتی واقفیت رکھتی تھی، اس لیے اس کی روشنی میں اہل مغرب کو اصلی حالات زیادہ وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئے، اس میں شبہ نہیں کہ ترکی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر لوسی گارنٹ نے خالد خلیل سے زیادہ روشنی ڈالی ہے، خالد خلیل کی کتاب کا ترجمہ محمد حسین خاں صاحب نے اسی زمانہ میں "ترکوں کی معاشرت" کے عنوان سے کردیا تھا، جو ۱۹۰۵ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا، حرم اور اس کی زندگی کے متعلق ہم اس کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:

> "ترکی میں وہ حصۂ مکان جہاں مستورات رہتی ہیں حرم کہلاتا ہے اور مردوں کے حصہ مکان کو سلاملق کہتے ہیں، جو کہ عام ملاقات کے لیے مخصوص ہوتا ہے، گو مکان کی تمام مستورات کو مجموعی طور پر حرم ہی کہتے ہیں، تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سب صاحب خانہ کی بیبیاں ہیں، ہر شخص کی زوجہ، والدہ، ہمشیرہ، دختر اور نیز وہ عورتیں

(۱) 'سیاحت قسطنطنیہ' مولفہ مسز جیارجینا میکس طر مترجمہ سید رشید الدین، مطبوعہ مفید عام آگرہ ص ۲۶

جو شرعاً بلا نقاب اس کے سامنے ہو سکتی ہوں اس کے حرم میں داخل ہیں، ہر خاندان میں مفصلۂ ذیل اشخاص کو حرم سرا میں داخل ہونے کی اجازت ہے، صاحب خانہ، اس کے بیٹے، والد، خسر اور نسبتی بھائی بڑے بڑے شہروں مثل قسطنطنیہ، سمرنا اور ایڈریانوپل میں روشن دماغ طبقہ کے لوگ اپنے دور کے رشتہ داروں کو بھی اندر جانے کی اجازت دے سکتے ہیں اور جو کہ یوروپین رسم و رواج اختیار کرتے ہیں اپنے گہرے دوستوں کو بھی داخل کر سکتے ہیں، لیکن پرانی وضع کے خاندانوں میں جو کہ آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں، صاحب خانہ کا کوئی مرد رشتہ دار تیرہ یا چودہ برس کی عمر کے بعد حرم سرا میں نہیں جانے پاتا، اگر اس سے اور دختر صاحب خانہ یا دوسری قابل نکاح لڑکیوں سے شادی ہونا ممکن ہو، یہ پابندیاں متمول اشخاص میں زیادہ تر ہیں، ایسے خاندانوں میں حرم سرا اور مردانہ خانہ میں ایک گھومنے والی الماری کے ذریعہ سے کاروبار عمل میں آتا ہے اور پارسل اور کھانے کے برتن منگائے یا بھیجے جاتے ہیں، یہ الماری اس دیوار میں سوراخ کر کے لگائی جاتی ہے، جو کہ مردانخانہ کو حرام سرا سے جدا کرتی ہے، عورتوں کو مردوں کی نظر سے بچانے کے لیے ایک اور ترکیب یہ کی جاتی ہے کہ حرم سرا کی کھڑکیوں میں جالی لگاتے ہیں، جس کا یہ منشا ہوتا ہے کہ عورتیں تو باہر کی ہر شے اس جالی کے پیچھے سے دیکھ سکتی ہیں لیکن کوئی مرد قریب کی سڑکوں، باغوں اور مکانوں سے انھیں نہیں دیکھ سکتا، جس طرح کہ لڑکوں کو تیرہ چودہ برس کی عمر کے بعد سوائے اپنے ان نہایت ہی قریبہ رشتہ داروں کے جن کی میں نے تصریح کی ہے دوسری مستورات کو دیکھنے کی اجازت نہیں، اسی طرح اتنی ہی عمر سے متجاوز ہونے پر لڑکیاں بھی سوائے اپنے

نہایت ہی قریب عزیزوں کے مردوں کے سامنے بلا نقاب کے ہرگز نہیں آسکتیں اور اگر وہ ایسے مدرسوں میں تعلیم پاتی رہی ہیں جہاں کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں شریک ہوں تو وہاں سے علاحدہ کرلی جائیں گی اور اگر زنانہ مدرسوں میں جاتی ہوں تو وہاں جس طرح کہ اور کہیں بھی احتیاط سے منھ چھپا کر جانا لازم ہے، یہ ہرگز نہیں خیال کرنا چاہیے کہ انگلستان کی لیڈیوں کی طرح چہروں پر ہلکی نقابیں ڈال کر جاتی ہیں بلکہ عورت کو اس طرح جانا لازم ہے کہ از سر تا پا ایک لانبی فرغل میں جو کہ کسی قدر چادر سے مشابہ ہے، لپٹی ہو۔"

حرم کی زندگی کے متعلق خلیل خالد لکھتے ہیں:

"بہت سے ترکی حرم سراؤں میں زندگی نہایت سادگی سے بسر کی جاتی ہے اور اگر ان خاندانوں کو خارج کردیں جن میں اب تک ایک سے زائد بیبیاں ہیں تو نہایت آرام اور خوشی کے ساتھ شوہر کو جو کامل اختیار و حکومت حاصل ہے وہ زوجہ کے مسلمہ حقوق میں کسی طرح ہارج نہیں ہوتی، دوسری جانب زوجہ کی اطاعت شعاری جسے مغربی یورپ کی ترقی یافتہ مستورات اس قدر حقارت سے دیکھتی ہیں، اکثر شوہر کے دل میں اس کے لیے محبت اور عزت زیادہ تر مستحکم کر دیتی ہیں جیسا کہ انگستان میں بعض لوگوں کا خیال ہے، بیبیاں شوہروں کی باندیاں نہیں ہوتیں، حرم سرا کی رہنے والیاں زیادہ تر مکانوں ہی میں رہتی ہیں لیکن کلیۃً مقید نہیں ہوتیں، دو دو تین تین یا زیادہ کی جماعت دوسرے حرم سراؤں میں ملاقات کے لیے جاتی ہیں اور اسی طرح احباب واعزہ کے حرم سراؤں میں عورتیں ملنے کے لیے آتی جاتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے مجمعوں میں عورتیں ہی عورتیں ہوتی ہیں،

مرد شریک نہیں ہوتے لیکن دوسرے ملکوں کی مستورات کی طرح ان میں سے بعض گاتی بجاتی اور ساتھیوں کو محظوظ کرتی ہیں، ناچنا بھی حال میں شروع کیا گیا ہے لیکن ابھی تک نہایت اعلیٰ موجودہ تہذیب یافتہ خاندانوں تک محدود ہے، پرانی وضع کے لوگوں میں نوجوان مستورات کا دوسروں کے سامنے ناچنا نہایت کریہہ و معیوب سمجھا جاتا ہے، شادیوں اور اسی قسم کے دوسرے خوشی کے موقعوں پر صرف ایسی عورتیں ناچ کر مہمانوں کو خوش کرتی ہیں جن کا پیشہ ہی ناچنا گانا ہوتا ہے اور وہ شریف اور ذی عزت نہیں شمار کی جاتی ہیں، میرے ابتدائی زمانہ میں بلند آواز سے پڑھنا حرم سراؤں میں دل بہلانے کے لیے نہایت مرغوب خاطر تھا، تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد آج کل کی بہ نسبت بہت کم تھی، اس وقت کی بہت زیادہ پڑھی لکھی مستورات متبرک روایات و داستان یا مذہبی رسالے و اشعار اپنی ساتھیوں کو پڑھ کر سناتی تھیں اور وہ گھنٹوں نہایت توجہ کے ساتھ انھیں سنتی تھیں، مجھے یقین ہے کہ صوبجات میں یہ طریقہ تفنن اب تک پسند کیا جاتا ہے۔

ترکی مستورات کو اپنے رتبہ و درجہ کے مطابق مختلف کام کرنے اور فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں، ایک اوسط درجہ کی خاتون میں جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہو، امور خانہ داری کے انصرام کی قابلیت سے بڑھ کر اور کوئی اوصاف اور خوبیاں نہیں تلاش کی جاتیں، صوبجات میں دہقانی عورتوں کو علاوہ اپنے حسب حال انتظامِ خانہ داری کے کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے، خصوصاً اس وقت جب ان کے بھائی اور شوہر سرکاری احکام کے مطابق فوجی ملازمت پر ہوتے ہیں، خوش حال اشخاص کی لڑکیاں اپنے گھروں کے کاروبار دیکھنے کے علاوہ سینے

پرونے میں ان تھک محنت کرتی ہیں اور ہمیشہ کشیدہ کاڑھنے اور سوئی کے دوسرے کاموں میں مشغول رہتی ہیں، بڑے بڑے معززین کی بیٹیوں کو علاوہ دیگر کاموں کے وہ سب چیزیں بھی سیکھنا ہوتی ہیں جن کی کہ ان کی استانی یا معلّمہ انھیں تعلیم دیں۔"(۱)

عورتوں کی بیرونی تفریحیں: موجودہ صدی کے اوائل میں جب لوسی گارنٹ نے اپنی کتاب لکھی ہے، حرم کی عورتوں کو اتنی آزادی حاصل ہوگئی تھی کہ وہ سیر وتفریح کے لیے پیدل یا سواری پر باہر جاتی تھیں، دوکانوں پر جا کر خرید وفروخت کرتی تھیں اور غسل کے لیے زنانہ حماموں میں جایا کرتی تھیں، شادی بیاہ اور خاندان کی دوسری تقریبوں کے علاوہ بھی ان کی بیرونی تفریح کے سامان تھے، خصوصاً حمام ایک نہایت دلچسپ چیز تھی، یہ گویا ترکی عورتوں کا کلب تھا، یہیں وہ اپنی دوستوں سے ملتی تھیں، نئی ملاقاتیوں سے تعارف پیدا کرتی تھیں اور وقت کی تمام خبریں سنتی تھیں، یہیں وہ شادیوں کے سلسلہ کے غسل اور دوسری خاندانی تقریبات کے غسل کے لیے اپنی لڑکیوں، چھوٹے بچوں اور کنیزوں کو لے کر آتی تھیں، ان کے ساتھ ہر قسم کے پھل اور ناشتہ کی چیزیں ہوتیں اور دن کا بڑا حصہ کھانے پینے اور ہنسی مذاق کی باتوں میں گذار دیتیں، عثمانی عورتیں کھلی ہوا کی بے حد شایق ہیں، قسطنطنیہ کے قریب متعدد دلکش تفریح گاہیں ہیں جہاں عورتوں کو اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے ہر قسم کی سہولت حاصل تھی، اسی طرح صوبوں کے ہر شہر اور قصبہ کے نواح میں بھی ایسے مقامات موجود ہیں جن کے مناظر نہایت خوبصورت ہیں، لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ ناممکن ہے کہ ان مقامات پر جایئے اور عثمانی عورتوں کی ٹولیاں تفریح کرتی ہوئی نظر نہ آئیں، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شریف ترک کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ باہر نہیں نکلتے تھے، قدیم خیال کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں کے گھروں میں حبشی خواجہ سرا بیرونی دنیا اور خواتین حرم کے درمیان متوسط کا کام

(۱) 'ترکوں کی معاشرت' ص ۴۷-۴۸

دیتے تھے اور جب کبھی یہ خواتین سیر کے لیے باہر نکلتی تھیں تو ان کے ساتھ جاتے تھے، گھر میں یہی خواجہ سرا بچوں کی دیکھ بھال اور کنیزوں کی نگرانی کرتے تھے۔(۱)

پروفیسر میکس ملر پل غلطہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''یہاں عورتیں امید سے زیادہ سڑکوں پر ملتی ہیں جو بلا خوف وخطر پل پر آدمیوں کے مجامع کثیرہ سے مل جل کر چلتی ہیں، ہم ان کے چمکدار سرخ وسفید، نیلے، سبز، قرمزی رنگ کے گوناگوں لباسوں کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں، لیکن ان کی سیاہ آنکھوں کے سوا باریک اور چھنے والی نقاب کی تہوں کے اندر سے ان کے چہروں کی کیفیت بہت کم معلوم ہوسکتی ہے، مشرقی چہروں میں سیاہ آنکھ ایک سب سے اعلیٰ ترین چیز ہے اور اگر ان کے باریک نقابوں کے اندر کوئی شخص ان کے چہروں کو اچھی طرح جانچ کرنا چاہے تو اس کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں حاصل ہوسکتا۔''(۲)

پروفیسر میکس ملر ۱۸۹۶ء میں قسطنطنیہ گئے تھے، یہ سلطان عبدالحمید خاں کا عہد تھا، جو سیاسی استبداد کے علاوہ معاشرت کی سخت پابندیوں کا بھی زمانہ تھا، اس کے باوجود عورتوں کی یہ آزادی قابل لحاظ ہے لیکن اس آزادی کے بھی معین حدود تھے جن سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا تھا مثلاً کوئی خاتون بغیر یشمک (نقاب) کے اپنے مکان کے نیچے کی سڑک پر بھی نہیں جاسکتی تھی (۳)، ہر عورت امیر ہو یا غریب اور کیسی ہی نیک چلن ہو غروب آفتاب کے ساتھ ہی اپنے مکان واپس چلی جانے پر مجبور تھی (۴)، سلطان عبدالحمید خاں عورتوں کے پردہ کے سخت موید تھے، ہر سال وہ یشمک کے زیادہ دبیز اور فریجہ (برقع) کے زیادہ ڈھیلے ہونے کی نسبت فرمان جاری کرتے تھے، کوئی ترک سڑک پر اپنی عورتوں سے بھی بات نہیں کرسکتا تھا، ایسا کرنا خلافِ قانون تھا اور پولیس فوراً

(۱) لوسی گارنٹ ص ۶۴-۶۶ (۲) سیاحت قسطنطنیہ ص ۱۹ (۳) ایضاً ص ۱۹۷ (۴) ایضاً ص ۲۰۱

مداخلت کرتی تھی۔(۱)

تعدد ازدواج: ترکوں میں تعدد ازدواج کے متعلق لوسی گارنٹ کا بیان ہے کہ مزدور پیشہ طبقہ میں صرف ایک ہی بیوی ہوتی تھی اور دولت مند طبقوں میں بھی ایک سے زیادہ کی مثال شاذ و نادر ملتی تھی، رائے عامہ کی مخالفت کے علاوہ جو ایک سے زیادہ شادی کرنے کو روا نہیں رکھتی، اخراجات کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا تھا، دوسری شادی کے معنی یہ تھے کہ نئی بیوی کے لیے ایک قطعۂ مکان بھی علاحدہ ہونا چاہیے تھا اور کنیزوں کے علاوہ پاندان کا خرچ بھی علاحدہ دینا پڑتا تھا، لونڈیوں کی کثرت کے باوجود ملک میں عورتوں کی بہت فراوانی بھی نہیں تھی اور ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کی لڑکی پہلی بیوی بنے، کیونکہ اس کا رتبہ دوسری بیویوں سے مقدم سمجھا جاتا تھا، دوسری شادی کی نوبت عموماً اسی وقت آتی تھی جب پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوتی، لیکن ایسا کرنے سے اخراجات بڑھ جاتے تھے اور گھر کی پرسکون فضا درہم برہم ہو جاتی تھی، گارنٹ لکھتی ہے کہ

> ''آج کل زیادہ سے زیادہ دو بیویاں ہوتی ہیں اور اپنے
> طویل زمانۂ قیام میں جو میں نے ملک کے مختلف حصوں میں بسر کیا،
> صرف ایک بار مجھے ایسے حرم میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں ایک سے
> زیادہ بیویاں تھیں۔''(۲)

غلام اور کنیزیں: جب سے سلطنت عثمانیہ میں زوال شروع ہوا اور اسے یوروپین طاقتوں کے مقابلہ میں شکستیں ہونے لگیں، ان غلاموں اور کنیزوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی گئی، جو میدان جنگ سے لائی جاتی تھی، یہ کمی بردہ فروشی کے بازار سے پوری کی جانے لگی مگر انیسویں صدی میں باب عالی نے بردہ فروشی کو باضابطہ ممنوع قرار دے دیا، جہاں تک غلاموں کا تعلق ہے ان کی خرید و فروخت تو بہت کم ہوگئی اور ان کی جگہ تنخواہ دار ملازم کام کرنے لگے، لیکن کنیزوں کی خریداری موجودہ صدی کی ابتدا تک جاری تھی،

---

(۱) سیاحت قسطنطنیہ ص ۲۰۲ (۲) لوسی گارنٹ ص ۹

کیونکہ حرم کی خدمت کے لیے کنیزوں کا ہونا نہایت ضروری تھا، کوئی آزاد عورت بغیر نقاب ڈالے ہوئے غیر مردوں کے سامنے نہیں جاسکتی تھی، کنیزوں کو اس قسم کی کوئی پابندی نہ تھی، خلافِ قانون ہونے کی وجہ سے ان کی خرید وفروخت خفیہ طور پر ہوتی تھی، چھ سے دس برس تک کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ رہتی تھی، کیونکہ تعلیم وتربیت دینے کے بعد جب وہ سولہ سترہ سال کی عمر میں پھر فروخت کی جاتی تھیں تو قریباً دس گنی قیمتیں وصول ہو جاتی تھیں، کنیزوں کو ستار اور دف وغیرہ بجانے، رقص کرنے اور کشیدہ کاڑھنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور پھر رفتہ رفتہ وہ عثمانی آداب ورسوم سے آشنا کی جاتی تھیں، بڑی ہونے کے بعد گھر کے چھوٹے بڑے کام بھی ان کو سپرد کر دئے جاتے تھے، یہ لڑکیاں حرم میں بہت خوش وخرم رہتی تھیں، انھیں وہی کھانا ملتا تھا جو مالکہ خود کھاتی تھی اور خواہ وہ کوئی قصور بھی کریں انھیں گھر سے باہر نہیں نکالا جاتا تھا، مالکہ ان کی غور وپرداخت اور تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ دار ہوتی تھی، سات سال کی مدت کے بعد کنیز آزادی کی مستحق ہو جاتی تھی اور عموماً اس وقت مالکہ اسے آزاد کر کے اور کسی بھلے آدمی سے اس کی شادی کر کے رخصت کر دیتی تھی، بڑے بڑے عہدہ داروں کے ہاں کنیزوں کے لیے ماتحت عہدہ داروں میں سے کوئی بر منتخب کیا جاتا تھا اور یہ ماتحت اس نسبت کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیتا تھا، کیونکہ اس طرح آقا کے گھر کے ساتھ اس کے تعلقات اور بھی قریبی ہو جاتے تھے۔

بہت سے ترک بہ نسبت آزاد عورتوں کے ان عورتوں سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے تھے جو کنیز رہ چکی تھیں، کسی آزاد عورت سے شادی کرنا نوشہ اور اس کے والدین کے لیے بہت مہنگا پڑتا تھا کیونکہ ایسے موقعوں پر تحفہ تحائف اور دعوت مدارات میں حسب رواج بڑے پیمانہ پر خرچ کرنا پڑتا تھا، ترک بالعموم نوعمری میں شادی کرتے ہیں، اس لیے اگر کوئی باپ اپنے رتبہ کی کسی دوشیزہ کے ساتھ اپنے لڑکے کا بیاہ کرنے کی مقدرت نہیں رکھتا تھا تو وہ اس کے لیے کوئی ایسی کنیز خرید لیتا تھا جس کی پرورش اور تربیت کسی بڑی خاتون کی حرم سرا میں ہوئی ہو اور اس صورت میں اس کو زرِ ثمن کے علاوہ اور کچھ دینا

نہیں پڑتا تھا، چونکہ کنیز کی خود کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہوتی تھی، اس لیے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے آقا اور اس کے والدین کی مطیع رہے گی اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرے گی، ایسی شادیوں میں دوسرا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ بیوی کے اعزہ شوہر کے مقابلہ میں اس کی طرفداری کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتے تھے، برخلاف اس کے آزاد عورت اپنے حقوق سے پوری طرح باخبر ہوتی تھی اور انھیں برتنا چاہتی تھی اگر کسی کنیز کے بطن سے آقا کی کوئی اولاد ہو جائے تو پھر وہ فروخت نہیں کی جا سکتی تھی اور اسے گھر میں رہنے اور بچہ کی پرورش کرنے کا حق ہو جاتا تھا، یہ بچہ جائز اولاد سمجھا جاتا تھا اور اگر اس کے باپ کے کوئی اور بیوی بھی ہوتی تھی جو آزاد عورت ہوتی تو اس کی اولاد کے ساتھ ترکہ میں وہ برابر کا شریک ہوتا تھا، اکثر ایسی کنیز کا مالک اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیتا تھا تو پھر اسے سوسائٹی میں وہ حیثیت اور وہ تمام حقوق و مراعات جو ایک آزاد عثمانی عورت کو حاصل ہوتے مل جاتے تھے۔

لوسی گارنٹ لکھتی ہے کہ ترکی میں کنیزیں بہت سی حیثیتوں سے مغرب کی خانگی ملازماؤں سے بہتر حالت میں ہوتی تھیں، ان کے فرائض کبھی بھی سخت نہ تھے اور فرصت کے اوقات کافی ملتے تھے، خاندان کی عورتیں جب سیر و تفریح یا خرید و فروخت کے لیے باہر نکلتی تھیں یا حمام جاتی تھیں تو متعدد کنیزیں بھی ان کے ساتھ جاتیں اور تفریح میں شریک ہوتیں، ان تفریحات میں کنیزوں کو شریک کرنے ہی کی وجہ سے زیادہ تر غیر ملک کے لوگوں میں ترکوں کے تعدد ازدواج کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ ترک بالعموم کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔

غلاموں کو آزاد کر دینا ایک بہت نیک کام خیال کیا جاتا تھا اور اکثر ترک مرد اور عورتیں اپنے وصیت ناموں میں یا بستر مرگ پر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دیتی تھیں، جہاں تک ملکی حقوق کا تعلق ہے، غلام آزاد ہو کر فوراً اپنے سابق آقا کے برابر ہو جاتا تھا اور سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدہ کا امیدوار ہو سکتا تھا، اسی طرح ایک کنیز

آزاد ہو کر خواہ اس کی شادی کسی عثمانی سے ہوئی ہو یا اسی کے طبقہ کے کسی آزاد شدہ غلام سے، خانم کا لقب حاصل کر لیتی تھی اور ایک آزاد عورت کے تمام حقوق اسے مل جاتے تھے، یہ بھی عام دستور تھا کہ جن میاں بی بی کے اولاد نہیں ہوتی تھی یا جو بیوہ لاولد ہوتی وہ اپنے خریدے ہوئے غلام بچوں اور کنیزوں کو آزاد کر کے متبنیٰ کر لیتی تھی اور انھیں اپنا وارث قرار دیتی تھی۔(۱)

ترکی میں غلاموں کے ساتھ جیسی نرمی کا سلوک کیا جاتا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے لارپنٹ لکھتا ہے:

> ''اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلام آزاد ہونے سے انکار کر دیتا ہے، یہ آزادی اس کی خدمات کے صلہ میں دی جاتی ہے، پھر وہ اسی گھر میں مستقل طور پر قیام اختیار کر لیتا ہے، جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی محنت کا کام نہیں لیا جاتا، وہ خاندان کا ایک رکن سمجھا جانے لگتا ہے اور اب اس کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ بچوں کو سیر کرانے کے لیے باہر لے جایا کرے یا ان کے ساتھ کھیلا کرے، بچے اسے ''بابا'' کہتے ہیں۔''(۲)

اخلاق وعادات: ترکوں کے اخلاق وعادات کی سب نے تعریف کی ہے، مولانا شبلی فرماتے ہیں:

> ''کچھ شبہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں، غرور ونخوت، ترفع اور کم بینی، ان میں نام کو نہیں، امیر وغریب، مزدور وعہدہ دار، وضیع وشریف، جاہل وعالم، ہر درجہ کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے، غازی عثمان پاشا

(۱) لوسی گارنٹ ص ۵۳-۵۸ (۲) لارپنٹ جلد دوم ص ۹۴

جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درویش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبہ کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف، میں دونوں سے ملا ہوں اور وہ جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے۔

ایک عام بات ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گذرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آنکلا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہو لیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہنچا کر واپس آیا۔

فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے اور نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں، یہ عام طریقہ ہے کہ دو چار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانہ میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوگا ایک شخص سب کی طرف سے دے دے گا، گویا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ میزبان ہوتا ہے۔"(۱)

منرو ۱۹۰۸ء میں لکھتا ہے:

"اس کی (ترک کی) دلیری، راست بازی، فرماں برداری اور پرہیز گاری نے ترکی کے عیسائیوں سے بہت زیادہ تعریف حاصل کی ہے، مجھ سے قسطنطنیہ میں کاروباری آدمیوں نے بارہا کہا کہ جب ہم کو کوئی ایسا کام سپرد کرنا ہوتا ہے، جس میں کامل ایمانداری کی

(۱) سفرنامہ

ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ ہم بجائے کسی یونانی، آرمینی یا یہودی کے کسی ترک کو وہ کام سپرد کر دیتے ہیں۔"(۱)

ترکی عورتوں کے ذکر میں منرو بیان کرتا ہے:

"ترکی عورتیں طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں، اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کے ساتھ خواجہ سرا ہوتے ہیں، متوسط طبقہ کی عورتوں کے ساتھ غلام ہوتے ہیں اور کسان عورتیں تنہا آتی جاتی ہیں، کوئی انھیں چھیڑتا نہیں کیونکہ ترک، عورتوں سے سڑک پر کبھی بات نہیں کرتے یہاں تک کہ خود اپنی بیویوں سے بھی نہیں اور کوئی شخص کسی عورت کو گھورتا نہیں، یہ رواج یورپ کے عیسائی ملکوں تک محدود ہے، عورتیں ایک باریک کپڑے کی نقاب چہرے پر ڈالے رہتی ہیں اور سڑک پر ایک ہلکی سی چھتری لے کر چلتی ہیں تاکہ بدتمیز گھورنے والے فرانسیسی اور دوسرے عیسائیوں کی نظر سے محفوظ رہیں۔"(۲)

مشہور فرانسیسی مصنف الیسیے ریکلوس (Elisee Reclus) لکھتا ہے:

"ترک جسے اقتدار نے خراب اور جور و ظلم نے ذلیل نہیں کیا ہے یقیناً ان لوگوں میں ہے جو اپنے اوصاف حمیدہ کے مناسب امتزاج سے نہایت محظوظ کرتے ہیں، وہ تمہیں کبھی دھوکا نہیں دیتا، متدین اور ایماندار اور اپنے لوگوں کے ساتھ فولاد کی طرح سچا اور کھرا، نہایت مہمان نواز، باادب لیکن خوشامدی ہرگز نہیں محتاط، رواداری، کریم النفس اور جانوروں پر بہت مہربان۔"

ریکلوس کی مندرجہ بالا رائے نقل کرنے کے بعد منرو کہتا ہے کہ "اس فرانسیسی

---

(۱) 'ترکی اور ترک' از منرو مطبوعہ لندن ۱۹۰۸ء ص ۶۲ (Turky and the Turks by w.s. manroe)

(۲) ایضاً ص ۶۵

جغرافیہ داں کی رائے کی تصدیق مجھ سے بارہا ان امریکنوں اور انگریزوں نے کی جو قسطنطنیہ میں سالہا سال رہ چکے تھے، لیکن مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ اگر میں ترک کی بہترین خوبیاں معلوم کرنا چاہتا ہوں تو ضروری ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں نہیں بلکہ صوبہ جات میں بھی جا کر اسے دیکھوں۔''(۱)

ترکوں کے اخلاق وعادات کے ذیل میں لارپنٹ بیان کرتا ہے:

''اگر کوئی شخص سڑک پر کسی عورت سے ملتا ہے تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس کی طرف دیکھنا ممنوع ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے شرم عورتوں سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور ان سے بچتے ہیں، اس لیے اگر عیسائیوں میں سے کسی سے ترکوں سے جھگڑا ہو جاتا ہے اور اس عیسائی کی بیوی لڑاکا ہوتی ہے تو وہ اسے ترکوں سے جھگڑنے اور بدزبانی کرنے کے لیے کھڑا کر دیتا ہے اور اس طرح اکثر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

کسی ترک کے لیے سب سے بڑی ذلت اور شرم کی بات یہ ہے کہ وہ عورت پر ہاتھ اٹھائے، زیادہ سے زیادہ جرأت جو وہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ اس کے لیے سخت اور اہانت آمیز الفاظ استعمال کرے یا پھر وہاں سے چلا جائے۔''

''جوے کے کھیل سے وہ بے حد نفرت کرتے ہیں اور قمار باز کو جو روپیہ کے لیے کھیلتا ہے چور سے بھی برا سمجھتے ہیں، کوئی شخص ان کے نزدیک اس سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ کبھی شطرنج یا ڈرافٹ کی بساط کے قریب بھی نہیں جاتے مگر یہ کہ صرف تفریح کے لیے۔''

---

(۱) ترکی اور ترک ص ۴۷

> اونچے بلکہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی رقص کو جہاں تک ان کا تعلق ہے، انسانی وقار کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس فن کو نوع انسانی کے نہایت ادنی افراد کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں، ان کا قول ہے کہ کوئی بھی نہیں ناچتا جب تک وہ بدمست یا مجنون نہ ہو۔"

> عام طور پر ترک شراب خواری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افیون کھانے کی عادت کو بہت ہی ذلیل سمجھتے ہیں، جب وہ کسی بڑے آدمی کی سیرت کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ افیون کھاتا ہے تو اسے "تریاکی" کہتے ہیں، اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا دماغی تواز درست نہیں۔"(۱)

ترکوں پر اسلام کا اثر بیان کرتے ہوئے ایڈوین پیرس لکھتا ہے کہ اناطولیہ کے ترکوں میں مذہبی جذبہ بہت گہرا ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ سیاح اور مورخ دونوں نے کیا ہے، ترک کسان نماز کا سختی سے پابند ہوتا ہے، جس کی وجہ سے خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس اس کے دل میں پوری طرح پیدا ہو جاتا ہے، وہ اپنا دن نماز سے شروع کرتا ہے، چاہے وہ پانچوں وقتوں کی نماز پابندی سے پڑھے نہ پڑھے، لیکن نماز کے الفاظ کی تکرار اس کی سیرت پر ضرور اثر ڈالتی ہے اور یہ اثر رمضان شریف کے روزوں اور دوسرے مذہبی ارکان کی بجا آوری سے اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔(۲)
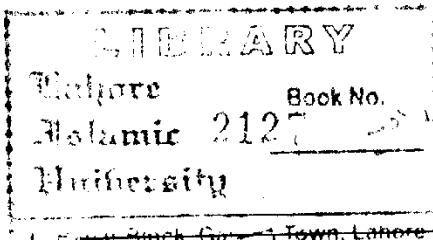
(۱) [illegible] رپنٹ جلد اول ص ۳۵-۳۱۹ (۲) ترکی اور اس کے باشندے ص ۴۹

DAULAT-E-USMANIA

VOL. II

Dr. Mohammad Uzair

Darul Musannefin Shibli Academy,
Azamgarh, U.P.

ISBN : 978-93-80104-32-4